سچی کہانیاں

October
2015

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ اپنے دیس، اپنے شہروں سے موصولہ 25 سے زائد سچی کہانیاں

☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے — جلد: 32 ـ شمارہ: 10 — اکتوبر: 2015ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے ٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

07 بدنصیب کون؟
منزہ سہام

08 احوال
کاشی چوہان
قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دل چسپ سلسلہ

34 لائف بوائے
اسماء اعوان
حقیقت سے قریب دو کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

35 کاروانِ حجاز
مولانا ماہر القادری
حرمین شریفین کے خوش بخت لمحات کی رودادِ خاص

39 حجاز میں 14 دن
شورش کاشمیری
اُس سرزمین کی داستان جہاں جھولیاں بھر دی جاتی ہیں

46 مجرم کون؟
سید غلام حسین شیرازی
اُس محبِ وطن کی داستان' جس نے اولاد پر وطن کو ترجیح دی

56 داری!
محمد سلیم اختر
محبت کرنے والوں کے دلوں میں داری اور بارو کی داستان آج بھی زندہ ہے

62 دیکھتی آنکھیں
اعجاز احمد نگرال
لاہور سے، پیدائشی معذور، اُس دوشیزہ کی کتھا، جو وقت کی چکی میں پس گئی

70 ابا کی بختاور
محسن علی شامی
بھکر سے، ایک معصوم دوشیزہ کی حسرتوں کا مآل

74 انصاف
فرزانہ نگہت
اسلام آباد سے ایک دردناک کہانی

78 نرالے یہ بھید ہیں
مجید احمد جائی
ایک ظالم کا غرور و تکبر خاک میں ملاتی داستان

84 روگ عمر بھر کا ہے
نبیل جاوید
ایک ماں کا بیٹی سے عجب انتقام، سرگودھا سے

89 کینسر
سیمیں غزالہ نعمان
ناموں کے فرق سے جنم لینے والی غلط فہمی، اُس دوشیزہ کو راہِ راست پر لے آئی تھی

94 پامسٹ
ملک محمد اکرم آصر
ایک دست شناس کا دلخراش قصہ، جو گردشِ ایام کا شکار ہوگیا' میانوالی سے

101 تحسین کو خراجِ تحسین
میجر عبدالقدوس
گڈی آپا کے لیے اُن کے ہم سفر کی جانب سے نذرانۂ عقیدت

104 ہم شکل
ایم اے راحت
سچی کہانیاں میں پہلی بار برصغیر کے نامور قلم کار کا سنسنی خیز سلسلہ

122 کُتّے کی موت
نعیم عباس میوانی
مظلوم کی آہ نے عرش ہلا دیا، خدا کی لاٹھی نے کام دکھایا، پتوکی سے

132 عزت دار
ارم ناز
عزت دار معاشرے کے بطن سے جنم لینے والی ایک برہنہ سچائی' کراچی سے

پرنٹر: حسام محی الدین عباسی' سٹی پریس' OB-7 تالپور روڈ، کراچی / 021-35893121-35893122

پگلی — 138
راشد لطیف
صبر سے والا سے ایک معصوم دوشیزہ کی پامالی کی داستان

صدقہ — 142
آفرین الیس
واقعی خدا سے بڑا حافظ اور کوئی نہیں

نیکی کرنا جا — 145
[illegible]
اولاد سے لاپرواہی برتنے والوں کے لیے ایک عبرت انگیز دکایت

وڈیری — 147
سیدہ کاظمی
جو ہمیشہ خود کو آسمان کہتے ہیں انہیں زمین بھی قبول نہیں کرتی

استاد — 150
نعیم اللہ
ہم تو صرف دل پشوری کرتے تھے مگر استاد فون کے ذریعے......

ایمانداری کا ٹکٹ — 152
رانا محمد [illegible]
کرپشن کے منہ پر ایک نوجوان کا طمانچہ

تم یاد آتی ہو — 155
ایم سلطان
محبت صرف پانے کا نام نہیں اس کا دوسرا نام قربانی ہے

ادھوری کہانی — 158
عارف شہزاد
محبت کے ہاتھوں ناکام ہو جانے والے ایک نوجوان / بوڑھے کا حیات نامہ

جیت — 160
[illegible]
اپنوں کے ستم اٹھاتی ایک دوشیزہ کے عزم و ہمت کی منفرد سی داستان

سماج سیوا — 194
حمیرا خان
اس نوجوان کی کہانی، جو اپنے انوکھے ڈھنگ سے سماج سیوا کر رہا تھا

موسمی پرندے — 200
ریحانہ تنویر
ان مردوں کی کہانی جو پَر ملتے ہی ہر رشتہ چھوڑ کر اُڑ گئے

ڈھونڈو گے ہمیں — 206
نصرت سرفراز
اللہ والے ہاتھ کہاں آتے ہیں وہ بھی ایک ایسی ہی روحانی شخصیت تھے جو......

مفرور — 210
جاوید راہی
دو بہنوں کا قاتل بھائی جو مفرور ہو کر بھی قانون کو جُل نہ دے سکا

قلی سے افسر تک — 216
ممتاز احمد
انسان کا نصیب اُسے فرش سے عرش تک پہنچا دیتا ہے

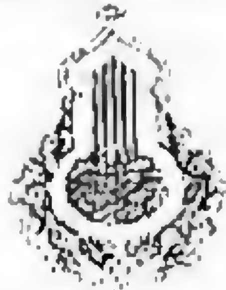
زہرِ عشق — 226
کاشی چوہان
خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور نیا سلسلہ

مسئلہ یہ ہے — 244
ادارہ
آپ کا مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

ہائیڈ پارک — 254
ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

تیرِ نیم کش — 257
قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

[illegible] ی پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



بدنصیب کون؟

ہم ہمیشہ اُن مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو ہم پر حکومتوں نے اپنی معاملہ فہمی کی کمی کی وجہ سے مسلط کیے، اپنی کمزور یا نہ ہونے کے برابر فارن پالیسی کی وجہ سے پاکستان مستقل مشکلات کے بھنور میں گھرا ہوا ہے۔ دور اندیش سیاسی لیڈر شپ ناپید ہے یا شاید وہ عوام کا بھلا چاہتے ہی نہیں۔ یہ وہ پریشانیاں ہیں جن کا ایک طویل عرصے سے ہمیں سامنا ہے مگر اس وقت اُمت مسلمہ کو درپیش مسائل کا سدباب بہت ضروری ہے۔ Syria کے حالات دگرگوں ہیں 1947ء کے بعد شاید یہ سب سے بڑی ہجرت ہے۔ سیریا کی عوام غذائی قلت کا شکار ہیں، ننھے ایان کی ترکی کے ساحل پر پڑی لاش نے دنیا کو ہلا دیا۔ ایان کُردی کی طرح بے شمار سیریائی باشندے سمندر کی بے رحم موجوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس! مسلمان ممالک خاموش ہیں...... ان کے لیے صرف اقتدار پر قابض رہنا اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں۔ ہم تو خوش نصیب تھے کہ خون کی ندیاں بہانے کے بعد اپنا ملک نصیب ہوا۔ ہجرت کے بعد اپنی زمین ملی' شناخت ملی' پہچان ملی طویل مسافت کے بعد ٹھنڈی چھاؤں پاکستان کی شکل میں نصیب ہوئی' مگر میں سوچتی ہوں بدنصیب سیریائی قوم ہے' جسے اتنی قربانیاں دینے کے بعد بھی پناہ گزین ہی کہا جائے گا۔ زمین کا کوئی ٹکڑا بھی ایسا نہیں جو انہیں ان کی شناخت دلا سکے۔ پتا نہیں کب تک یہ مہاجرین دربدر رہیں گے یا ہم جنہیں خوشبوؤں میں لپٹی پاک سرزمین کی قدر ہی نہیں......

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

بہت دنوں سے تو ہماری 'کچھ تلخ' کچھ شیریں باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ مگر اس بار دل چاہا 'سب اچھا' کہہ کر احوال کی محفل کا آغاز کیا جائے۔ ایک سوال کا جواب آپ سے چاہوں گا۔ کیا کبھی دو گھڑی سکون کے اس گردشِ ماہ وسال میں ہم نے اپنے لیے نکالے! سوچیے...... ضرور سوچیے کہ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ یہ خدا کی زمین ہے۔ یہ دھرتی جب تک ہم زندہ ہیں ہماری میراث ہے۔ دوستو! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ ہم کوئی بھی سمت پکڑ کر خود بخود چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ راستوں کی تھکن عجب تراوٹ دیتی ہے۔ لگتا ہے یہ اربوں کھربوں سال کی دنیا ہم آج پھر سے کھوجنے لگے ہیں۔ اجنبی راستے ہماری دسترس میں آگئے ہوں۔ مجھے سو فیصد یقین ہے ایسے وقت میں نئے راستے کھلنے لگتے ہیں۔ اور وہ نئے راستے نئی فرحت انگیزی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہماری ادبی زندگی ہے۔ نئی کہانیاں' نئی دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ یہ نئے آنے والے ساتھی اپنے ساتھ نئی نئی باتیں لاتے ہیں۔ مزے دار اُن کی باتیں' جنہیں سن کر مزہ آتا ہے۔ دل کو قرار ملتا ہے کہ آج بھی اہلِ ہنر اپنا کام ایمانداری سے کر رہے ہیں۔ آیئے ساتھیو! احوال کے طلسم کدے میں چلتے ہیں جس میں آپ کے محبت نامے ہمیں مہمیز کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

✉: احوال میں یہ آمد ہے اَدی زرینہ جونیجو کی، بورڑی شریف سے جو ایک طویل غیر حاضری کے بعد احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ آپ سب کیسے ہیں، کئی دنوں کے بعد احوال میں حاضری لگوا رہی ہوں۔ سلسلہ مسئلہ یہ ہے سے ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ ڈیئر سدرہ انور علی اور مور شاہد حسین بھیا آپ دونوں مجھے ہر ماہ یاد کرتے ہیں۔ اس کے لیے میں آپ دونوں کی ممنون ہوں۔ سدرہ انور اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) آپ نے پکارا اور ہم چلے آئے۔ جو کہانیاں

پڑھ سکی ہوں اُن میں، وہ رات' ایس امتیاز' زہر عشق' کاشی بھائی کی' قصور میرا امتیاز احمد' گواہ مقصود احمد بلوچ کی' ایالوشانی خامان کی' شعبان بھائی کی دیدہ عبرت' عامرامراور علی بشریٰ سعید احمد اور میں مرگیا سدرہ انور علی کی بہت اچھی تحریریں ہیں۔ عبدالمجید بھیا! آپ کی آپ بیتی پڑھی تھی بہت افسوس ہوا۔ باری تعالیٰ آپ کو اولاد کی خوشیاں نصیب فرمائے (آمین) اب اجازت' انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے اگر اللہ سائیں نے چاہا تو۔

☆: اڈی! آپ کی حاضری نے سچ مچ دل کو خوشی دی۔ آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔

✉: لیجیے ساتھیو! یہ آ گئی سواری بلکہ احوال تحسین جونیجو کی' عرض کرتی ہیں امن اور سلامتی کی دعاؤں کے سنگ عیدالاضحیٰ مبارک، ٹائٹل بہت پیارا لگا اس ادا سے۔ اداریہ منزہ آپی کا خواب بہت دلفریب رہا۔ سب سے پہلے تو اپنے بھیا کاشی کی بہت ممنون ہوں کہ میری تحریر کو اپنے محبوب پرچے میں جگہ عنایت کی۔ اللہ پاک اس عنایت سے آپ کو لازوال خوشیوں سے نواز دے (آمین) احوال کے رنگوں میں کشش بھر آئی ہے۔ احوال کا اختتام آپ کی خوبصورت نظم سے ہوا۔ اچھے بھائی شعبان کھوسہ ہمیں کہاں منظور اپنی محفل سے دور رہنا۔ شمارہ ہی لیٹ ملتا ہے تو کہاں جائیں۔ بقول کاشی بھیا کے سر سے تاج ہٹالیا جائے گا۔ بھیا آپ نے اس ریاست میں صرف پیڑ ہی نہیں لگائے بلکہ ایک خوبصورت باغیچہ بھی سجایا۔ جس میں طرح طرح کے میوہ جات بھی موجود ہیں۔ کوئی نا کوئی پھل تو اپنے حصے میں بھی ضرور آئے گا انشاء اللہ (پھل...... پورا ثمر ملے گا) پیاری سدرہ رانی! بجلی کو مات؟ ہم تو پہلے ہی بجلی کے ڈسے ہوئے ہیں۔ ڈسا ہوا انسان کسی کو کیا مات دے سکتا ہے۔ کیا حادثات پیش آئے تم کو؟ خیریت آپ ہی چکر لگالیتی ہیں اگر یہ ڈاک والے چکر نہ دیں تو...... تمہارا تبصرہ جاندار ہوتا ہے جیتی رہو۔ مور شاہد حسین بھائی، اب کی بار آپ کی سواری کہاں رہ گئی (مور جنگل کی سیر کو گئے ہوئے ہیں) منشی عزیز میئے بھائی! ہم کو حاضری لگوانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ مگر حاضری کا رجسٹر غائب ہو جاتا ہے۔ اشفاق شاہین بھائی آپ کی حاضری بھی کبھی کبھی ہوتی ہے؟ ارم ناز بہت عمدہ لکھ رہی ہیں۔ نزہت افشاں بھائی شکریہ اب تو پریاں بھی احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ پری زاد جہاں رہو خوش رہو۔ اب تھوڑا سا کہانیوں پر تبصرہ۔ موجودہ حالات کی عکاسی کرتی شعبان بھائی کی دیدہ عبرت بہت سبق آموز رہی۔ فضلو کی چوری' ارم ناز شبانہ اکبر اور صالحہ ناصر کی وہ اک بھول مختصر مگر بہترین۔ وہ رات! ایس امتیاز احمد کی ایک روایتی کہانی' سدرہ انور علی اور مجید احمد جائی بھائی کی تحریریں بھی بہت جاندار تھیں۔ شیشے پر لکیر، سبق آموز تحریر پڑھنے کو ملی۔ اب آخر میں، میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میری تحریر نا صرف پڑھی بلکہ تبصرہ بھی کیا۔ اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ شاد رہیں آباد رہیں۔

☆: اچھی تحسین! لو تمہارا شکوہ دور ہوا کہ تبصرہ کہاں جاتا ہے؟ اب جلدی سے یہ پرچہ پڑھو اور تبصرہ شروع کر دو تا کہ جلد پہنچ جائے۔

✉: راولپنڈی سے فرزانہ نگہت احوال کا حصہ بن رہی ہیں، لکھتی ہیں۔ بہت عرصہ بعد حاضر خدمت ہو رہی ہوں۔ لیکن سچی کہانیاں برابر زیر مطالعہ رہتے ہوئیں روح و دل شاد کیے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اسے آپ کے زیر ادارت روز افزوں ترقی عطا فرمائے آمین۔ ایک معصوم سی کہانی...... حاضر خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔ زمانہ طالب علمی میں گزرنے والا سچا واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد رہ گیا ہے۔ سوچا سچی کہانیاں کے دامن میں جھلملا جائے۔

☆: فرزانہ جی! جو جو کچھ یاد آتا جائے حوالۂ قلم کرتی چلی جائیں۔ امید ہے ہمارا اور آپ کا ساتھ اب قائم رہے گا۔ اگلے ماہ مجھے آپ کا سچی کہانیاں پر بھرپور تبصرہ بھی چاہیے۔

✉: احوال میں یہ مختصر ترین آمد ہے حمیرا قریشی کی لاہور سے۔ حمیرا پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں۔ فرسٹ ٹائم سچی کہانیاں میں لکھ رہی ہوں۔ ساتھ ایک عدد افسانہ اور اشعار بھی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے شاملِ اشاعت کیا جائے گا۔ خط کا جواب ضرور دیجیے گا انتظار رہے گا۔

☆: حمیرا! خوش آمدید! لیجیے آپ کا دوسطری خط شاملِ اشاعت ہوا۔ خوش! مگر اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ ہمارے ہاتھ میں ہو۔

✉: کراچی سے ہمارے پیارے بھائی اشفاق شاہین شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ پرچہ چار تاریخ کو ملا۔ سرورق بھلے پیارا تھا لیکن ڈبل پیج کی وجہ سے مزا نہیں آیا۔ اداریے پر پہنچے جہاں منزہ جی نے اپنے خواب میں شہر کراچی کے امن کو آواز اچھی لگیں۔ اللہ کرے یہ خواب سچا ہو کیوں کہ یہ ہم سب کا بھی خواب ہے۔ احوال میں پہنچے ہاں پہلے یہ بتاتے چلیں کہ اس بار بائنڈنگ جانے کیسی تھی سارے صفحات ہی جڑے ہوئے تھے، غصہ بہت تھا مگر احوال میں خط دیکھ کر سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بہت دنوں بعد خود کو پا کر تسلی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی، عزیز مئے سب سے پہلے احوالی تھے گڈ، مجید بھائی، ممتاز احمد اچھے خط تھے آپ کے۔ صائمہ مجید' اللہ کریم آپ کی تمام نیک خواہشات پوری کرے۔ سید ملازم حوصلہ مت ہارو' اچھا وقت ضرور آئے گا لوٹ کے۔ کشاف اقبال' تیمور عباس' طیبہ مخدوم' مقصود بلوچ' سیدہ کاظمی' رانا حبیب' انعم شہزادی' علی حسنین' انیس الرحمٰن' قمر سلطانہ' نعیم اللہ' آپ سب احوال کا حصہ بنے ہیں۔ آپ سب کو تہہ دل سے اس بزم کا حصہ بننے پر خوش آمدید' اپنی آمد سے اس بزم کی رونق آئندہ بھی بڑھاتے رہیے گا۔ آتے ہیں کہانیوں کی طرف محمد سلیم اختر' شو بز لَس لے کر آئے۔ اچھا لکھا عموماً انجام ایسا ہوتا نہیں، بہرحال اچھا لگا۔ مجید جانی ہمیں تو غمزدہ کر گئے۔ اُم مناہل سیاہ نصیب لے کر آئیں۔ آہ کچھ لوگوں کے لیے واقعتاً ہی یہ دنیا آزمائش کی جگہ بن جاتی ہے لیکن آخرت میں ضرور ان کو صلہ ملے گا۔ عارف شین روہیلہ خوددار تھے وہ۔ لے کر آئے ایک تلخ حقیقت' بڑی اماں مسز نگہت نے لاجواب لکھا۔ حنا اصغر بھی ایک کڑوا سچ لے کر آئیں۔ بابر نایاب یقین محکم کے ساتھ خوب جچ رہے تھے گڈ، اور ستارہ ڈوب گیا' اسماعیل بروہی انجام سے ہمیں دکھی کر گئے۔ ٹکا اور آنا روشانے نے بہت خوب لکھا۔ دستگیر شہزاد نے بھی گرفت میں اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ بس جلدی سے اب پوسٹ کرتے ہیں مبادا خط لیٹ نہ ہو جائے۔ تمام دوستوں کو آداب اور عیدالاضحیٰ مبارک۔

☆: بہت اچھے بھائی اشفاق! تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ اب آپ کی حاضری مستقل ہوئی تو ہمارا بھی دل اطمینان پائے گا۔

✉: مقصود احمد بلوچ میاں چنوں سے احوالی بن رہے ہیں' لکھتے ہیں اس دفعہ ستمبر 2015ء کا سچی کہانیاں مورخہ تین ستمبر کو ملا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ میں کچھ عرصہ سچی کہانیاں سے اپنی کسی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے دور رہا۔ لیکن میرے کسی بھی بہن بھائی نے میری کمی کو محسوس نہ کیا اور نہ ہی مجھے یاد کیا چلو خیر کوئی بات نہیں۔ ممتاز بھائی سرگودھا والے سر جی کیسے ہیں آپ' آپ تو بالکل بھول ہی گئے۔ آپ کی اسٹوری 'عید مبارک' اس مہینے کی سب سے ٹاپ کلاس اسٹوری تھی۔ میں اس دن چھٹی جا رہا تھا۔ اور آپ کی اسٹوری ٹرین میں ہی بیٹھ کر پڑھی۔ اتنی اچھی اسٹوری لکھنے پر بہت بہت مبارک

ہو جی۔ 'سوگ زندگی' مجید بھائی آپ کی اسٹوری بہت زبردست تھی۔ ویری گڈ' احوال میں ملازم حسین ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ اور دوسرا میرا بھائی رانا حبیب الرحمٰن ڈسٹرکٹ جیل لاہور میں ہے میں اپنے ان دونوں بھائیوں کے لیے دعا کروں گا کہ اللہ پاک آپ دونوں کو اس قید سے نجات دے۔ کیونکہ قید بہت بُری چیز ہے۔ رانا حبیب الرحمٰن میرے اس بھائی سے تو میری فون پر بات بھی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو۔ احوال میں نیو شامل ہونے والے میرے تمام دوستوں کو میری طرف سے خوش آمدید' خاص کر راشد لطیف صبر ے والا۔ ایم اشفاق بٹ صاحب' سدرہ انور علی جھنگ صدر' سسٹر کیسی ہو۔ آپ کا تعلق جھنگ سے ہے۔ اور جھنگ سے ہمیں بہت پیار ہے۔ آپ سوچ رہی ہوں گی کہ وہ کیوں؟ کیونکہ جھنگ رشید چوکی میرے سسرال کا گھر ہے۔ آپ کی اسٹوریاں ماشاء اللہ بہت اچھی ہوتی ہیں اور اس دفعہ بھی آپ کی اسٹوری' اور میں مرگیا' نے بہت متاثر کیا۔ ویری ویلڈن' آخر میں تمام قارئین رائٹرز کو میرا اسلام' اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں اگر زندگی رہی تو اگلے شمارے میں حاضر ہوں گے۔

☆: اچھے بھائی مقصود! تبصرہ زبردست رہا۔ بڑی گہری نظر رکھتے ہو آپ پرچے پر مگر کہانی میں کچھ اہم چیزیں بھول جاتے ہو۔ بادام کھایا کرو بھیا۔

✉: اکوال تلہ گنگ' چکوال سے یہ حاضری ہے ہمارے قاری دوست سلیمان شبیر کی' لکھتے ہیں۔ ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں ہمیں 31 اگست کو ملا اور کوشش کر کے ایک ہفتے میں مکمل پڑھ لیا ہے۔ اتنا اچھا پرچہ دینے پر کاشی بھیا آپ کو اور تمام اسٹاف سچی کہانیاں کو بہت بہت مبارک باد۔ سب سے پہلے منزہ آپی کا 'خواب' پڑھا۔ خواب تو خواب ہوتے ہیں اِدھر آنکھ کھلی اُدھر خواب ختم۔ اس کے بعد احوال میں کاشی بھیا کی محبتوں کا احوال دیکھا۔ کاشی بھیا جس طرح محبتوں سے آپ نے احوال سجا رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان محبتوں کو نظر بد سے بچائے آمین۔ احوال میں منشی محمد عزیز مئے، مجید احمد جائی اور سدرہ انور علی کے تبصرے بہت خوب تھے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اس شمارے کی سب سے اچھی کہانیاں عامر امراور علی' اور میں مرگیا دیدۂ عبرت' اپالو' قصور میرا' بہت ہی خاص تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ شوبز برانس' محمد سلیم اختر' سوگ زندگی' مجید احمد جائی' بھی خوب رہیں۔ اس کے علاوہ بھی تمام رائٹرز کی اسٹوریاں اچھی تھیں۔ بابا جی دکھی انسانیت کی جو خدمت کر رہے ہیں۔ اس کا اجر اللہ پاک اُن کو عطا فرمائے (آمین) ہائیڈ پارک میں بھی تمام اقتباس اچھے تھے اور تیر نیم کش میں انتخاب بہت اچھا تھا۔ اتنا خوبصورت پرچہ نکالنے پر ایک مرتبہ پھر بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ ہم شکل اور زہر عشق کی تعریف کے لیے الفاظ ندارد۔

☆: اچھے سلیمان! تمہاری آمد کا انتظار رہتا ہے۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ خوش رہو۔

✉: کراچی سے ریحانہ نسیم لکھتی ہیں ستمبر کا شمارہ ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ سرورق پر موجود حسینہ کو دیکھ کر لگا کہ جیسے ابھی کچھ کہنے والی ہے۔ کافی دیر تک انتظار کیا۔ مگر اُس نے اپنے لب نہیں کھولے تو پھر ہم نے رسالہ کھولا تا کہ پڑھ سکیں۔ سب سے پہلے منزہ آپا کا 'خواب' پڑھا۔ واقعی بہت ساری چیزیں تو اب خواب وخیال ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب آپ کی بات ہو جائے آپ نے لوگوں کے سوالات کا لکھا ہے کہ سب پوچھتے ہیں کہ آپ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں تو ان پوچھنے والوں کی لائن میں سب سے آگے میں ہی کھڑی ہوں کہ واقعی آپ اتنا کام کیسے کرتے ہیں۔ منشی محمد عزیز، ممتاز احمد' انیس الرحمان

آپ حضرات نے میرے خط اور تبصرے کو پسند فرمایا۔ آپ سب کا بے حد شکریہ۔ میں سمجھ رہی تھی کہ صرف کہانیوں کی تعریف ہوتی ہے۔ مگر میرے تو خط کو بھی پسند کیا گیا مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ اور یہ سب خوشیاں ہمارے کاشی بھائی کی بدولت ہیں۔ وہ پوری ایمان داری سے اپنا کام کرتے ہیں۔ اور نئے پرانے سب لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ میں اسی ہمت افزائی کی وجہ سے اپنی تھوڑی سی شاعری بھیج رہی ہوں۔ اور آپ سب پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ تبصرہ ضرور کریں تا کہ میری اصلاح ہوسکے۔ میرا مطلب ہے کہ میری شاعری کی اصلاح۔

☆: اچھی ریحانہ! تبصرے کا تو شکریہ۔ یہ بتائیں کوئی تحریر اب تک کیوں نہ آئی آپ کی اور تبصرہ آیا تو بس...... ارے کہاں گیا تبصرہ پرچے پر۔

✉: فریدہ فری لاہور سے لکھتی ہیں ستمبر کا سچی کہانیاں ملا۔ اس ماہ سب نے بہترین لکھا۔ مجبور وفا، کیا ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اب کہاں بھاگو گے، ٹکا اور آنا، گرفت ہم شکل پڑھ کر تو بے حد مزا آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایم اے راحت صاحب کو صحت کاملہ سے نوازے ان کے ایکسیڈنٹ کا سُن کر بہت دکھ ہوا۔ سدرہ انور علی کی کہانی اور میں مر گیا بہت ہی بہترین تحریر لگی۔ اللہ نے ایسے لوگوں کو کڑی سزا دی اور سزا بھی ایسی کہ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کاشی بھائی زہر عشق کی تو کیا بات ہے۔ یہ تو میگزین کی جان ہے پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔ گری اپنے پورے عروج پر ہے۔ حبس بہت ہے کہ تبصرہ میں رات کے بارہ بجے اے سی کی ٹھنڈک میں لکھ رہی ہوں۔ بس اتنا ہی پڑھا ہے اپنی نظم دیکھ کر خوشی ہوئی میری طرف سے سب کو بے حد سلام دعا خاص کر سوئٹ منزہ جی کو بے حد سلام اور پیار اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔

☆: فریدہ جی! پہلے تو آپ کی طبیعت بہتر ہونے پر اطمینان ہوا۔ ہر ماہ آپ کا تبصرہ آپ کی محبت کی دلیل ہے۔ سلامت رہیے۔

✉: سجدہ صابر، بورے والا سے پہلی بار شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں سلام کاشی بھائی، سچی کہانیاں میں میرا یہ پہلا لیٹر ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ میرا یہ احوال ضرور شامل کریں گے۔ میں اپنا مختصر سا تعارف کروانا ضروری سمجھتی ہوں۔ میں ایف اے کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مجھے لکھنے کا بے حد شوق ہے اور میں عرصہ تین سال سے مختلف رسالوں میں لکھ چکی ہوں۔ ستمبر کا شمارہ میری ایک دوست نے مجھے گفٹ کیا۔ پرچے کے ٹائٹل سے ہی پتا چل رہا تھا کہ یہ ایک معیاری اور اچھا رسالہ ہے۔ احوال میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ اُن میں سے کچھ لوگوں کو تو میں جانتی ہوں۔ جن میں سب سے پہلے مقصود احمد بلوچ' مجید احمد جائی' منشی عزیز مئے' ایم اشفاق بٹ' وغیرہ کاشی بھائی اگر آپ نے اور میرے لکھنے والے بہن بھائیوں نے مجھے خوش آمدید کہا تو انشاء اللہ احوال میں شامل ہوتی رہوں گی۔ اس دفعہ کہانیوں میں انکل سلیم اختر' مجید احمد جائی' سدرہ انور علی' ممتاز احمد' اور آخر پر مقصود احمد بلوچ ان سب اسٹوریاں قابل تعریف تھیں۔ مقصود احمد بلوچ بھائی آپ کی اسٹوری 'گواہ' بہت متاثر کن تھی۔ اگر زندگی نے وفا کی تو اگلی دفعہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہوں گی۔

☆: اچھی بہن سجدہ! خوش آمدید! لیجیے ہم نے آپ کا خط شاملِ اشاعت کر دیا۔ اب اگلے ماہ آپ اپنا وعدہ وفا کریں گی۔

✉: ایک طویل عرصے بعد ہیڈ بیکائی مظفر گڑھ سے ہمارے دوست لکھاری ملک عاشق حسین ساجد کی احوال میں آمد ہے، لکھتے ہیں۔ ماہ ستمبر کا شمارہ سچی کہانیاں میرے سامنے ہے۔ جو ہر حوالے

سے لاجواب ہے۔ اس میں ہر کہانی خوبصورت اور ہر سلسلہ کمال کا ہے مگر شعر و شاعری کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ احوال میں سبھی احباب گرمجوشی سے تبصرہ فرما ہیں۔ سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جو بہت غور سے اور دلجمعی سے شمارہ پڑھ کر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ محمد سلیم اختر بہت ہی معیاری تخلیق لیے تشریف فرما ہیں اور جاوید راہی صاحب اور کاشی چوہان کی عمدہ دلکش اور یادگار نقش چھوڑنے والی بہترین کاوشیں ہیں۔ ماشاء اللہ کاشی چوہان کی گرفت خاصی مضبوط اور مرکزی خیال خاصا پرتاثیر ہے۔ ویلڈن خدا آپ کو مزید ترقی دے۔

☆: ملک صاحب! تبصرہ گو مختصر تھا مگر آپ کی آمد نے آپ کا یہ قصور معاف کرا دیا۔ خوش رہو۔

☆: شاہد رفیق سہو کبیر والا سے شامل احوال ہو رہے ہیں لکھتے ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ بہت جلدی مل گیا۔ حسینہ ظالم آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جو کہ میں نظریں نہ ملا سکا۔ اس کے بعد منزہ سہام کا خواب پڑھا۔ احوال میں سب سے پہلے ختی عزیز صاحب بیٹھے تھے۔ اس کے بعد مجید احمد جائی ممتاز احمد صاحب آپ کی محبتوں کا شکریہ نبیل جاوید ملک تیمور عباس خان پور سدرہ انور علی ارم ناز ڈی جی خان سے ارم خان رانا حبیب الرحمٰن ندیم عباس میانی عثمان بلوچ شعبان کھوسہ انیس الرحمٰن فیصل ندیم بھٹی ابو ہریرہ بلوچ آپ سب کے احوال بہت پسند آئے۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا بہت شکریہ۔ ستمبر کے احوال میں حاضری نہ دے سکا معذرت۔ اس کے بعد کہانیوں میں اسماء اعوان جو کہ کامیاب جا رہی ہیں۔ شوبزنس سوگ زندگی سیاہ نصیب بڑی اماں جیون ہار دیا یقین محکم مجبور وفا اور میں مر گیا دیدۂ عبرت قصور میرا شیشے پر لکیر ہر طرف اداسی ہے وہ رات لاعلاج فضلو کی جورو زہر عشق جو ہماری نس نس میں سما چکی ہے۔ ہاں وہ پاگل تھا یہ سب اسٹوریاں بہت پسند آئیں۔ میری طرف سے ان رائٹروں کو ڈھیروں مبارکباد اس کے بعد مسئلہ یہ ہے بابا جی دن رات دکھی لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک میں رانا حبیب الرحمٰن راشد لطیف عاصمہ کوثر ممتاز احمد نے بہت اچھا انتخاب کیا۔ تیر نیم کش میں ماہین فاطمہ ثمینہ ناز ممتاز احمد ارم خان نوشین امجد نگین خلیل میجر امتیاز سب ہی بازی لے گئے۔ ہم اپنے بزرگ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہیں اللہ انہیں صحت یاب کرے۔

☆: اچھے شاہد! خوش رہو! اللہ تم کو بھی ہر میدان میں کامیاب کرے یہ تو بتاؤ آج کل کہاں گم ہوتے ہو۔

☆: خانیوال سے چوہدری پرویز سہو لکھتے ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ بہت جلدی مل گیا احوال میں سب سے پہلے تو میں شکریہ ادا کروں گا جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔ کہانیوں میں عامر امداد علی برطانیہ میں خزاں عداوت، گواہ ہاں وہ پاگل تھا فضلو کی جورو اک بھول وہ رات شیشے پر لکیر قصور میرا ممتاز احمد صاحب زہر عشق کاشی چوہان مجبور وفا اب کہاں بھاگو گے ہم شکل اور میں مر گیا دیدۂ عبرت یہ اسٹوریاں مجھے بہت پسند آئیں۔ اس کے بعد مسئلہ یہ ہے ہائیڈ پارک تیر نیم کش بہت اچھے سلسلے ہیں۔ آخر میں ممتاز احمد راشد لطیف ایم یعقوب چوہدری فہد علی سہو حسیرا جبیں ثمینہ شہزادی شاہد رفیق سہو کو سلام قبول ہو۔

☆: چوہدری صاحب! احوال میں غیر حاضری کیوں ہونے لگی ہے۔ اگلے ماہ سے آمد مستقل بناؤ۔

☆: ہماری سینئر قاری اور لکھاری ساتھی مس منزل خان عرصہ دراز بعد احوال میں تشریف فرما ہیں، لکھتی ہیں۔ تمام احوالیوں کو میرا خلوص بھرا سلام اور آداب۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی

تو ٹائٹل گرل اپنے تیکھے نقوش کے ساتھ نہایت ہی حسین لگی۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے 'خواب' میں پہنچے۔ جو صرف منزہ سہام ہی کا نہیں بلکہ کراچی میں رہنے والے ہر شہری کا خواب ہے۔ احوال میں پہنچے تو کاشی کی بات نے لکھنے کے شوق کو اور ہوا دی۔ یہاں ایک بات بتاتی چلوں کہ سچی کہانیاں نہ تو میرے لیے نیا ہے اور نہ میں اس کے لیے۔ کیونکہ سچی کہانیاں میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہانیوں بھی میری شائع ہو چکی ہے مگر پھر تعلیمی اور عملی زندگی کی مصروفیات نے کچھ عرصہ مجھے اس سے دور کر دیا۔ احوالیوں میں محمد عزیز مئے' زینت' ممتاز احمد' فرح انیس' انیس الرحمٰن' انعم شہزادی' ندیم عباس اور تیمور عباس نہایت خوبصورت خطوط کے ساتھ تشریف لائے۔ سید ملازم حسنین اور رانا حبیب الرحمٰن کو داد دیتی ہوں کہ جنہوں نے جیل میں ہوتے ہوئے قلم سے رشتہ نہیں توڑا اور اپنے آپ کو زنگ نہیں لگنے دیا۔ علی حسنین تابش آپ کے والد کے لیے دعا گو' قمر سلطانہ آپ نے بہت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ابو ہریرہ' فیصل ندیم' شاہانہ احمد' رضوانہ کوثر اور شعبان کھوسہ کے خطوط بھی اچھے رہے۔ پہلی کہانی شوبزنس ایک کڑوا سچ ہے۔ سوگ زندگی یقین نہیں آیا کہ کوئی ماں بھی کیا ایسا کر سکتی ہے۔ سیاہ نصیب اچھی تحریر تھی۔ اور ستارہ ڈوب گیا بہت اچھی کاوش، ٹکا اور آنا' گرفت' خوبصورت الفاظ سے گندھی تحریر تھی۔ اور میں مر گیا' جاندار تحریر تھی۔ دیدۂ عبرت معاشرے کی تلخ حقیقت کو اُجاگر کرتی نہایت اچھی تحریر تھی۔ عامر امر اور علی اس کہانی نے تو مجھے آبدیدہ کر دیا تھا۔ عداوت گواہ ہاں وہ پاگل تھا۔ فضلو کی جورو' اپالو' خوبصورت تحریریں تھیں۔ باقی وقت کی کمی کے باعث زیر مطالعہ ہیں فی الحال اب اجازت اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ اگلی بار پھر حاضری دیں گے۔

☆: مس منزل خان! آپ کی ایک عرصے بعد آمد کا شکریہ پرچہ آپ کے مطالعے میں رہا پڑھ کر اچھا لگا لیکن ...... یہ بتائیں اب تو ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی نا۔

✉: ہماری ساتھی صائمہ بشیر سرگودھا سے عرض گزار ہیں اگست کا شمارہ اور اُس میں اپنی غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس پرچے کی یہ بہت اچھی بات ہے کہ یہ اپنے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پُراسرار نمبر واقعی بہت پُراسرار ہے۔ ابھی تک سب کہانیاں نہیں پڑھ سکی لیکن جتنی پڑھی ہیں بہت ہی لاجواب ہیں۔ وہ گھونگھٹ والیاں پڑھ کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ممتاز کی قدرت کے کھیل بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ عظمیٰ شکور کی پریاں لے گئیں بھی اچھی لگی۔ تحسین جونیجو' شاہد رفیق' عثمان بلوچ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ماریا ناز چیچہ وطنی کی غزل بہتر تھی۔ اِس بار بھی احوال میں زیادہ تر نئے لوگ تھے جنہوں نے بہت ہی مزے کے تبصرے کیے۔ مسز نگہت غفار' صائمہ مجید' راشد لطیف' محترمہ تحسین' فیصل ندیم بھٹی وغیرہ کے تبصرے بہت اچھے لگے' بہرحال سب لکھنے والوں کو صائمہ آپی کا بہت بہت پیار اور کاشی کا زہر عشق تو کیا ہی کہنے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اپنی ایک سچی کہانی اور غزل ارسال کر رہی ہوں اچھی لگے تو ٹھیک ورنہ......

☆: اچھی آپی! انشاء اللہ کہانی پڑھ کر جلد آپ کو مطلع کریں گے۔ یاد کرنے کا شکریہ۔

✉: طویل عرصے بعد ہماری بہت اچھی لکھاری ساتھی سیدہ حجاب فاطمہ کراچی سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں **2009**ء میں جب میں نے سچی کہانیاں سے متاثر ہو کر قلم اٹھایا تو جو عزت مجھے اس پرچے نے دی میں اسے کبھی بھلا نہیں سکتی۔ اور پھر جب کچھ نجی مصروفیت کے باعث قلم دان

سے ہاتھ ہٹایا تو بھی ایسا نہیں تھا کہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ آج اگر میں یہ کہوں کہ سچی کہانیاں میرا میکہ ہے تو بے جا نہ ہوگا اور یہ میرے بہن بھائیوں کی محبت ہی ہے کہ آج پھر قلم ہاتھ میں سنبھال لیا۔ (اب قلم نہ چھوڑیے گا) اب اگر پرچے کی طرف آؤں تو اس بار کا پرچہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ پُراسرار نمبر ویسے بھی میرا فیورٹ نمبر ہے۔ سو جیسے ہی ہاتھ آیا پورا کا پورا چاٹ لیا۔ سبھی رائٹرز نے قلم کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور کامیاب بھی رہے برطانیہ میں خزاں، محمود شام کی اچھی کاوش ہے۔ کاشی بھیا! تمہاری زہر عشق ایک الگ ہی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ لائف بوائے اسماء اعوان کا اچھا سلسلہ ہے۔ اب تو ہم بھی لائف بوائے کے گرویدہ ہوگئے ہیں۔ خالہ بیگم غوثیہ نجیب کی کہانی پڑھ کر ایک سچا اور پُراسرار واقعہ یاد آ گیا جس کا ایک کردار میں خود بھی رہی ہوں۔ ناسازیٔ طبع کے باعث احوال میں شریک ہونے کی اُمید تو نہیں ہے پھر بھی کوشش کر رہی ہوں کیونکہ یہ دوسری بار ہے۔ پچھلی بار بھی لیٹر گھر میں ہی پڑا رہ گیا اور دل سے بس ایک صدا آتی رہی کہ کاش دیر سے ہی سہی اسے پوسٹ کر دیتی۔ اگر دوبارہ اس محفل میں خوش آمدید کہا گیا تو پھر وعدہ ہے کہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔

☆: لیجیے! ہم نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اب آپ کی باری ہے اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉: چشتیاں سے یہ آمد ہے ہمارے ننھے ساتھی علی حسنین تابش کی، لکھتے ہیں۔ ماہ ستمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل کی تو کیا ہی بات تھی۔ خوب صورت ٹائٹل آنکھوں کو بھا رہا تھا۔ پرچہ دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہماری بہت محترم آنٹی منزہ سہام جی کا اداریہ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ ان کے الفاظ دل میں اتر جاتے ہیں۔ اور پھر احوال میں اپنے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے خوب اچھا احوال لکھا تھا۔ پیارے بھائی منشی عزیز کیا خوب احوال لکھتے ہو۔ سدرہ انور علی، مجید بھائی اور باقی سب دوستوں کا احوال بھی پسند آیا۔ کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ پیارے بھائی مجید احمد جائی صاحب اتنی پیاری کہانی لکھنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ بھائی آپ کے ناول نے تو کمال کا جادو کر رکھا ہے ہم پر۔ واہ کیا خوب لکھتے ہو آپ ...... ہمیشہ کامیابیاں آپ کے قدم چومتی رہیں (آمین) پرچے میں دن بدن خوبصورتی اور نکھار آ رہا ہے۔ ایم اے راحت صاحب کی صحتیابی کے لیے دعاگو ہوں۔ ان جیسے عظیم قلم کار ہمارے ملک پاکستان کا فخر ہیں۔ اللہ پاک ان کو صحت یابی عطا فرمائے آمین۔ اور سچی کہانیاں رات دن ترقی کرتا رہے۔ (آمین)

☆: پیارے حسنین! تمہاری محبت ہمارا مان ہے۔ بڑے دن ہوگئے کہانی تو بھجواؤ بھائی۔

✉: ثمینہ شہزادی کی آمد ہے کبیر والا سے، عرض کرتی ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ شاہد رفیق سہو نے دیا۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں سیاہ نصیب' اُم مناہل' بڑی اماں نگہت غفار' مجبورِ وفا خوشنما جاوید' زہر عشق کاشی بھیا' لائف بوائے اسماء اعوان' اور میں مر گیا سدرہ انور علی' فضلو کی جورو ارم ناز' برزخ شبانہ اکبر' لاعلاج نزہت ناز' قصور میرا' ممتاز احمد' ہم شکل' ایم اے راحت' عداوت جاوید راہی یہ سب اسٹوریاں مجھے بہت پسند آئیں اور میں سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے ویلکم کہا۔

☆: اچھی ثمینہ! خوش رہو۔ تمہارا تبصرہ ہمیں خوشی دیتا ہے۔ کیا یہ خوشی ہمیں ہر ماہ نہیں مل سکتی؟

✉: ڈیرہ غازی خان سے ہمارے بہت پیارے دوست لکھاری ایم یعقوب لکھتے ہیں جولائی کا شمارہ ملا جس میں میری اسٹوری بھی تھی تھینکس جولائی کا تبصرہ پورے انصاف سے پوسٹ کیا تھا

جولائی کومگر آپ تک نہیں پہنچا خیر سوری' ناراضگی معاف، منزہ سہام کی بات دل میں گھر کرگئی۔ احوال میں سب شامل تھے۔ ارم خان' عبدالغفار عابد' ممتاز احمد' سدرہ انور علی' ندیم میواتی' شاہد رفیق وغیرہ۔ ارم بہن جی اپنے کبھی بھولتے نہیں، ہمیشہ دل میں رہتے ہیں۔ جولائی میں جس نے یاد رکھا سب کا شکریہ جولائی کی اسٹوریاں بھاگوں والی' شاید اس کی قسمت' بیاہی عورت چنے دال گھر کے ہی اچھے تھے۔ ساتویں بہن بھنور باندھ لیے' یہی صلہ ہے یہاں' لہو کے چراغ' ہم نے تو وفا کی تھی' کفارہ' تماشا تمام ہوا' گھور اندھیرا' اپنے ہاتھوں' عبدالغفار عابد گڈ جی! چھٹی حسن اولڈ ہاؤس' کیسی محبت کوئی کب تک سہے اور ممتاز بھائی خدا آپ کی حفاظت کرے بہت اچھا لکھا' مبارکباد اور نیا شمارہ اگست کو ملا احوال میں شاید رفیق' راشد لطیف' ممتاز احمد بھائی' فیصل ندیم' یوسف لغاری' ارم خان' سلیمان بشیر' سیدہ امامہ' حمیرا جبیں' عبدالغفار عابد' ندیم میواتی اور نئے احوالی دوستوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ عبدالغفار عابد جی۔ سدرہ انور علی' راشد وفا سیدہ امامہ' منعم اصغر پرویز سہو ندیم بھائی اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ اور اب اسٹوریوں پر تبصرہ ہو جائے۔ اسماء اعوان' منشی عزیز مے' شاہد رفیق سہو' میرا بیٹا میرا ارمان' دستگیر شہزاد' عثمان بلوچ' مجھے چینی لا دو' ایک سربستہ راز' معاویہ عنبر دٹو بہت بہت مبارک باد' لیلیٰ اقبال' شاہد سلیم' یوسف لغاری' رضوانہ پرنس تحسین جونیجو محمد سلیم اختر' اور واپس جاؤ' ہم شکل' زہر عشق ایم اے راحت قدرت کے بھید جناب ممتاز احمد ویری گڈ اینڈ مبارک باد بہت اچھا لکھا۔

☆: اچھے بھائی یعقوب! محبت میں خطا کیسی! تم تبصرہ بھیجو اور ہم نہ لگائیں ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔

✉: چوہدری فہد سہو' جو کانویں سے ہمارے ساتھ ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ ستمبر کا شمارہ بہت جلدی مل گیا منزہ سہام کا' خواب' بہت اچھا تھا۔ احوال میں منشی عزیز' ممتاز احمد' اور جن دوستوں نے یاد کیا ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہانیوں میں سیاہ نصیب اُم مناہل' شو بزنس سلیم اختر' بڑی اماں نگہت غفار' جیون ہار دیا حنا اصغر' مجبورِ وفا خوشنما جاوید' قصور میرا ممتاز احمد' لاعلاج نزہت ناز' فضلو کی جورو ارم ناز' ہم شکل ایم اے راحت اور میں مر گیا سدرہ انور علی' دیدۂ عبرت شعبان کھوسہ' یہ سب اسٹوریاں قابل تعریف تھیں۔ مسئلہ یہ ہے' تیر نیم کش' ہائیڈ پارک یہ سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔

☆: تبصرہ مختصر سہی لیکن تمہاری آمد نے ہمیں محظوظ کیا۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری آپا مسز نوید ہاشمی کی' لکھتی ہیں۔ منزہ سہام نے اگست میں عید مبارک میں حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، کاشی چوہان احوال کا دربار سجائے بیٹھے تھے۔ بے حد خوبصورت اور شاندار لگ رہا تھا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر' آپ کی محبت' محنت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ محمد اسماعیل بروہی میرے بھائی وعلیکم السلام' فرح انیس **24** اگست کا اسپیشل دن آپ کو بہت مبارک ہو۔ صائمہ مجید ہمیشہ خوش رہو۔ تمہارا محبت بھرا ہاتھ ہم نے تھام لیا ہے۔ سدرہ اور ممتاز احمد اور جس جس کی اگست ستمبر میں سالگرہ تھی۔ بہت بہت مبارک باد۔ رضوانہ کوثر آپ ہمیشہ ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ حمیرا جبیں احوال کا خط پسند کرنے کا شکریہ ندیم عباس دعا کرتی ہوں آپ کو کامیابی عطا کرے۔ دو میں سے کوئی ایک پیپر تو دے دیتے۔ ثمینہ ناز کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ ریحانہ نسیم کاشی چوہان کی زبان میری زبان ہے' واقعی ہم سب **95** فیصد سچے پاکستانی ہیں۔ مہتاب علی نہیں۔ اسماء اعوان کا لائف بوائے بے حد پیارا جا رہا ہے۔ پُراسرار نمبر مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں مسز نوید ہاشمی آپ پُراسرار نمبر میں

آہ...... گڈی آپا!

✉: محترمی و مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم!

انتہائی بوجھل دل کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ میری اہلیہ تحسین اختر جو آپ کے قلم قبیلے میں گڈی آپا کے نام سے پہچانی جاتی تھیں مورخہ 28 جولائی 2015ء تقریباً دن کے ڈیڑھ بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ اپنی کیفیت اور نقصان کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ آپ کے قلم قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ اپنی زبان میں میرے اس دکھ کو قارئین تک پہنچانے کا احسان کردیں۔

☆: یہ ای میل موصول ہوئی تو نا جانے کیوں ایسا لگا...... اندر یکدم بہت خموشی سی پھیل گئی ہے۔ ابھی 25 جولائی ہی کی تو بات ہے۔ میری بات ہوئی تو میں نے دلار سے کہا۔ ''آپا فکر نہ کیا کریں۔ آپ کا لکھا سب کچھ Save رکھتا ہوں۔'' بولیں۔ ''یہی تو مان ہے۔ کاش میں گھر میں سب سے کہتی ہوں کہ میرا ایک بیٹا کراچی میں ہے۔ بس اب جب لاہور آؤ تو ضرور ملنا......'' اور پھر یہ خبر جب عاصمہ باجی نے دی تو...... خدا سے دعا ہے کہ ہماری گڈی آپا کی مغفرت فرما کر اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

قارئین! آپ سے التماس ہے کہ گڈی آپا (تحسین اختر) کی بخشش کے لیے ایک بار سورۃ فاتحہ اور چار قل ضرور پڑھ لیں۔

ضرور رکھتی ہیں اس کی وجہ...... واقعی اُس کی وجہ مجھے نہیں پتا۔ اعجاز احمد فکر الں اچھی کہانی تھی میرا بیٹا میرا ارمان پر کیا تبصرہ کروں۔ آپ کی تعریف میرا مان ہے۔ آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ کو میری کہانی پسند آئی۔ منشی محمد عزیز مے، مجید احمد جائی' ممتاز احمد' خادم حسین' فرح انیس' یاسمین اقبال' نبیل جاوید' سدرہ انور علی' عظمیٰ شکور' ارم خان' ندیم عباس' شعبان کھوسہ' رضوانہ کوثر' شاہانہ احمد' فیصل ندیم' دستگیر شہزاد کے آخری الفاظ پسند آئے کہ ناخن بڑھ جائیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں انگلیاں نہیں۔ منشی محمد عزیز مے' منعم اصغر' عثمان بلوچ' فوزیہ فرید' شاہد رفیق سہو' غوثیہ نجیب' حاسم وقاص' معاویہ عنبر وٹو' لیلیٰ مردہ اقبال' شاہد سلیم آپ سب کی تحریریں اچھی تھیں۔ مجید احمد' محمد یوسف لغاری' جاوید راہی ممتاز احمد' چھا گئے۔ رضوانہ پرنس کہانی پسند آئی نیئر شفقت' ثناء کنول' مور شاہد حسین' عظمیٰ شکور' تحسین جونیجو' رئیسہ خالہ اچھی تحریریں تھیں۔ ہم محمد سلیم اختر کے سر پر تاج رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر اس ڈائجسٹ کا دل تھی۔ منزہ سہام انشاءاللہ ہمارا خواب ضرور حقیقت بنے گا۔ ستمبر میں شوبزنس تحریر بھی خوبصورت تھی، مجید احمد جائی کی کہانی بہت دلخراش واقعہ تھا۔ اُم مناہل' عارف شین' روہیلہ' مسز نگہت غفار' حنا اصغر' بابر نایاب' خوشنما جاوید' ایم اے شکیل' اسماعیل بروہی کی بھی تحریر پسند آئی روشانے عبدالقیوم' دستگیر شہزاد' سدرہ انور علی' شعبان کھوسہ' بشریٰ سعید احمد' جاوید راہی' مقصود احمد بلوچ' حاسم وقاص' ارم ناز نے بھی پُر اثر تحریریں لکھیں۔ صالحہ ناصر' ایس امتیاز احمد' شبانہ اکبر' خضریٰ بلند خان' محمد اسد علی بھٹی' نزہت ناز' ممتاز احمد آپ بھی چھا گئے۔

☆: پیاری آپا! جگ جگ جئیں...... تبصرہ اچھا لگا آپ کا امید ہے اپنی شفقت سے آپ ہمیں نوازتی رہیں گی۔

✉: یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے ساہیوال سے ایم افضل آزاد لکھتے ہیں میں دوسرے رسالوں کو پڑھنے اور لکھنے والا سادہ سا آزاد انسان تھا۔ عامر وکیل جٹ کو ایک دن ملنے کو دل کیا' تو ملنے چلا گیا

انہوں نے ستمبر کا سچی کہانیاں گفٹ کر دیا۔ جس کی دوشیزہ اپنے انداز سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ رسالہ بہت اچھا تھا۔ منزہ آپی کا خواب اس دنیا کی حقیقت تھی احوال میں کچھ نئے چہرے تھے کچھ دوسرے رسالوں میں بھی نظر آتے رہتے ہیں۔ اسٹوریوں میں شوبزنس' سیاہ نصیب' گرفت' زہر عشق کاشی چوہان کی اسٹوری قسط وار تھی اچھی لگی اگلی قسط پڑھنے کے لیے اب سچی کہانیاں خریدنا پڑے گا۔ اب ہر بار کوئی گفٹ تو نہیں کرے گا نا۔ جناب آپ سے ریکوسٹ ہے کہ آپ مس ماہا ملک کی بھی کوئی ناول شائع کریں۔ عامر وکیل آپ بھی کوئی اسٹور بھیجوں نا۔ سچی کہانیاں ڈائجسٹ دوسرے رسالوں سے مختلف ہے دنیا کے حالات کی تلخ حقیقت کو بیان کر رہا ہے لاعلاج' قصور میرا' شیشے پر لکیر' وہ رات' ہاں وہ پاگل تھا' عامر امر اور علی' برطانیہ میں خزاں عداوت' جیون ہار دیا' گرفت' دیدہ عبرت کی کہانیاں گڈ تھیں۔ عامر وکیل ندیم عباس ڈھکو' آصف جاوید' یاسر دکی' انتظار حسین ساقی' ریاض حسین شاہد' منیر رضا' ملک علی رضا فیصل آباد اور دنیائے ادب کی مشہور ناول نگار مس ماہا ملک کو سلام قبول ہو۔

☆: لیجیے ایم افضل آزاد! آپ کا تبصرہ شائع ہو گیا۔ اب آپ اگلے ماہ پرچہ خرید کر پڑھیں اور ہمیں فوراً تبصرہ روانہ کر دیں۔

✉: حمیرا جبیں شہر عبدالحکیم سے لکھتی ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ ملا ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ اس کے بعد احوال میں بہت اچھے تبصرے لے کر سب حاضر تھے۔ جن بہن بھائیوں نے مجھے یاد کیا اُن کا بہت شکریہ' شاہد رفیق سہو کا شکریہ۔ باجی سدرہ انور علی نے یاد کیا بہت شکریہ اور میں مر گیا' شیشے پر لکیر' عامر امر اور علی' بشریٰ سعید' فضلو کی جورو ارم ناز' برزخ شبانہ اکبر' لاعلاج نزہت ناز' سیاہ نصیب اُم مناہل' بڑی اماں نگہت غفار' مجبورِ وفا خوشنما جاوید' زہر عشق یہ سب کہانیاں بہت پسند آئیں۔

☆: اچھی گڑیا! تبصرے کا شکریہ۔ تم خود بھی تو کچھ لکھ کر بھیجو۔

✉: راولپنڈی سے سیدہ امامہ علی لکھتی ہیں۔ ماہ ستمبر کا شمارہ ملا ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ سب سے پہلے کاشی چوہان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے اپنی بزم میں ویلکم کیا اور شاہد رفیق سہو کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سچی کہانیاں سے تعارف کروایا اور جن احباب نے مجھے ویلکم کیا ان کا بھی شکریہ۔ سب سے پہلے منزہ سہام کا خواب پڑھا اچھا تھا احوال بھی سب دوستوں کے بہت اچھے تھے کہانیوں میں لائف بوائے اسماء اعوان' سیاہ نصیب اُم مناہل' بڑی اماں نگہت غفار' جیون ہار دیا حنا اصغر' مجبورِ وفا خوشنما جاوید' ہم شکل ایم اے راحت' اور میں مر گیا سدرہ انور علی' فضلو کی جورو ارم ناز' برزخ شبانہ اکبر' لاعلاج نزہت ناز اور سب سے بیسٹ اسٹوری زہر عشق کاشی چوہان صاحب بہت زیادہ پسند آئیں۔ اس کے بعد مسئلہ یہ ہے' ہائیڈ پارک' تیر نیم کش بہت ہی اچھے سلسلے ہیں۔ شاہد رفیق سہو آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔

☆: پیاری بہن! آپ کی آمد اچھی لگی۔ آپ سب کی محبتیں ہی ہمیں اچھا کام کرنے پر اکساتی ہیں۔

✉: رانا حبیب الرحمٰن سینٹرل جیل لاہور سے شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں ادارہ سچی کہانیاں اور اس کے قارئین و رائٹرز کو میری طرف سے عیدالاضحیٰ مبارک ہو کاشی بھائی کیسے ہیں آپ۔ اپنے پچھلے ماہ کیے گئے وعدے کے مطابق حاضر ہوں۔ سچی کہانیاں مجھے تین ستمبر کو ملا تو جناب تعریف ہمیشہ اس چیز کی جاتی ہے جو پسند آئے لیکن نہ تو جھوٹی تعریف کرنا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی کروانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن

کچھ سوالوں کے جواب درکار ہیں۔ آپ نے مجھے بھائی زبانی یعنی دکھاوے کے لیے بنایا ہے یا دل سے..... (اپنے دل سے پوچھ لو) دوسرا سوال تیر نیم کش میں میں کہاں موجود ہوں۔ (اس ماہ موجود ہو) ہائیڈ پارک میں باقی تحریریں کہاں ہیں۔ (صرف ایک لگتی ہے) نمبر چار باقی خط کہاں غائب کر دیا۔ (پالیسی) بہت بہت شکریہ اُن دوستوں کا جنہوں نے مجھے ویلکم کیا۔ احوال میں جانے سے پہلے آنٹی منزہ سہام سے پوچھوں گا کہ آپ اب بھی خواب دیکھتی ہیں؟ انسان ہی خواب دیکھتے ہیں بھائی! اس کے بعد احوال میں سب سے پہلے احوالی منشی عزیز میئ شکریہ مجید احمد جائی' ممتاز احمد' خادم حسین' فرح انیس' یاسمین اقبال' صائمہ مجید جائی' اشفاق شاہین' نبیل جاوید کے تبصرے اپ ٹو ڈیٹ تھے۔ نبید ملازم حسین بہت اچھے آپ کی تحریر ضرور پڑھوں گا۔ ندیا تمہیں کیا ہوا۔ سفیان صاحب خدا کا خوف کریں۔ ارم ناز' سیدہ کاظمی نے بھی اچھا لکھا ہے عظمیٰ شکور صاحبہ۔ آپ کی تحریریں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ باقی 25 احوالیوں کے بھی تبصرے بیسٹ تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو آپ کو ایک جگ بیتی ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ سوگ زندگی' اگر کسی کے لیے گڑھا کھودو گے تو اپنے لیے تیار ملے گا۔ گرفت میں حماد مغل نے اپنے رقیب سے انوکھا انتقام لے کر خوش کر دیا۔ نویں سچ بیانی ایم شکیل کی لکھی ہوئی کہاں بھاگو گے کو پڑھ کر بغیر کسی کی اجازت کے اس کا نام تبدیل کر دیا اور نیا نام خیال کی دنیا رکھ دیا۔ اُمید ہے پسند آئے گا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے آئندہ کے لیے میرے پاس خط لفافے اور رقم بھی نہیں ہے۔ جس سے میں رسالہ اور خط لفافے کسی سے منگوا سکوں اس لیے یہ چیزیں نہ ملنے تک خدا حافظ۔

☆: اچھے بھائی! تمہارا تبصرہ پڑھ کر تھوڑا دکھ بھی ہوا کہ تم نے ہم پر بھروسا کیوں نہ کیا کہ ہم نے تمہیں بھائی کہا ہی نہیں دل سے مانا بھی ہے۔ باقی باتوں کے جواب دیے جا چکے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ تبصرہ بھیجنے کی آخری تاریخ 7 ہے۔

✉: سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں 31 اگست کو ستمبر کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل پر بیٹھی لڑکی بالکل پسند نہیں آئی کاشی بھیا یہ موسیٰ رضا وہی ہیں جو دوشیزہ اور سچی کہانیاں کا ٹائٹل دیتے ہیں؟ (جی بالکل) منزہ آنٹی کا اداریہ خواب کیا کہنے! احوال میں سب نے ہی بہت اچھا لکھا کشاف اقبال' سید ملازم حسین' تیمور عباس' محمد سفیان' سیدہ کاظمی' رانا حبیب الرحمٰن' عثمان بلوچ' انعم شہزادی' انیس الرحمٰن' قمر سلطانہ' کو احوال میں خوش آمدید مرحبا۔ جلد تم چاند بن جاؤ ہم پھر سے عید کرتے ہیں۔ میری طرف سے تمام اہلیان سچی کہانیاں کو عیدالاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو اینڈ آپی زرینہ جونیجو رانا محمد شاہد بھیا' منور شاہد حسین بھیا' سعید گلاب احمد بھیا' اشفاق بٹ' عبدالغفار عابد بھیا' نصرت سرفراز' شازیہ گل' ثمینہ ناز آپی' عبدالعزیز انکل' صفیہ سلطانہ مغل' عبدالرؤف عدم' فریدہ یوسفزئی پلیز واپس لوٹ آئیں۔ مجید احمد بھیا اور صائمہ بھابی السلام علیکم میری ساری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ڈیئر عظمیٰ شکور جی واہ سارے تیرے اپنے ہیں، ہم کہاں تجھ کو بھول سکتے ہیں۔ بس محسوس کر، تو اپنے بہت قریب پاؤ گی۔ محمد عزیز بھیا' نبیل جاوید' ڈیئر اپیا مسز نوید ہاشمی' ارم خان تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ فرح انیس آنٹی ثمینہ فرح' شائستہ جمال آپ کہاں گم ہیں؟ ثمینہ ناز آپی اب کیسی ہے طبیعت آپ کی۔ پلیز گیٹ ویل سون۔ لائف بوائے اصلی ہیروں کی کھوج لائے، اسماء اعوان ویلڈن ڈیئر

سسٹر، سلیم اختر انکل کی شوبزنس بہت خوبصورت کہانی ہے۔ سوگ زندگی، سیاہ نصیب، کمانڈو شعبان بھیا کی دیدۂ عبرت، مسز نگہت غفار، جیون ہار دیا، یقین محکم، مجبور وفا، اب کہاں بھاگو گے، نکا اور آپا روشانے، گرفت، اور ستارہ ڈوب گیا، امر عامر علی، جاوید راہی کی عداوت، بہت بہترین کہانیاں تھیں۔ دل خوش ہوگیا پڑھ کر۔ تین مرد تین کہانیاں میں سب کہانیاں پسند آئیں۔ ممتاز احمد بھیا کی، قصور میرا بہت ہی عبرت انگیز تحریر ہے۔ زہر عشق کا جام ہنس ہنس کے پی گئے۔ کاشی بھیا زہر عشق کی ساتویں قسط بہت پسند آئی۔ فضلو کی جورو، وہ اک بھول، وہ رات، شیشے پر لکیر، ہر طرف اُداسی ہے، برزخ دلچسپ و سبق آموز تحریریں پسند آئیں۔ ہائیڈ پارک سبھی کے انتخابات خوبصورت تھے۔ تیرنیم کش میں منشی محمد عزیز بھیا اور ارم خان کے شعر پسند آئے۔ تبصرے میں کچھ رہ گیا ہو تو بہت معذرت، بالکل آخری لمحات میں میرے احوال میں سب ساتھ ساتھ ہو جائیں اک سیلفی ہو جائے کاشی بھائی جان آپ سب سے آگے کھڑے ہوں ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں، بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے گا۔ آپ سے نیکسٹ ملاقات تب ہوگی جب اللہ نے چاہا۔ حیات باقی ملاقات باقی سو اللہ نگہبان۔

☆: اللہ عمر دراز کرے ہماری اس آفت کی پڑیا کی، تبصرے نے دل موہ لیا۔ خوش رہو۔

✉: ڈی جی خان سے ہماری بہت اچھی بہن ارم خان ہمارے ساتھ ہیں۔ لکھتی ہیں ستمبر سچی کہانیاں اس بار دو تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے احوال کی طرف دوڑ لگائی جہاں محفل میں کئی نئے مہمانوں کا اضافہ تھا۔ خوش آمدید۔ فرح انیس ڈیئر سسٹر آپ کی شکایت تھی کہ میں نے کان دونوں کیوں نہیں پکڑے تو سسٹر ایک ہاتھ میں قلم تھا جس سے خط لکھ رہی تھی۔ سو ایک ہاتھ سے کان پکڑ کے کام چلا لیا سمجھا کرو۔ احوال میں ایک بھائی شامل تھے رانا حبیب الرحمٰن اُن کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور میں نے ان کے لیے دعا بھی کی۔ احوال میں تمام خط اچھے تھے۔ کہانیوں میں شوبزنس، سوگ زندگی، سیاہ نصیب، خودار تھے وہ، بڑی اماں، جیون ہار دیا، یقین محکم، مجبور وفا، اب کہاں بھاگو گے، اور ستارہ ڈوب گیا، نکا اور آنا، گرفت، اور میں مرگیا، دیدۂ عبرت، ہاں وہ پاگل تھا، شیشے پر لکیر، قصور میرا، پڑھیں جہاں یہ کہانیاں پسند آئیں وہاں دکھ بھی ہوا۔ باقی سلسلے وار میں پڑھتی نہیں۔ سوری تیرنیم کش میں فرح انیس سدرہ انور علی ممتاز احمد، نگین خلیل کی شاعری پسند آئی۔

☆: اچھی بہن ارم! سلامت رہو! رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے۔

✉: ملازم حسین شینالیہ سے پہلی بار ہمارے احوالی بن رہے ہیں لکھتے ہیں میں پہلی بار احوال اور سچی کہانیاں کی محفل میں حاضری دینے آیا ہوں۔ کافی عرصے سے ایم یعقوب صاحب میرے ساتھ جاب کرتے ہیں اور ہم ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ ہر ماہ سچی کہانیاں بازار سے لے آتے اور پھر پڑھتے پڑھتے مجھے بھی پڑھنے کا جنون ہوگیا۔ ماشاء اللہ ہمارے ایم یعقوب بھی اچھا لکھتے ہیں اپریل، جولائی اور اگست کے شمارے پڑھے تو مجھ سے لیٹر لکھے بغیر رہا نہ گیا۔ احوال میں سب دوست موجود تھے۔ میرے لیے سب نئے تھے۔ اسٹوریاں ٹاپ کی تھیں۔ اسماء اعوان لائف بوائے کے ساتھ بچھڑوں سے ملا رہی تھیں۔ بھلا اعجاز احمد شاہد رفیق، سہو خون کا پیاسا، مسز نوید ہاشمی، منشی عزیز مے، خالہ بیگم پسند آئیں، معاویہ عنبر دتو کی اسٹوری میری سوچ سے بالاتر تھی۔

عقابی حویلی' شاہد سلیم' مجید احمد جائی' محمد یوسف لغاری' ممتاز احمد' رضوانہ پرنس' نیر شفقت' مہر شاہد حسین کمال کر دیا۔ پریاں لے گئیں' وہ یکم جنوری' مالکن کا عاشق' محمد سلیم اختر اچھا لکھا اور ایم اے راحت' جاوید راہی' اور کاشی چوہان زہر عشق میرے فیورٹ رائٹرز ہیں' اللہ اپنی حفاظت میں رکھے آمین۔ اور ہائیڈ پارک' تیر نیم کش' مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات سے مسائل کا حل بہت اچھے سلسلے ہیں۔ میری دعا ہے اللہ سب کو خوش وخرم رکھے آمین۔

☆: پیارے بھائی ملازم حسین! خوش آمدید! یعقوب کا شکریہ کہ پڑھتے پڑھتے آپ کو بھی ہمارے احوال کا حصہ بنا دیا۔ اب آپ نے احوال میں خود آنا ہے۔

✉: نعیم اللہ ہڈالی، خوشاب سے مختصر تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں امید کرتا ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ستمبر کا شمارہ بہت ہی اچھا لگا۔ سب سے پہلے خواب منزہ سہام نے بہت خوب لکھا۔ احوال حسب معمول اچھا لگا۔ ہر طرف اُداسی ہے۔ لائف بوائے کہانیاں اچھی لگیں۔ ایم اے راحت کا ناول ہم شکل بہت اچھا جا رہا ہے۔ اور کاشی چوہان آپ کا تو بہت خوب صورت ناول ہے۔ تیر نیم کش بھی زبردست سلسلہ ہے۔ ابھی باقی کہانیاں پڑھی نہیں۔ امید ہے وہ بھی اچھی ہی ہوں گی۔ آگے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

☆: پیارے ندیم! انشاء اللہ بہت جلد تم بھی ان ہی صفحات پر جگمگا رہے ہو گے۔

✉: ملک محمد اکرم آفیر' میانوالی سے لکھتے ہیں میں اپنی پہلی کہانی آپ کو ارسال کر چکا ہوں یہ میری دوسری کاوش ہے۔ امید کرتا ہوں کہ پہلی کہانی کی طرح میری دوسری تحریر شدہ کہانی بھی پسند آئے گی۔ ڈائجسٹ سچی کہانیاں باقاعدگی سے ہر ماہ پڑھ رہا ہوں بلکہ میرے پاس تو آپ کا 1985ء میں جو رسالہ پہلی بار شائع ہوا تھا وہ بھی موجود ہے جو کہ مجھے لاہور سے پرانے ڈائجسٹ منگوانے پر ملا تھا۔ سچی کہانیاں میں لکھنے والے واقعی نبض شناس لوگ ہیں۔ اور آپ کا اپنے لکھنے والوں کے لیے ایوارڈ اور سند والا سلسلہ ایک اچھی پیش رفت ہے۔ لکھنے والوں کے لیے حوصلہ افزائی بھی ہے۔ یہ سلسلہ یوں ہی قائم و دائم رہنا چاہیے۔ میں اس ڈائجسٹ کو لوگوں میں زیادہ سے زیادہ قائل کرنے کے حق میں ہوں۔

☆: پیارے بھائی اکرم! آپ کی تحریر اچھی لگی مگر تبصرہ کیا ہوا۔ آپ یقیناً اگلے ماہ ہمیں اپنا بہترین سا تبصرہ بھی ضرور ارسال کریں گے۔

✉: مدتوں بعد ہمیں ہماری بہت پیاری بہن صائمہ سحر نے کراچی سے یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں تین سال بعد پھر احوال میں شرکت کر رہی ہوں۔ آپ لوگ بھول تو نہیں گئے نا؟ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا خواب پڑھا۔ آنٹی جی آپ کا خواب انشاء اللہ بہت جلد حقیقت بن جائے گا کیونکہ اب کراچی کے حالات پہلے سے کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ آنٹی جی کو میرا پُرخلوص سلام! احوال میں تمام خطوط بہترین تھے۔ اور نئے دوستوں کو احوال میں دیکھ کر سچی کہانیاں کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ کہانیوں میں لائف بوائے شیمپو کے بارے میں اسماء اعوان کی کہانی پڑھی، اچھی لگی۔ باقی کہانیوں میں شو بزنس' سوگ زندگی' سیاہ نصیب' خوددار تھے وہ' بڑی اماں' جیون ہار دیا' یقین محکم' مجبور وفا' اب کہاں بھاگو گے' ستارہ ڈوب گیا' ٹکا اور آنا' گرفت' دیدۂ عبرت' عامر امراؤ علی' عداوت' اپالو' گواہ' وہ رات' لاعلاج' ہر طرف اُداسی ہے' قصور میرا بہت اچھی کہانیاں تھیں اور سدرہ انور علی کی اور میں مر گیا بہت زبردست

تحریر تھی۔ تمہاری کہانیوں میں کافی نکھار آ گیا ہے۔ زورِ قلم اور زیادہ ہو محمود شام کا سفرنامہ برطانیہ میں خزاں ایک معلوماتی سفرنامہ تھا۔ اور سلسلے وار کہانیوں میں کاشی بھیا کی زہرِ عشق اور ہم شکل سوپر ڈوپر ہٹ کہانیاں ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اور کامیابیاں دے آمین۔ اس ماہ اتنا ہی انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی، کہانی کے ساتھ۔ جب تک کے لیے اجازت' اِس دعا کے ساتھ اللہ پاک ہم سب انسانوں پر اپنا خاص کرم فرمائے اور وطنِ عزیز کو امن کا گہوارہ بنا دے (آمین)

☆: پیاری بہن صائمہ! یہ تو بتاؤ تین سال کے 36 ماہ میں کوئی ماہ ایسا نہ گیا کہ ہم یاد آئے ہوں۔ ویلکم بیک' مگر اب غیر حاضر نہ ہونا ورنہ......

✉: تقریباً پندرہ برس بعد احوال میں ہماری بہت ساتھی لکھاری اور شاعرہ روبینہ ناز روبی' رضا آباد' فیصل آباد سے احوالی بن رہی ہیں لکھتی ہیں اچھے بھیا کاشی چوہان جگ جگ جئیں، لیجیے آج قلم تھام ہی لیا پندرہ سال کی گوشہ نشینی کے بعد۔ ابتدا آپ کے پیارے جریدے سے ہی ہو رہی ہے۔ پہلے تو آپ اور آپ کی تمام ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ اتنا اچھا اور جامع پرچہ جو جرائد کی دنیا میں اپنا منفرد و اعلیٰ مقام بنا چکا ہے۔ اور دنیائے ادب کے انمول گوہر جیسے ممتاز احمد' جاوید راہی' گڈی آپا' عظیم الدین انصاری' ایم اے راحت اور دیگر تمام قلم کار ہر ماہ اپنی دلکش تحریروں سے ہمیں محظوظ کرتے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ بے لاگ تبصرہ کروں مگر وقت کی کمی آڑے آ رہی ہے۔ اگلے ماہ سے انشاء اللہ ہر تحریر پر تبصرہ ہوا کرے گا۔ کچھ نگارشات ارسال ہیں معیار کو چھوئیں تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکوریت و ممنونیت کا نادر موقع عنایت فرمائیں اس کی مزید ترقی کے لیے دعا گو۔

☆: اچھی آپی! آپ نے آ کر ہمارا مان بڑھایا۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اور اب سچی کہانیاں سے دور نہ جایئے گا تحریر فوراً بھجوائیں۔

✉: عبدالغفار عابد' چیچہ وطنی سے احوال میں رونق افروز ہیں، لکھتے ہیں تبصرے کا آغاز حسب معمول باجی منزہ کے ادارے 'خواب' سے کرتا ہوں۔ باجی آپ کی لمبی عمر کے لیے دعا گو آپ لکھتی رہیں آپ کی تحریریں مہمیز کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہر کہانی سماج میں بکھری ہوئی برائیوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔ محترم ممتاز احمد کی تحریر قصور میرا انسانیت کی توہین تھی۔ حنا اصغر کی جیون ہار دیا' ایک سبق آموز تحریر تھی ان لوگوں کے لیے جو غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ مسز نگہت غفار' بابر نایاب اچھی لگیں۔ سسٹر سدرہ اپنی تحریر اور میں مر گیا میں یہ سمجھانے کی کوشش میں تھی کہ جو دوسروں کی زندگیوں کو عذاب بنا دیتے ہیں پھر ایک دن خود ان کی زندگی ان کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ دستگیر شہزاد کی گرفت بھی آج کے انسان کے منہ پر طمانچہ تھی۔ اُم مناہل کی سیاہ نصیب ارم ناز کی نفسلو کی جورو اور شبانہ اکبر کی برزخ پڑھ کر پختہ یقین ہو گیا کہ اس معاشرے میں عورت کو کوئی حق نہیں جینے کا کاشی بھیا کی زہرِ عشق اور ایم اے راحت کی ہم شکل اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اب کچھ ذکر محفل احوال کا بھی ہو جائے۔ اس محفل کی رونق کو دیکھ کر کاشی بھیا کی محنت اور محبت کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کے اور کل کے سچی کہانیاں میں بہت فرق ہے۔ آج کا سچی کہانیاں مقبولیت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ یہ کاشی بھیا کا ہی کمال ہے۔ اشفاق شاہین یہ آپ کی محبتوں اور حوصلہ افزائی کا ہی صلہ ہے۔ باجی نوید ہاشمی محبت کا دروازہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا اور نفس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ دنیا کا دوسرا نام ہی محبت ہے۔ رانا حبیب الرحمٰن زندگی بہت

بوجھ لگتی ہے جب آدمی کو انصاف نہیں ملتا ہماری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ انعم شہزادی یہاں سبھی آپ کی محبت کی قدر کریں گے۔ بھائی عزیز منشی یاد آوری کا شکریہ نئے آنے والے دوستوں کو جی آیاں نوں کہتے ہیں۔ غیر حاضر دوستوں سے گزارش کرتے ہیں کہ اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ ایم اے راحت کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ ساتھیو! موت انسان کو ضرور مارسکتی ہے مگر اچھے کردار اچھے اخلاق ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ لفظوں میں بھی اور دعاؤں میں بھی۔ آئیں محبتیں تقسیم کرنے کا عہد کریں۔ یہی زندگی کا اہم مقصد ہے۔

☆: بھائی غفار! تمہاری محبت بھی ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ تبصرے کے لیے لفظ شکریہ اچھا نہیں لگتا۔

✉: گجرات سے یہ احوال میں حاضر ہیں انعم شہزادی، لکھتی ہیں گجرات سے اڑان بھرلی احوال کی پُر رونق محفل پہنچتے پہنچتے سانسیں پھول گئیں...... اُف بھیا کاشی...... پا...... پانی...... پانی ملے گا۔ ارے بھائی یاد آیا وہ سلمان ابراہیم کا ہم شکل صنوبر کی طرف جارہا تھا۔ ذرا خیال کرنا کہیں کچھ انہونی نہ کر بیٹھے کیونکہ اصلی سلمان اس وقت اپنی ماما کے پاس بیٹھا ہے۔ میں تو آنکھ بچا کر نکل آئی کیونکہ وہ ایڈیٹر صاحب سے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگلے ماہ احوال میں نہ پہنچی تو پر کاٹ ڈالیں گے۔ ورنہ میں ضرور صنوبر کی مدد کرتی۔ بھائی جلدی جاؤ پانی میں خود لے کر پی لیتی ہوں۔ اب آتی ہوں احوال کی طرف تو سبھی نے بہت خوب لکھا سب سے جیت پٹے تبصرے انعم شہزادی اور عظمیٰ شکور کے لگے۔ وری گڈ' مجھے پتا ہے تقریباً سبھی احوالی اکتوبر میں مجھے خوش آمدید کہتے نظر آئیں گے۔ لو جی میں ایڈوانس میں بھی کا بہت بہت سا شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔ سبھی کو خدا خوش وخرم رکھے (آمین)۔ ستمبر کے شمارے میں اشاعت شدہ کہانیوں میں خون کے آنسو رلا دینے والی تحریر بھائی مجید احمد جائی کی سوگ زندگی' بھائی شعبان کھوسہ کی دیدۂ عبرت انکل محمد سلیم اختر کی شوبز لسں تھیں۔ مختصر مگر درد سے پُراثر تحاریر 'برزخ' شبانہ اکبر' شیشے پر لکیر خضریٰ بلند خان کی عبرت ناک کہانی تھی۔ جیسا کرو گے ویسا بھرنا پڑتا ہے۔ خدا بہتان سے ہمیں بچائے۔ وہ اک بھول صالحہ ناصر فضلو کی جور دارم ناز دکھی کرنے والی کہانی تھی۔ کیا یہی عزت ہے معاشرے میں عورت کی؟ اور میں مرگیا سدرہ انور علی کی کہانی پُراسرار باقی ابھی پڑھی نہیں امید کرتی ہوں بھی زبردست ہوں گی۔

☆: لیجیے شہزادی صاحبہ! دل خوش کر دیتا اے...... تمہاری آمد نے خوشی دی۔

✉: ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا' رجب والا، ملتان سے برتی نامے کے ساتھ موجود ہیں، لکھتے ہیں' ستمبر کی پہلی شام تھی، میں ریلوے اسٹیشن ملتان سے گھر کو آرہا تھا کہ میری نظر رسالے والے پر پڑی، اُسے اپنے پاس بلایا اور سچی کہانیاں مانگے...... سر جی کتنے،،،، آپ کے پاس جتنے ہیں دے دو، بدقسمتی سے اُس کے پاس چھ رسالے باقی پڑے تھے۔ ان کو لیتا گھر کی طرف لوٹا، کھانا کھانے کے بعد سچی کہانیاں تھا، میں، شام اور میرا کمرہ...... ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں کا سرورق بہت بیوٹی فل تھا، کیا کہنے، سرورق پر مصور نے خوب محنت کی تھی۔ اداریہ میں منزہ سہام نے کمال کر دیا، بچپن کے خواب یاد دلا دیئے، احوال میں کاشی بھائی کی کڑوی، کسیلی باتیں بہت اچھی لگیں، سچ کڑوا ہوتا ہے' منشی محمد عزیز، بازی لے گئے اور مجید احمد جائی ان کے پیچھے پیچھے تھے، ممتاز احمد، سدرہ انور علی، انعم شہزادی، ارم ناز، مسز نوید ہاشمی، مسز نگہت غفار، رانا عبدالرحمان، سید ملازم حسین، فیصل ندیم، ندیم عباس میواتی، نبیل

جاوید، شعبان کھوسہ، علی حسنین تابش، کے تبصرے پسند آئے، باقی بھی خوب انٹری کر رہے تھے، نئے آنے والوں کو دل سے خوش آمدید، پرانے بھی ہمارا اثاثہ ہیں، فریدہ جاوید فری صاحبہ آپ کی صحت کیسی ہے؟ تازہ نظم کاشی بھائی، بہت خوب، ویلڈن۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ممتاز احمد کی قصور میرا پڑھی، کمال لکھتے ہیں سوگ زندگی، مجید احمد جائی، میرے محسن ہر دل عزیز لکھاری، زبردست لکھتے ہیں۔ تحریر بہت پسند آئی، گواہ مقصود احمد بلوچ، اچھوتے موضوع کے ساتھ حاضر تھے، خوب، اپالو، شانی خامان، لاعلاج شبانہ اکبر، ذکا اور آنا، گرفت، اور میں مر گیا، دیدہ عبرت، شو...... بزنس، سیاہ نصیب، یقین محکم، ہاں وہ پاگل تھا، بہترین کہانیاں تھیں، باقی کہانیاں پڑھی نہیں، تبصرے سے معذرت، زہر عشق کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، ہم شکل، ایم اے راحت کا قلم خوب چلتا ہے، برطانیہ میں خزاں، محمود شام، سیر کرانا تو کوئی ان سے سیکھے۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، شاندار چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو ترقی کی تمام منزلیں عبور کروائے آمین ثم آمین۔

☆: اچھے ڈاکٹر صاحب! آپ کا تبصرہ کرنا ہمارے مان میں اضافے کا سبب ہوتا ہے۔ اتنی مصروفیات میں سے وقت نکالنا خود ایک کارنامہ ہے۔

☆: ہمارے عزیز ترین لکھاری ساتھی ممتاز احمد سرگودھا سے اپنے محبت نامے کے ساتھ حاضر ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں آپ کی طرف سے وصول ہوا، سرورق بہت پسند آیا، بہت خوب۔ اداریہ میں منزہ سہام صاحبہ خوابوں کے سنگیت چھیڑے ہوئی تھیں، اللہ کرے ان کے یہ خواب پورے ہو جائیں اور وطن پاک کا امن پھر سے لوٹ آئے، آمین ثم آمین۔ احوال میں میرے پیارے کاشی بھائی، خوب پیاری شیریں باتیں فرما رہے تھے، کاش! بے عقلوں کو عقل آ جائے، منشی محمد عزیز بھائی، صدارت مبارک ہو، اور اچھے لوگوں کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی ہے، آپ جیسے دوست کا اس دور میں مل جانا قدرت کی مہربانیوں میں سے ہے، آپ ذرا ادھر اُدھر ہوں تو دل بے قرار سا ہو جاتا ہے، ہمیشہ آپ کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ میرے پیارے مخلص، دوست مجید احمد جائی، بہت شکریہ، یہ آپ کی محبتیں ہیں، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کہانی کی پسندیدگی کا بہت شکریہ، پیاری فرح انیس صاحبہ، آپ کی پُر خلوص الفاظ میرا سیروں خون بڑھا دیتے ہیں، میری تحریر آپ کو پسند آئی، میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں، سلامت رہو، پیارے اشفاق شاہین، آپ کی محبتیں بے مثال ہیں، بہت شکریہ، میرے پیارے نبیل جاوید بھائی، جو اچھے ہوتے ہیں ان کو سبھی اچھے لگتے ہیں تیمور عباس، کاشف عبید بہت شکریہ، مسز نگہت غفار، آپ کا احوال میں تبصرہ نہیں تھا، سب اپنی ہی باتیں کرتی نظر آئی ہیں، ایسا کیوں جی، سچی کہانیاں پہ تبصرہ بھی کر لیا کریں، نزاہت افشاں، پیارے علی حسنین تابش، شعبان کھوسہ، شاہانہ احمد، آپ نے یاد رکھا، بہت مہربانی، پیارے فیصل ندیم بھٹی، بہت شکریہ، بہت مہربانی، پیاری آپا، رضوانہ کوثر صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت یابی عطا فرمائے، جگ جگ جیو، نئے احوالیوں کو ویلکم، خوش آمدید، جی آیاں نوں، ست بسم اللہ، پرانے لکھاری کہاں ہیں، سامنے آیئے، کہانیوں میں بات کروں گا ''گواہ'' بھلا سسرال والے اپنی بیٹی کو گھر میں بیٹھا کر پیسوں کی ڈیمانڈ کیوں کر رہے تھے، ایسی ڈیمانڈ تو شادی سے پہلے کی جاتی ہے، بعد میں نہیں۔ اپالو میں اچھا پیغام دیا گیا ہے، اس ماہ کی بہترین کہانی جو مجھے لگی وہ ہے۔ مجید احمد جائی ''سوگ زندگی'' بہت خوب، مبارکاں، شو، بزنس، سیاہ نصیب، بڑی اماں، جیون ہار دیا، خوددار تھے وہ، یقین محکم، عدوات،

ایالو، ہاں وہ پاگل تھا، برزخ، لاعلاج، دیدہ عبرت، گرفت، ٹکا اور آنا، مجبور وفا، اب کہاں بھاگو گے، ستارہ ڈوب گیا، زبردست کہانیاں تھیں، برطانیہ میں خزاں، ہم شکل خوب چل رہی ہیں۔ زہر عشق نے تو کمال کر رکھا ہے' ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں میری تحاریر لگانے کا شکریہ' اس کے ساتھ ہی مجھے اجازت، اللہ حافظ!

☆: پیارے بھیا! یہ بھلا آپ کو کیا کیا ہوا؟ زمانے کی روش یہ کیوں چلنے لگے۔ آپ کے نامے میں پہلی بار کچھ باتیں ایسی تھیں کہ لگا آپ ہمارے ممتاز نہیں...... جن کی باتیں ہی خود کو ممتاز کرتی ہیں۔ سلامت رہیے۔

✉: راشد لطیف، صبرے والا، ملتان سے کچھ اس طرح عرض کرتے ہیں ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں کا چوک شہباز ملتان سے خریدا۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ یہ سچی کہانیاں کا خاصہ رہا ہے کہ عمدہ سرورق پیش کرتا ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ خواب اچھا لگا۔ احوال میں کاشی بھائی میٹھی میٹھی باتیں کرتے نظر آئے، منشی عزیز مئے 'مجید احمد جائی' پیارے ممتاز احمد سرگودھا، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، اشفاق شاہین، عیل جاوید، سید ملازم حسین، رانا عبدالرحمٰن، مسز نوید ہاشمی، مسز نگہت غفار، پیاری بہن، صائمہ مجید، بہن سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور، ارم ناز، ندیم عباس میوانی، شعبان کھوسہ، انعم شہزادی، انیس الرحمٰن، کے شاندار تبصرے تھے، میری طرح نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید، پیارے شاہد رفیق سہو، گلے شکوے کیوں کرتے رہتے ہو' مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے کہ اپنے عیبوں پر پردہ پوشی کر کے دوسروں کے عیب جوئی کرتا پھرے، حق سچ کی راہ پر چلو، کاشی بھائی کے الفاظ لگتا ہے آپ کو سمجھ نہیں آتے، دوسروں کی راہوں میں کانٹے مت بچھاؤ، کہیں تمہارا دامن بھی کانٹوں سے نہ بھر جائے۔ احوال سارے کے سارے بہترین تھے۔ کہانیوں میں شو...... بزنس محمد سلیم اختر، سوگ زندگی، کمال کی کہانی تھی، ایک ایک لفظ موتیوں جیسا تھا، مجید احمد جائی کے لکھنے کا انداز بہت خوبصورت ہے، ان کا بہت بڑا فین ہوں' ممتاز احمد کی قصور میرا، سبق آموز کہانی تھی، فضلو کی جورو، ارم ناز نے معاشرے میں پھیلی برائیوں کا پردہ اٹھایا تھا، مختصر تحریر نے بہت سبق دیا۔ اس کے علاوہ پچیس کی پچیس کہانیاں زبردست تھیں، کس کی تعریف کروں، کس کو جھٹلاؤں،، سب کو مبارک، زہر عشق، شاندار رہی۔ لفظ تو ان کے غلام نظر آتے ہیں۔ برطانیہ میں خزاں، محمود شام، مزے کی سیر کروا رہے ہیں، ہم شکل ایم اے راحت، خوش قسمت ہوں، ان سے ملاقات ہو چکی ہے، شاید ایم اے راحت صاحب کو یاد نہ ہو، ہم تو فقیرانہ انداز میں ملے تھے (ارے......) ان کو روز راہوں میں کئی فقیر ملتے ہوں گے، اپنے ہاتھوں سے ان کو پانی پلانا یاد ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت یابی عطا فرمائے۔ آمین۔ مستقل سلسلے ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے زبردست جا رہے ہیں، اس بار سچی کہانیاں شاندار رہا۔

☆: پیارے راشد! یہ فقیر ہمیں شاہوں سے زیادہ عزیز ہوتا جا رہا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ احوال میں حاضری یقینی بناؤ۔

✉: ہمارے پیارے دوست مجید احمد جائی 'ملتان شریف سے اپنی تمام تر محبتوں کے ساتھ شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں اپنی تر رعنائیوں کے ساتھ جاتے اگست کی سرمئی شام کو ہماری دسترس میں آیا۔ دردوں کی سوغات دیتا اگست آخری سلام کہہ رہا تھا، دور افق سے سورج نم آنکھوں کے ساتھ الوداع ہو رہا تھا۔ آپ کی طرف اعزازی کاپی اس بات کی نوید تھی کہ بندہ ناچیز کی

کہانی شامل اشاعت ہے۔ بہت شکریہ، بہت مہربانی۔ٹائٹل بہت دیدہ زیب تھا۔''خواب''منزہ سہام۔۔شاید بچپن کے خوابوں کا تذکرہ فرما رہی تھیں۔اب تو خوابوں میں بھی ،لاشیں نظر آتی ہیں۔منزہ سہام صاحبہ جگ جگ جیو کاشی بھیا! آپ باتیں دل گھائل کرتی ہیں،اتنی پیاری باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں،، اللہ میری عمر بھی آپ کو لگا دے،اور بے عقلوں کو سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔منشی محمد عزیز مئے' پیارے عزیزم ممتاز احمد سرگودھا،ڈاکٹر خادم حسین،نبیل جاوید، پیاری بہنا سدرہ انور علی،ارم ناز،رانا حبیب الرحمٰن،ندیم عباس میوالی،پیارے سوہنے علی حسنین تابش، پیارے شعبان کھوسہ،شاہانہ احمد،فیصل ندیم بھٹی،راشد لطیف صبرے والا،آپ سب کا بہت شکریہ،بندہ ناچیز کو یاد رکھا۔ممتاز احمد،رانا حبیب الرحمٰن کی آمد شاندار رہی،باقی نئے آنے والے بازی لے گئے،پرانے لکھاری کہیں گم ہو گئے ہیں۔مور شاہد حسین،رانا شاہد،عبد الغفار عابد،صفدر اعوان،صفدر علی حیدری،مبارک علی شمسی،ملک عاشق حسین ساجد،فریدہ جاوید فری،اور وہ تمام جو غیر حاضر ہیں لوٹ آیئے۔ورنہ۔۔۔ورنہ......بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ نئے احوالیوں کو ویلکم ،خوش آمدید، جی آیاں نوں،تازہ نظم،،محبت خوب پیغام دے رہی تھی۔پیارے ایم اے راحت بھائی کو اللہ تعالیٰ صحت یابی عطا فرمائے اور رضوانہ پرنس کے کزن سید موسیٰ رضا نقوی کو کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے،ان کے درجات بلند فرمائے آمین ثم آمین۔کہانیوں میں سب سے پہلے زہر عشق پڑھی،کاشی بھیا! کیا ظلم کرتے ہیں، بیچارے سلمان کو تڑپا رہے ہیں،انسانوں میں آکر پھنس گیا ہے۔تڑپائی،،اپنے سحر میں جکڑتی سسپنس سے بھرپور تحریر،اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔مبارکاں! قصور میرا۔ممتاز احمد اور فضلو کی جورو،ارم ناز،حقیقت کی عکاس تحریریں تھیں، بہت خوب۔شو...... بزنس،محمد سلیم اختر، سیاہ نصیب،اُم منابل، بڑی اماں مسز نگہت غفار،جیون ہار دیا،حنا اصغر،اپالو،شانی خانان،گواہ مقصود احمد بلوچ، برزخ،شبانہ اکبر،شیشے پر لکیر،خضری بلند خان،ہر طرف اداسی ہے،محمد اسد علی بھٹی،وہ زات،ہاں وہ پاگل تھا،اور میں مر گیا......سدرہ انور علی خوب انٹری رہی۔ٹکا اور آنا،مجبور وفا،گرفت،اب کہاں بھاگو گے،یقین محکم۔خودار تھے وہ۔خوب رہی۔سوگ زندگی پر نو کنومنٹ۔ہم شکل خوب منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔برطانیہ میں خزاں،اور عداوت زبردست تحریریں تھیں۔سچی کہانیاں، کی سچ بیانیاں دل جیت گئیں۔مستقل سلسلے ہائیڈ پارک، تیر نیم کش شاندار رہے۔پورے کا پورا سچی کہانیاں کھنگال مارا،نہ کمپوزنگ کی غلطیاں ملیں، نہ کمزوری، ہر زاویہ سے پروفیکٹ ہی تو ہے،ورنہ دوسرے رسائل اُف توبہ! غلطیوں کے پلندے۔اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو نظر بد سے محفوظ رکھے (آمین)۔

☆: بہت پیارے مجید جانی! محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔کچھ الارم خدا نے دل میں بھی لگا رکھے ہوتے ہیں۔ہمارے لیے ہمارا ہر لکھاری اور قاری کو نور ہے مگر کچھ تیر نیم کش کی چمک اپنی تراش خراش کی وجہ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔جیسے کہ ''تم''......

☆: اب مجید کے پیچھے پیچھے ہی ہماری بھابی صاحبہ صائمہ مجید' ملتان سے احوال کا حصہ بننے کے لیے موجود ہیں۔ لکھتی ہیں ماہ ستمبر کا سچی کہانیاں یکم ستمبر کو ڈیرہ اڈہ ملتان سے خریدا۔ٹائٹل بہت خوبصورت لگا۔منزہ سہام کا اداریہ ''خواب'' بہت گہرا سبق دے گیا۔احوال میں کاشی بھیا، میٹھا میٹھا زہر رگوں میں اُتار رہے تھے،ہاں جی سچ زہر ہی تو لگتا ہے،یہ بھی سچ ہے،اس دور میں سچ کو

اکتوبر 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کرر ہا رکر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: ------------------------------------

مکمل پتا: ------------------------------------



اکتوبر 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ربھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: -------------- تعداد صفحات: --------------

نام: ------------------------------------

مکمل پتا: ------------------------------------

فون رسیل نمبر: ------------------------------------



اکتوبر 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا رکرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: -------------- مصنف: --------------

دوم، عنوان: -------------- مصنف: --------------

سوم، عنوان: -------------- مصنف: --------------

نام: -------------- شہر: --------------

کوئی ماننے کو تیار ہی نہیں، سب جھوٹ کے غلام ہیں ۔ بہت خوب بھیا۔منشی عزیز مے ہمارا استقبال کر رہے تھے، مجیدا احمد جائی، پیارے انکل ممتاز احمد، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، فرح انیس، یاسمین اقبال، واہ جی واہ، ہم بھی احوال میں شامل ہیں نبیل جاوید، سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، ارم ناز، مسز نگہت غفار اور پیاری عظمیٰ شکور شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، پیاری عظمیٰ شکور، دوستی کا ہاتھ تو ملا لیا، اب چھوڑنا نہیں۔تمام احوال بہت پیارے اور محبت بھرے تھے۔کہانیوں کی نگری میں سب سے پہلے سوگِ زندگی مجیداحمد جائی، پڑھی، کمال تحریر تھی، مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ ایک ماں اپنے دولہا بیٹے، اور بہو کو پہلی رات موت کے حوالے کر دیتی ہے۔ بہت خوب، شو، بزنس، محمد سلیم اختر، سیاہ نصیب، اُم مناہل، گواہ، مقصود احمد بلوچ، ہاں وہ پاگل تھا، حاسم وقاص، فضلو کی جورو، ارم ناز، نے کمال لکھا، ویری گڈ۔قصور میرا، ممتاز احمد صاحب نے حقیقت سے خوب پردہ اُٹھایا۔اور میں مر گیا، سدرہ انور علی، دیدہ عبرت، شعبان کھوسہ خوبصورت تحریریں تھیں، اس کے علاوہ بڑی اماں، مجبور وفا، اب کہاں بھاگو گے، نکا اور آنا، گرفت، عداوت، اک بھول، وہ رات، برزخ، لاعلاج، ایالو، پسند آئیں، ہم شکل سچی کہانیاں کی رونق کو چار چاند لگا رہی ہے، (اللہ تعالیٰ ایم اے راحت صاحب کو صحت یاب فرمائے) سچی کہانیاں کی جان...... زہر عشق، اپنے جادو کی تمام حدیں عبور کر رہی ہے۔اس کا زہر رگوں میں اُتر رہا ہے۔سلمان، صنوبر کی عشق میں پاگل ہورہا ہے اور یہ عشق کا زہر اُسے مار دے گا۔عشق نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ برطانیہ میں خزاں خوب جارہی ہے۔ہائیڈ پارک، تیرنیم کش شاندار چل رہے ہیں۔مسئلہ یہ ہے، بابا جی، دکھی انسانیت کی خدمت کر کے ثواب کما رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ سبھی کو سلامت اور سکھی رکھے آمین۔

☆: اچھی بھائی! خدا آپ کو بھی آپ کے من کی مرادیں عطا فرمائے (آمین) سدا سہاگن رہو۔

✉: گلابوں کی نگری پتوکی سے یہ آمد ہے ہمارے پیارے ساتھی ندیم عباس میوانی کی، لکھتے ہیں۔ستمبر کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ دو ستمبر کو میری جھولی میں آن گرا۔فٹافٹ احوال کی محفل کی طرف اپنی نظر کی سواری کو دوڑایا۔ جہاں پر کاشی بھائی اپنی محبت کے پھول نچھاور کرتے نظر آئے۔ سب سے پہلے میں اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ اللہ آپی صائمہ مجید کو خوبصورت و سیرت نرینہ اولاد نصیب فرمائے اور برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت اور آپی رضوانہ کوثر لاہور کو صحت دائما عطا فرمائے۔محترمہ ایڈیٹر دوشیزہ رضوانہ پرنس کے کزن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نئے آنے والے احوالیوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید بالخصوص محترمہ انعم شہزادی اینڈ انیس الرحمٰن پھران دوستوں کا میں انتہائی مشکور ہوں جو میرے تبصرے کو پسند کرتے ہیں اور اپنے تبصروں میں مجھے یاد رکھتے ہیں۔ بالخصوص محمد عثمان بلوچ' ابو ہریرہ بلوچ اینڈ انعم شہزادی' بڑی آپا مسز نوید ہاشمی' منشی محمد عزیز' بابا مجید جائی' تیمور عباس' شعبان کھوسہ' رانا حبیب الرحمان انیس الرحمان۔ کہانیوں کی طرف سے خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والا اپنے حصار میں قید کر دینے والا ناول 'زہر عشق' کامیابی سے منزل کی طرف گامزن ہے۔ بیسٹ آف لک کاشی بھیا۔دوسری سچ بیانی حجلۂ عروسی میں اپنے بیٹے اور بہو کو زہر کھلا کر اپنے حسد کی آگ بجھانے

والی سفاک ماں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ کیا ماں اتنی سفاک بھی ہو سکتی ہے؟ بابا مجید جائی جی ادتو بہ...... مائی کمانڈ و شعبان کھوسہ کی دیدہ عبرت نے بہت دکھی کیا۔ اُف چھوٹی سی بات کی اتنی بھیانک سزا' پہلا شعلہ ڈیئر سسٹر سدرہ انور علی اور میں مرگیا ہوں کے بیچاری کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ خط کی طوالت کے تحت باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ مسئلہ یہ ہے بہت عمدہ سلسلہ ہے۔ ہائیڈ پارک بہت مزے دار رہا۔ تیر نیم کش ویلڈن بھیا کاشی ویلڈن پورا شمارہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ زندگی باقی ملاقات باقی، سب دوستوں کو میری طرف سے عیدالاضحیٰ مبارک۔ رب راکھا۔

☆: ندیم پیارے! امتحان میں کامیابی کی مبارکباد قبول فرماؤ، تبصرے کا شکریہ۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

✉: چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے ہمارے سوہنے ساتھی فیصل ندیم بھٹی کی احوال میں آمد ہے لکھتے ہیں ماہِ ستمبر کا شمارہ میرے سامنے ہے سرورق پر لڑکی بکھری زلفوں کے ساتھ حیرانگی کے عالم میں نظر آرہی ہے۔ عیدالاضحیٰ کی آمد قریب ہے اور انتہائی خوش قسمت لوگ ہیں جو حج بیت اللہ کی سعادت سے سرشار ہو رہے ہوں گے۔ میری طرف سے تمام مسلمان جو حج کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اُن کو تہہ دل سے مبارک باد۔ مسز سہام مرزا کا اداریہ خواب پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کہ جو امن کا خواب دیکھا گیا ہے۔ اس کے بعد احوال میں کاشی بھیا کا سلام قبول کیا اس بار تو احوال میں چار خطوط شامل تھے جو کہ سچی کہانیاں کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ احوال میں کافی نئے چہرے دیکھنے کو ملے تمام نئے آنے والے کو سچی کہانیاں کی محفل میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں جن میں طیبہ مخدوم صاحبہ' سید ملازم' ڈاکٹر خادم کھڑا تیمور عباس' سفیان احمد' سیدہ کاظمی' پرویز سہو' سفیان اسلم' نزاہت افشاں بٹ جی میری تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ نبیل جاوید صاحب سنایئے کیسے ہیں؟ انیس الرحمٰن خوش آمدید اور BSC کے رزلٹ میں کامیابی کی دعا آپ کے نام۔ اب کہانیوں پر تبصرے کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ سلیم اختر کی شوبزنس' آموز کہانی ہے آجکل سوگ زندگی مجید جائی کی، سیاہ نصیب' خوددار تھے وہ بڑی اماں' جیون ہار دیا' یقین محکم زبردست کہانیاں ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ مجبور وفا، اور ستارہ ڈوب گیا۔ گرفت بھی کمال کہانیاں تھیں۔ ہم شکل ایم اے راحت ناول بہترین چل رہا ہے، اور میں مرگیا سدرہ انور علی سبق دیتی ہیں کہ برے کاموں کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے ویلڈن سدرہ کی دیدۂ عبرت' عامر امراور علی بشریٰ سعید کشمیری مجاہد کی لازوال داستان ہے اس کے بعد محمود شام صاحب نے برطانیہ کی بہت خوب سیر کرا کے لطف اندوز کیا۔ گھر بیٹھے مفت میں ہی برطانیہ گھوم آئے۔ عداوت' اپالو' گواہ' اچھی کہانیاں تھیں۔ ہاں وہ پاگل تھا، فضلو کی جورو ارم ناز کی کہانی آج کل کے دور میں ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ وہ اک بھول وہ رات' برزخ' شیشے پر لکیر' ہر طرف اُداسی ہے' لاعلاج بہترین کہانیاں ہیں پسند آئیں۔ ممتاز احمد صاحب کی کہانی قصور میرا شمارے کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ زہر عشق پہ اسرار عالیے کی بہترین کڑی اسرار یت کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ ویلڈن کاشی چوہان۔ مسئلہ یہ ہے میں خلق خدا کے مسائل حل ہوتے سُن کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

☆: بھائی فیصل! تفصیلی تبصرے کے لیے مشکور ہوں مگر یہ تو بتاؤ کہ آج کل کہاں غائب ہو؟

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہن ناز یہ بتول رضا کی، لکھتی ہیں کافی عرصے بعد حاضری لگوا رہی ہوں شاید مجھے سب بھول بیٹھے ہیں ہمارے ایڈیٹر صاحب بھی ہماری کہانی بھول جاتے ہیں' خیر ہم تو پھر سے ایک کہانی لے کر حاضر ہیں۔ اب دیکھیں اس بے چاری کا نمبر کب آتا ہے۔ ہم تو سچی کہانیوں کی جستجو میں رہتے ہیں جیسے ہی سنی لکھ ڈالی۔ اب چھاپنا نہ چھاپنا تو کاشی بھائی کے ہاتھ میں ہے ناں، مرضی ہے بھئی! (جلد ناراضگی دور ہو جائے گی) 'زہر عشق' اچھی جا رہی ہے باقی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔

☆: پیاری بہن! تبصرے کا شکریہ! کہانی کی شکایت تو ختم ہونے ہی والی تھی مگر...... وہ کہتے ہیں نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہی معاملہ ہوا۔

✉: ایبٹ آباد سے یہ آمد ہے ہماری لکھاری ساتھی اُم مناہل کی لکھتی ہیں اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سچی کہانیاں اپنی نوعیت کا وہ واحد رسالہ ہے جس میں معاشرتی' جیتی جاگتی زندہ جاوید اور وقت کی قید سے آزاد کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ عذرہ باجی کا خواب ضرور پورا ہوگا اور انشاء اللہ تعالیٰ کراچی کا امن دوبارہ لوٹے گا۔ شوبزنس' سوگِ زندگی' خوددار تھے وہ بہت یادگار تحریریں رہیں۔ یقین محکم رشتوں کے چہرے کو بے نقاب کرتی سبق آموز کہانی ہے۔ اور میں مر گیا' مکافات عمل کے گرد گھومتی ہوئی عبرتناک کہانی ہے۔ لاعلاج' شیشے پر لکیر' بڑی اماں زبردست کہانیاں ثابت ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی اللہ حافظ۔

☆: پیاری بہن! یقین مانیں جب ملک کے دور دراز علاقوں کے بہن بھائی اپنی محبتیں تبصروں میں سمو کر بھیجتے ہیں تو روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں۔

✉: صادق آباد سے ہمارے نئے دوست عارف شہزاد نے ہمیں بڑا کھڑا سا تبصرہ بھیجا ہے لکھتے ہیں کاشی چوہان امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے کاشی چوہان صاحب آپ میری اسٹوری کیوں نہیں لگا رہے ہے؟ کیا میری اسٹوری اشاعت کے قابل نہیں۔ میں نے دو اسٹوریاں پوسٹ کیں پر دونوں ہی آپ نے ریجیکٹ کر دی ہیں۔ آپ تھک جاؤ گے میری اسٹوریاں ریجیکٹ کر کر کے، کیونکہ میرے حوصلے کافی بلند ہو چکے ہیں (ارے باپ رے باپ) اس بار ایک اور اسٹوری آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم پہ بھی کرم نوازی کر دیں۔ اگر میری کوئی بات ناگوار گزری ہو تو آئی ایم ریلی سوری۔

☆: پیارے عارف! تمہاری اسٹوری؟ آئے تو لگاؤں نا۔ امید ہے سمجھ گئے ہو گے۔

✉: بہاول نگر سے ہمارے بہت پیارے نئے ساتھی لکھاری ابوہریرہ بلوچ شریک احوال ہیں لکھتے ہیں ستمبر کا شمارہ پوری چمک دمک کے ساتھ دو ستمبر کو طاہر نیوز ایجنسی سے میری دسترس میں آیا۔ فرصت کے لمحات ملتے ہی احوال کی پُرمسرت محفل میں حاضری دی۔ تمام دوست واحباب کے بھرپور تبصروں نے آنکھوں کو زینت بخشی۔ احوال میں منشی محمد عزیز مئے' محمد عثمان بلوچ' محمد ندیم عباس میوانی' رانا حبیب الرحمان' فیصل ندیم بھٹی' مسز نوید ہاشمی اور انعم شہزادی کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید کہتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں ہر ماہ ہمیں اپنے ہنس مکھ تبصرے سے لطف اندوز کرواتی رہیں گی۔ ستمبر کے شمارے کی کہانی ہمارے فیورٹ رائٹر اینڈ محترم ایڈیٹر کاشی چوہان کی خوف و ہراس پھیلاتی ہوئی منزل کی جانب

رواں دواں ہے، اور میں مرگیا' دیدۂ عبرت' شو بزنس بہت اعلیٰ پائے کی کہانیاں ثابت ہوئیں۔ مجید احمد جائی' ابھی تک ورطۂ حیرت میں ہوں کہ کیا سگی ماں بھی اپنے کڑیل جوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ابدی نیند سلا سکتی ہے؟ سیاہ نصیب' بڑی اماں' ستارہ ڈوب گیا' عداوت' فضلو کی جورو' قصور میرا' ہم شکل ایم اے راحت کا ناول زبردست جا رہا ہے۔

☆: پیارے ہریرہ! تبصرہ بہت لیٹ ملا۔ پلیز کوشش کیا کرو آٹھ تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائے۔

✉: بہاول نگر ہی سے یہ آمد ہے ابوذر غفاری بلوچ کی' ابوذر کی احوال میں یہ پہلی آمد ہے لکھتے ہیں اس وقت عالم گیر دنیا میں مختلف اصناف کے جرائد جاری و ساری ہیں جن میں سے اچھے اور معیاری رسالے کا انتخاب یقیناً محنت شاقہ ہے لیکن میں مشکور ہوں مائی برادر محمد ابوہریرہ بلوچ اینڈ محمد ندیم عباس میواتی کا جنہوں نے میری مشکل حل فرمائی اور سچی کہانیاں جیسے معیاری ڈائجسٹ سے متعارف کروایا اور مجھے احوال کے میدان میں انٹری کا کہا لیکن میں نے اس مقام سے معافی چاہی جہاں عقل کی گہرائی جانچی جاتی ہے اور فضیلت میں آدمی کی قیمت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ صاحب تصانیف اپنے آپ کو حسد اور تنقید کے لیے پیش کر دیتا ہے اگر وہ اچھا لکھتا ہے تو حسد کا نشانہ اور برا لکھے تو تنقید کا...... لیکن برادر اکبر کے اشارے پر جن کا اشارہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور ان کی اطاعت اور فرمانبرداری میرے لیے غنیمت ہے اس بات کی طرف کہ میں اس پُر رونق محفل میں کچھ لکھوں اور اس میں انہی کے اسلوب کو مدنظر رکھوں اسی وجہ سے قلم طرازی کر رہا ہوں اور آپ کی محفل میں حاضر کر رہا ہوں اب چونکہ خط کی طوالت مجھے اختصار کا دامن تھامنے پر مجبور کر رہی ہے پس موت کی دستک میرے دروازے سے موخر رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ رسالے پر جامع تبصرہ دوں گا۔ امید رکھتا ہوں قینچی کے بے رحم جبڑوں سے امن میں رکھا جاؤں گا۔ سب قارئین کو سلام اینڈ ایڈوانس عیدالاضحیٰ مبارک۔

☆: ارے ارے! بھیا! ان جرائد کو پڑھنے والے ہمارے قاری اتنا ادب ہضم نہ کر پائیں گے۔ دیکھا آپ کو خوش آمدید کہنا بھی ہم بھول گئے۔ خوش آمدید اور اردو پہ ہلکا ہاتھ رکھنا کہ اب دفتری زبان کے عہدے پر بھی فائز ہو چکی ہے۔

✉: یہ آمد ہے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور صاحبہ کی اسلام آباد سے' لکھتی ہیں کیسے ہیں جی؟ اُف اِس قدر غصے میں' تو کیا کرتی طبیعت جو ٹھیک نہیں تھی کیسے لکھ پاتی تبصرہ' اچھا پلیز اب موڈ ٹھیک کریں۔ لکھ دیا نا تبصرہ چاہیے لیٹ ہی سہی۔ اور سُن لو سب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مجھے خوش رکھیں۔ بس آرام سے میری کہانیاں وغیرہ شائع کرتے رہیں تاکہ میں خوش رہوں۔ یہ ہوئی نا بات۔ مسکرانے کے لیے تھینکس ...... لو جی چلیں رسالے کی طرف۔ اُف اُف منزہ سہام آپ کے خواب ضرور پورے ہوں گے۔ احوال میں قدم رکھتے جیسے خوشبو کا جھونکا سانسوں میں اُتر گیا ہو۔ اپنوں کی محبت ایسے ہی احساس بن کر چھا جایا کرتی ہے۔ حقیقت میں ایڈیٹر صاحب آپ واقعی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہو۔ شکر کریں اگست میں اپنی تعریفیں پڑھ کر اُڑ کر چاند پر نہ پہنچ گئی۔ سچ یو آر گریٹ کاشی چوہان' بس ذرا کبھی ڈانٹ وانٹ دیتے ہو وہ الگ بات ہے۔ کہانیوں کے دیس میں چلتے ہیں جہاں ہمارے قلم

کارنت نئی کہانیاں لیے محو انتظار ہیں کہ چند لفظ قدر کے پائیں۔ میرے ذہین ترین لکھنے والوں لو میں آ گئی۔ آپ کی کہانیوں کو پھولوں کے ہار پہنانے۔ محمد سلیم اختر' شو بزنس' بہت خوب لکھا سچ کو لفظ دیے۔ ایک برائی کو جو چھپی ہے بے نقاب کیا۔ لڑکی بچالی سو کھینکس۔ سوگ زندگی ایسا بھی ہوتا ہے روح کانپ گئی۔ جیون ہار دیا حنا کمال کرتی ہیں آپ مطلب اتنی زبردست اسٹوری لکھ ڈالی۔ مجبورِ وفا' قسم سے آپ نے اتنی محنت کی کہانی لکھی چار لفظ لکھ دیئے ہونے کہ ماموں کے لیے دعا کریں کہ اُن کو سکون ملے۔ مطلب میں ڈھونڈتی رہ گئی کہ جانے اب مامی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر وہ تو دوسری شادی کر کے مزے میں ہیں۔ اور ستارہ ڈوب گیا...... توڑ ہی دیا دل آپ نے اُف وہ کیوں مر گیا۔ دیدہ عبرت اُف کانپ کانپ ہی تو گئی میں اسٹوری پڑھ کر۔ موبائل اتنا بڑا عذاب ہے کہ سب تباہ کر گیا۔ اب گھور کیوں رہے ہیں بس بند کر رہی ہوں تبصرہ۔

☆: اچھی عظمیٰ! یقین کرو تم ہنستی مسکراتی اچھی لگتی ہو۔ حکم ماننے کا تہہ دل سے شکریہ۔

✉: ناظمہ اشتیاق کوٹلی عظیم خان' گاؤں چمن' مظفر آباد سے پہلی بار احوال میں شریک ہو رہی ہیں لکھتی ہیں' میرا تعلق مظفر آباد کے ایک گاؤں چمن کوٹلی عظیم خان سے ہے۔ سچی کہانیاں پڑھتے بہت عرصہ ہو گیا لیکن کبھی احوال میں شرکت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی یہ سوچ کر کہ کہیں میرا خط بے دردردی کی ٹوکری کے حوالے نہ کر دیا جائے لیکن آج ہمت جمع کر کے لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر میرا خط احوال میں شامل کیا تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور آئندہ بھی خط لکھتی رہوں گی۔ اب آتی ہوں ماہ اگست کے شمارے کی طرف خوبصورت ٹائٹل منزہ سہام کی خوبصورت گفتگو اس کے بعد کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا تو ایک سے بڑھ کر ایک سنسنی خیز کہانی سامنے تھی۔ میرا بیٹا میرا ارمان' برگد والا درخت' موت کا کنواں' ہم شکل بہت زبردست جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اس کے علاوہ بچیسویں قربانی اور کاشی چوہان کا زہر عشق بہت ہی پسند آیا۔ زندگی رہی اور آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆: لیجیے ناظمہ! آپ کا خط ہم نے شاملِ احوال کیا۔ اب خوش ہو جاؤ اور فٹافٹ اگلے تبصرے کی تیاری کرلو۔

✉: یہ آمد ہے لک موڑ سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے بھائی نبیل جاوید کی لکھتے ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ 31 اگست کو موصول ہوا۔ اشتہارات کی ایک لمبی لائن کو عبور کرتے ہوئے آنٹی منزہ سہام کے خواب تک پہنچ گئے۔ ہمیشہ کی طرح دل سے پڑھا۔ آگے بڑھے تو کاشی بھائی کی خوبصورت باتوں اور لاجواب خطوط پر تبصرے مزہ دے گئے۔ تمام دوستوں کے خطوط ہی بڑے مزے کے تھے۔ اللہ تعالیٰ تمام دوستوں کو ہنستا مسکراتا رکھے آمین۔ اللہ تعالیٰ ایم اے راحت صاحب کو صحت بھری لمبی زندگی عطا کرے آمین اس دفعہ تمام کہانیاں ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سلسلے وار کہانیاں بھی خوب اچھی جا رہی ہیں۔ باقی کہانیوں میں عداوت' قصور میرا' اور میں مر گیا' یقین محکم' سوگِ زندگی' مجبورِ وفا' سیاہ نصیب' ستارہ ڈوب گیا' دیدۂ عبرت' فضلو کی جورو کافی متاثر کن اسٹوریاں تھیں۔ اس کے علاوہ گرفت' اب کہاں بھاگو گے' نکا اور آنا سمیت باقی تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ قرآنی آیات پر مبنی سلسلہ مسئلہ

شوبزنس

پیارے قارئین!

جہاں سچی کہانیاں اپنے پڑھنے والوں میں اپنی کہانیوں کے باعث معتبر ہے وہیں ہمارے قارئین اپنے فلم، ٹی وی اور اسٹیج کے اسٹارز اور ماڈلز کے بارے میں بھی جاننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ساتھیو! اگلے ماہ سے شوبز کی مشہور شخصیات کے انٹرویوز کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اُمید ہے قارئین، اس ہنگامہ خیز سلسلے کو اپنی پسندیدگی کی سند بخشیں گے۔

یہ ہے کافی اچھا سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ اس بار تیر نیم کش میں تمام دوستوں کے بھیجے ہوئے اشعار پسند آئے۔ اس بار ہائیڈ پارک بھی خوب پسند آیا۔ کاشی بھائی ہر سلسلے میں آپ کی محنت اور محبت چھلک رہی تھی۔ کاشی بھائی اب اجازت اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ تمام دوستوں کو عید الاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔

☆: پیارے نبیل! جیتے رہو! ہم تم سے کیوں ناراض ہونے لگے۔ تم لوگ خوش ہوتے ہو تو ہمارا سیروں خون خود بڑھ جاتا ہے۔

✉: لیجیے جناب یہ پہلی بار آمد ہے علی پور سے محمد جاوید کی لکھتے ہیں ماہِ دفاع یعنی ستمبر کے مہینے کا شمارہ پانچ تاریخ کو ہماری آنکھوں کی پہلی بار زینت بنا۔ سرورق قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ منزہ سہام کراچی میں سے لفظ امن کا الف نوچ لیا ہے۔ اب کراچی ...... کراچی سے کرچی کرچی ہو کر رہ گیا ہے۔ لندن سے محمد عزیز مئے منصب صدارت پر بیٹھے لڈیاں ڈال رہے تھے فرح انیس ارم اگر سچی کہانیاں رکھ کر دونوں کان پکڑتی تو سچی کہانیاں کو گھر کا کوئی اور فرد لے اڑتا اور یہ اُن کو بھلا کب گوارہ تھا۔ رانا حبیب کے خیالات جذباتی باتوں پر مشتمل تھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ موصوف کہانی لکھنے کے فن سے بھی آشنا ہیں۔ طیبہ مخدوم ادارہ کو بھیجی جانے والی کہانی کی ایک کاپی اپنے پاس بھی محفوظ رکھا کریں۔ عظمیٰ شکور کا ڈرنامہ اور انعم شہزادی کا محبت نامہ ستمبر کے شمارے کی زینت ہے بزم احوال میں شرکت کے لیے ٹوکن کی شرط کے باوجود محبت ناموں کی فراوانی سچی کہانیاں کی مقبولیت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ محفل احوال میں تمام احوالیوں کے حال پڑھے تو محسوس ہوا تمام دوست چینی پھانکنے کے ہی شوقین ہیں۔ ہمیں محمد سلیم اختر کی کہانی پسند آئی بارش مصنف مجید احمد جائی نے سوگ زندگی میں سحر انگیز ادبی جملوں کے زیور سے آراستہ سچ بیانی تحریر کی۔ سیاہ نصیب، خوددار تھے وہ، بڑی اماں، جیون ہار دیا، یقین محکم، مجبور وفا، لگا اور آنا، بہتر کہانیاں لگیں۔ ارم ناز نے فضلو کی جورو جیسے سنجیدہ موضوع میں بذریعہ قلم سے کمال کر دیا ہے۔ عظمیٰ شکور کی شوخ غزل انعم شہزادی کی بیش قیمت باتیں عاکف عثمان کی نعمت مبارک اور متعدد اشعار دل کو بھائے۔ ممتاز احمد کے سچ کا مطالبہ کیا تو راحیلہ اور خرم کو یکساں قصوروار جانا، مقصود احمد بلوچ کی گواہ اچھی کاوش تھی۔ شانی خاان کے سچ اپالو میں مریم کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والا احمد قہرِ خداوندی کا شکار ہوا۔

☆: اچھے بھائی محمد جاوید! خوش آمدید۔ اب احوال میں ہر ماہ آپ کا انتظار رہے گا۔

✉: مومنہ بتول کراچی سے احوالی بن رہی ہیں لکھتی ہیں بہت ہی معذرت کے ساتھ اپنی غیر

حاضری کی معافی طلب کرتی ہوں۔ وجہ مصروفیت بھی عرض کرتی ہوں اس امید پر کہ آپ اپنی محبت بھری ذولرت کے ہاتھوں مجھے ہاتھوں ہاتھ قبول کریں گے۔ برادر عزیز میں عرصہ تقریباً چھ ماہ سے بہت مصروف رہی وجہ اپنی اکلوتی صاحب زادی کی شادی ٹھہری۔ اُن کا نکاح تو میں نے گزرے برس نومبر کے اینڈ میں کر دیا تھا اچانک داماد کے 'یو کے' کے آنے پر شادی ارینج کرنی پڑی سو بہت بھاگ دوڑ مچی کیونکہ تمام تیاری کرنے والی ہم دو ماں بیٹیاں ہی تھے۔ شکر ہے اُس ربِ عظیم کا جس نے یہ فرض بہت احسن طریقے سے ادا کروایا۔ اور چار چاند اُس وقت لگے جب میرا بڑا بیٹا بہن کی شادی اٹینڈ کرنے اچانک مایوں والے روز کراچی پہنچا۔ ہم میاں بیوی اور بہن بھائی جیسے جی اٹھے بہت اچھے سبھاؤ سے بہت احسن انداز میں میں اور میری فیملی اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے اور میں بھی لکھنے لکھانے پڑھنے سے دور رہی بس آج پہلی تنہائی میں تمہیں یاد کیا ہے اب ذرا تھکان اُتار کر پھر سے قلم ہاتھ میں لوں گی۔ ماہ ستمبر کا شمارہ ابھی منگوایا ہے صرف تمہیں پڑھ کر خط لکھنے بیٹھی ہوں۔

☆☆: اچھی بہن! اس فرض سے سبکدوش ہونے پر ہماری طرف سے مبارکباد اور ہاں اب احوال میں غیر حاضر نہ ہوئیے گا کہ تنہائی میں میلہ لگانا ہو تو ہمارا پرچہ اٹھا لیجیے۔

☆☆: نیو سید آباد ہالا سے یہ پہلی بار مختصر آمد ہے حمید علی کی لکھتے ہیں نئی کہانیاں کا تازہ شمارہ پڑھ کر احساس ہو رہا ہے جیسے ہم سب پاکستانیوں کو نئی کہانیاں نے ایک زنجیر میں باندھ دیا ہے۔ سچ پوچھیں تو ایسا شمارہ جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو اتنا پیار دیتا ہے شاید کوئی اور نہ ہو۔ ناول ہم شکل اور زہر عشق ہم بہت شوق سے پڑھتے ہیں اس کے علاوہ تین مرد تین کہانیاں' شعلہ ساماں تحریریں' سچ بیانیاں' اور حکایتیں بھی زبردست ہوتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے' تیر نیم کش اور ہائیڈ پارک بھی اچھے سلسلے ہیں۔ اب اجازت۔ اگلے ماہ حاضر ہوں گے۔

☆☆: پیارے بھیا حمید! خوش آمدید! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اب احوال میں آ گئے ہو تو دور نہ جانا۔ یہ تمہارا اپنا پرچہ ہے بھائی۔ پاکستان کا پرچہ ہے اس لیے وطن کے سارے رنگ اس میں موجود ہیں۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری، آپ کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی ہماری جانب سے تمام اہل وطن اور تمام مسلمان بہن بھائیوں کو عید الاضحٰی کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ محفل کے اختتام پر گڈی آپا کی نذر ایک نظم۔

'الوداع'

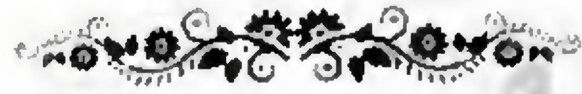
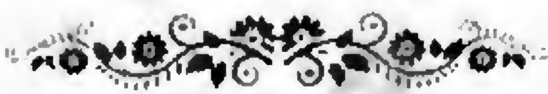
تم نے جاتے سے
ہم کو دیکھا نہیں
اک ذرا سی نگاہ
ہم پہ ڈالی نہیں
سانس خاموش کی
الوداع ......بس کہا
اور سو بھی گئے

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

Life Bouy.. حقیقی خوشیاں لائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''ہیلو گرلز!'' سیف نے آتے ہی کلاس میں موجود تمام لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

''ہائے ہینڈ سم!'' مشترکہ آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو سویٹ گرلز! میڈم آفندی کا پیریڈ اسٹارٹ ہونے والا ہے۔ آپ سب کی آج کے ٹاپک کی تیاری Complete ہے نا۔''

''آف کورس!'' لڑکیوں کا غول چہکا تھا۔

''اور ہاں...... آج تو ان سے لازمی لمبے بالوں کا راز بھی معلوم کرنا ہے۔'' یہ رمیحہ تھی۔ اس گروپ کی سب سے بولڈ اور زندہ دل لڑکی۔

''بھئی یہ کام ہم نہیں بلکہ تم خود ہی انجام دینا۔'' پری نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''واٹ آ ڈیشنگ پرسنالٹی یار! کیا کومل، ملائم، چمکدار، جادو کرتے بال ہیں۔ اُف! کاش میرے بھی ایسے خوبصورت بال ہوتے نا تو......''

''تو کیا...... تم پھر بھی اتنی ہی بے وقوف دکھائی دیتیں جیسی اب دکھتی ہو۔'' سیف کے بے ساختہ کہنے پر شاہانہ بری طرح خجل ہوگئی۔

''تم سب لوگ مجھے دوست کہتے ہو مگر مجھے دوست سمجھتا کوئی نہیں۔ ہر وقت میری Insult کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ ہی لیتے ہو۔'' شاہانہ ان کے پاس سے اٹھ کر الگ تھلگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

کچھ ہی دیر میں میڈم آفندی کا پیریڈ اسٹارٹ ہوگیا۔

لیکچر کے بعد جیسے ہی میڈم آفندی کلاس سے نکلنے لگیں شاہانہ ان کے مقابل آ گئی۔

''جی شاہانہ وسیم! کوئی پرابلم ہے۔'' شگفتہ لہجے میں کہا گیا۔

''وہ میم!...... میں بہت دنوں سے ایک بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ مگر چونکہ میں ہمت نہیں کر پا رہی تھی اس لیے۔''

شاہانہ نے جیسے آج دل کی بات ان سے کرنے کی ہمت کر ہی لی تھی۔

''اوہ کم آن! بولو آپ۔'' وہ مسکرائیں۔
''آپ ایسا کریں اسٹاف روم میں آجائیں۔''
''اوکے میم! تھینکس۔''
کچھ ہی دیر میں شاہانہ..... میڈم آفندی کے سامنے تھی۔
''جی بولیے شاہانہ وسیم کیا بات تھی۔''
''وہ میم.....'' شاہانہ ہچکچانے لگی۔
''یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکی بھلا اتنی Shy کیسے ہوسکتی ہے۔''
''میم! آپ کو تو خدا نے بہت خوبصورت بنایا ہے۔ خاص طور پر آپ کے بال۔ واؤ میم!''
شاہانہ کی ان باتوں کو سن کر آفندی کو اس کے بحال ہوتے کونفیڈنس کی بہت خوشی ہوئی تھی۔
''کم ٹو دا پوائنٹ شاہانہ وسیم!'' میڈم آفندی کی سمجھ میں اس کی اتنی تمہید ہی نہ آرہی تھی۔
''وہ میم..... بچپن سے میرے بالوں کے ساتھ مسئلہ ہے۔ میں نے بہت ساری جگہوں پر دکھایا کہ شاید کوئی Solution مل جائے مگر.....''
''تو اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں شاہانہ؟''
''مس..... آپ مجھے بالوں کے حوالے سے کوئی Solution تو دے سکتی ہیں؟''
''شاہانہ وسیم! یہ سب کچھ GODGifted ہے۔ میں دعا کروں گی کہ خدا آپ کو آپ کے مسائل سے نجات دلائے۔''
شاہانہ مایوس ہوکر آفس سے نکلی تھی۔

☆.....☆.....☆

''محبت کبھی نہیں کرنی چاہیے۔'' شہنیلا نے بیگ پٹخا اور آنکھیں بند کر کے کہا۔
''خیریت..... یہ صبح صبح کس دلن کا منہ دیکھ کر آئی ہیں میڈم آپ۔'' شازیہ نے اپنی فرینڈ کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھے تو بولی۔
''سچ کہہ رہی ہوں۔'' شہنیلا جذب سے بولی تھی۔
''اے بے مہر لڑکی! اب تو کر چکی ہو نا محبت..... پھر کیا ہے؟''
''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ نہیں کرنا چاہیے۔'' شہنیلا نے اپنے خوبصورت بال اِک ادا سے جھٹکتے ہوئے بولا۔
''کاش نہ کی ہوتی! لیکن شازو! یہ کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے نا جو سوچ کر کی جائے، یہ تو خودرو پودے کی طرح آپ ہی پھوٹ پڑتی ہے۔ بس ہوگئی اور.....''
''اور کیا.....'' شازیہ اُس سے راز اگلوانا چاہ رہی تھی۔
''اور..... ہمیں برباد کرگئی۔
''خدا نہ کرے تم برباد ہو۔'' پگلی محبت برباد نہیں آباد کرتی ہے۔''

محبت اِک حسیں پرواز ہوتی ہے
محبت اِک ان کہا راز ہوتی ہے
محبت گیلی لکڑی ہے
سلگتی آنچ پہ لپٹی
ابھی جنگل سے کاٹی ہے
جلائی گیلی جاتی ہے
کسی برسات کے جیسی
محبت سبز جنگل ہے
محبت رقصِ بسمل ہے
محبت اِک پہیلی ہے
محبت راز جیسی ہے
محبت ساز جیسی ہے
محبت سا دھوؤں سی ہے
محبت باندھ دیتی ہے

شہنیلا نے محبت پر پورا انسائیکلو پیڈیا اپنی نظم کی صورت بیان کر کے رکھ دیا تھا۔ شازیہ اس کی منطق سے قطعی لاعلم رہی۔

''پلیز جان! مجھے اصل بات بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔ ایک تو تم نے اُسے سات پردوں میں رکھا ہوا ہے چھپا کر۔

پلیز یار بتاؤ اس کے بارے میں۔ کوئی اتا پتا دو اس کا۔ پھر دیکھنا میں کیسے اس کے کل پرزوں کی مرمت کرتی ہوں۔''

شہنیلا، شازیہ کی جذباتیت دیکھ کر اسے مزید تپانے کو بولی۔

''ارے بس ڈیئر! تم نے کر دیے اس کے کل پرزے اور میں نے دیکھ بھی لیے۔

بس کرو اور جا کے گلوکوز پی لو۔ تھوڑی اور توانائی آ جائے گی۔''

''ایک بار آ لینے دو اُس بے وفا کو پھر دیکھو میں کیا حشر کرتی ہوں اس کا۔

بے وفائی کا سارا نشہ ہرن کرا دوں گی۔ تمہارے نام کا کلمہ نہ پڑھوا دوں تو شازیہ نام نہیں۔''

''ارے شازو! وہ بے وفا نہیں۔ بس مجبور ہے۔''

''مجبور ہے وہ!! کون سی مجبوری ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے۔''

''ارے'' میں تو تم سے بات کر کے پچھتائی۔ ارے تم سے بات کرنا تو ایسے ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ نہیں بتاتی کچھ بھی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

ہو اجازت اگر چلے آؤں
شام کی چائے آپ سے پینے

خلافِ معمول شعر موبائل اسکرین پر چمک رہا تھا۔ اس نے فوراً Rply کیا۔

آپ آنا ہی اگر چاہتے ہیں
پہلے ابا کے بال لے آئیں

''آئیں...... یہ کیا؟''

اسفند سوچنے لگا یہ کیا جواب ہے۔ انکل تو ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بال بھی سر پر ہیں مگر...... وہ مسکرایا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھر میں موجود تھا۔

شہنیلا سراپا ہنگامہ تھی۔ شوخ و شریر مگر معصوم بھی، پل میں دل موہ لینے والی۔ بقول شہنیلا میں تو ایک سبک رفتار ندی ہوں۔

تسلسل سے بہتی ہوئی، مگر میرے خیال میں وہ ایک جھرنا تھی۔ پتھروں کا سینہ چیر کر آگے بڑھتا جھرنا......

شہنیلا اب اُس کے پاس چائے لے آئی تھی۔

جائیے بال پہلے لے آئیں
پھر مجھے چائے پیش کر دیجیے

''ارے واہ...... ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں۔''

''میں بلی نہیں شیر ہوں۔'' ایک دھاڑ کے ساتھ اسفند نے اُسے ڈرایا۔

''جی اور میں...... میں شیر کی خالہ ہوں۔''

''ارے لڑکی...... کیوں ظلم کرتی ہو۔ یہ میرے اور اپنے بیچ ظالم رشتے نہ لاؤ۔ بتاؤ کیا ہوا۔ ابا کے بال کہاں سے لاؤں۔'' اسفند مسکرایا۔

''اسفند میں بہت پریشان ہوں۔''

''یار تم مجھے کنفیوز کر رہی ہو۔ ابا کے بال...... اپنی پریشانی کی وجہ بتاؤ۔''

''اسفند..... پچھلے ماہ سے میرے سر کے بال اس تیزی سے گر رہے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ میں دو تین ماہ میں ہی گنجی ہو جاؤں گی۔'' وہ نہایت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''یار! مجھے تو ٹھیک ہی دکھائی دے رہے ہیں تمہارے بال۔''

''اوہو! بھئی کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے ابا کے بال آج بھی سیاہ اور مضبوط ہیں۔

میرا اشارہ ان کے بالوں کی ہی طرف تھا۔'' شہیلا نے کھل کر مدعا بیان کیا۔

''تمہاری اسٹڈی بھی تو اتنی ہارڈ ہے۔ شاید یہ بھی وجہ ہو۔''

''یہ ایشو نہیں ہے۔ میں اسٹڈی کے ساتھ کھانے پینے کا دھیان رکھتی ہوں۔ اس لیے مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو شروع سے ٹاپ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتی ہوں۔''

''او کے بابا..... میں اپنے فرینڈ ڈاکٹر احمد سبحان سے بات کرتا ہوں۔ وہ بہترین اسکن اسپیشلسٹ بھی ہیں۔

وہ کوئی بہتر علاج بتا سکتے ہیں۔'' شہیلا کی پریشانی ہنوز برقرار تھی۔ اسفند کچھ دیر قبل تک اُسے تسلی دیتا رہا اور پھر چلا گیا۔

☆......☆......☆

''سیف آئی ایم ریئلی ویری ہیپی۔'' شاہانہ بہت خوش تھی۔ سیف سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔

''چہرہ بتا رہا ہے کہ کیوٹ گرل تم بہت خوش ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ وجہ کیا ہے۔''

''وجہ ابھی نہیں۔ بعد میں۔''

''ابھی بتانے میں GST لگے گا کیا لڑکی۔''

''ابھی مزید خوش ہو جاؤں پھر..... او کے۔''

''او! کہیں لائف پارٹنر تو نہیں Select کر لیا گھر والوں نے۔'' سیف چہکا۔

''اوہو! ایک تو نا یہ ہماری جنریشن کا اسٹارٹ اور اینڈ بس LoveBrids ہی ہوتا ہے۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ او کے میں چلتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اس کے قدم میڈم آفندی کے آفس جانب تھے۔ پروفیسر روم میں اس وقت اُسے یقین تھا وہ موجود ہوں گی۔''

☆......☆......☆

اس نے جیسے ہی بائیں طرف نگاہ کی وہ بینچ پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑی۔

''آپ۔''

''آف کورس آنرایبل لیڈی۔ یہ میں..... آپ کا بندۂ ناچیز۔''

''مگر کیوں؟''

''ارے ہماری چھوڑیں مگر آپ کیوں بھئی۔''

''مم میں..... میں تو بس وہ..... یونیورسٹی جا رہی تھی۔''

''اطلاعاً عرض ہے کہ میں بھی یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا مگر آپ کو گم صم اداس اس بینچ پر شجر کی تنہا اداس کسی بلبل کی طرح دیکھا آپ تو آ گیا۔ یہ کہنے کہ۔

''حاضر ہوں دل و جاں سے..... کیڑا ہوں گرچہ میں ذرا سا۔''

''خدا تم سے پوچھے اسفند!''

''اجی! ہم سے یوں پوچھے۔ ہم دونوں سے نا پوچھے۔

اور ہاں پاگل لڑکی خدا تم سے زیادہ پوچھے گا۔ اس نے ٹیڑھی نظروں سے شہیلا کو دیکھا۔

''شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔''
''تمہیں آئی شرم مجھے کوستے ہوئے۔''
''میں تم سے نہیں بول رہی۔''
''مجھے بھی آپ کی کوئی پروا نہیں مس شہنیلا آفندی! سفر تو کسی طرح کٹ ہی جائے گا مگر آہستہ آہستہ۔''
''ہونہہ۔''
''ارے بابا ناراض نہ ہو! یہ تو بتا دو ایک اٹھارہ گریڈ کا گزیٹڈ آفیسر تمہیں دل و جان سے پسند آ گیا ہے اور تم اس کے نام کی ڈائمنڈ رنگ بھی بہت جلد پہننے والی ہو۔''
''آف کورس! آپ نے جو بھی سنا ہے مسٹر اسفند علی خان بالکل درست سنا ہے۔''
''مگر اتنی خاموشی ہے۔''
''اور نہیں تو کیا میں اعلان کراتی پھرتی۔''
پھر بھی مس شہنیلا آفندی۔ ہم فرسٹ کزن ہیں آپ کے۔''
''او ہو! تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ولن بن کر چلے آئیں لولی وڈ کے کہ اے منگنی نئی ہو سکدی اے کر دیے!''
''ارے ارے بابا آ تو ہم پر Trust ہی نہیں کر رہی ہیں۔ اور بھلا ہم زبردستی یہ سب کہنے والے کون ہیں۔
بات تو بھئی دل ملنے کی ہوتی ہے۔ زبردستی کا تو کوئی ناتا نہیں ہوتا۔
دیکھیے نا ہم آپ کے سدا قریب رہے مگر جیت نہ سکے آپ کو...... اور وہ...... وہ آپ کو بنا دیکھے پسند آ گئے۔
آپ نے ہاں بھی کر دی اور معاملہ ڈائمنڈ رنگ تک چلا گیا۔''
شہنیلا مسکرائی۔
''بس کر دیں آپ، آپ...... آپ کرتے آپ پہلے ہی ٹرین نکال چکے ہو۔ اور......''
اسفند مسکرایا۔
''تم بھی نا...... کوئی تم کو نہیں سمجھ سکتا۔''
''اسفند ڈائمنڈ رنگ از مائی اون پرابلم۔ جانتے ہو مجھے بزنس مینوں سے نفرت ہے۔
میں اُس مزدور سے محبت کرتی ہوں جو روز گڑھا کھودتا ہے اور روز پانی بھرتا ہے۔''
''ارے تو کیا ہم بھی مزدوروں کی صف میں بیلچہ اور تگاری لے کر کھڑے ہو جائیں۔'' اسفند اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے لگا۔
بس کر دو...... اور ہاں۔ یہ رشتہ صرف تمہاری وجہ سے ہی ہو رہا ہے۔''
''میری وجہ سے۔''
''جی ہاں تمہاری وجہ سے۔''
''یار میں سمجھ نہیں پا رہا پلیز سمجھاؤ۔ کہیں میں خوشی سے یہیں نہ مر جاؤں۔''
''ابھی تو خیر میں بہت Busy ہوں۔ چلو تم مجھے پروفیسر بخشی کی طرف لے چلو۔ انہوں نے میری ڈاکومینٹس فائل Merit کوٹے پر وزیر تعلیم کو بھجوائی ہے۔ دعا کرو۔ یہ منگنی میرے لیے 'بھاگوان' ثابت ہو۔''
''ارے بڑی چھپی رستم نکلی ہو تم تو۔ یہ سب کچھ بالا ہی بالا طے کر لیا۔
اللہ خیر کرے گا۔ میری دل سے دعا ہے کہ یہ نوکری صرف تمہیں ہی ملے گی اور وہ بھی 100 فیصد میرٹ بیس پر۔''
''شام کی چائے ہمارے ساتھ۔ پھر تمہیں اس راز کا بھی بتانا ہے جو تمہاری وجہ سے وقوع پذیر ہوا تھا۔

وہ مسکرائی اور پھر اسفند کے ساتھ یونیورسٹی کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

مجھے وہ دن بھی کبھی نہیں بھول سکتا۔ جس نے میری کامیابی میں سنگِ میل کا کردار ادا کیا۔ وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ بڑی پھوپو آئی ہوئی تھیں۔

اُن کی دونوں بیٹیاں ساتھ تھیں اور ساتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا بھی تھا۔ بڑی پھوپو لگ بھگ کئی مہینے بعد آئی تھیں...... امی ان لوگوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، جب کہ میں بھی وہیں موجود تھی۔

پھوپو اور اُن کی دونوں بیٹیاں صوفے پر بیٹھی تھیں۔ امی مجھے ڈانٹ کر لے آئی تھی۔ کہیں بڑی پھوپو اس بات کو 'محسوس' ہی نہ کرلیں کہ مجھے پھوپو سے اس قدر لگاؤ بھی نہیں کہ چند گھڑی پھوپو کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی پھوپو بھی آفس سے آگئی تھیں۔ بہن اور بھانجیوں سے ملنے کے بعد وہ بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

اب سب وقفے وقفے سے اس مٹھائی کے ٹوکرے کو دیکھ رہے تھے۔

''اس قدر بڑا مٹھائی کا ٹوکرا...... ضرور کوئی خاص بات ہے۔'' سب اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے۔

بالآخر چھوٹی پھوپو نے بات کرنا شروع کی اور پہلے بڑی پھوپو سے حال احوال دریافت کیا۔ جس کا جواب انہوں نے معمول سے زیادہ تمکنت سے دیا تھا۔

''یہ مٹھائی کس سلسلے میں۔'' چھوٹی پھوپو نے اُن سے پوچھا۔

''یہی مٹھائی دینے تو آئی ہوں...... اب اپنوں سے خوشی نہیں بانٹوں گی تو کس سے بانٹوں گی......''

بڑی پھوپو نے ایک خاص انداز سے گردن کو ہلایا تھا اور پھر سے بات شروع کی۔

''میری دونوں بیٹیوں کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ میرے جیٹھ کی فیملی میں، وہ جو کینیڈا میں رہتے ہیں۔'' بڑی پھوپو نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں غرور نمایاں تھا۔ جب کہ اُن کی دونوں بیٹیاں تیز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی بھی نگاہوں میں غرور تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو۔''

چھوٹی پھوپو اور امی نے کہا تھا۔ میں نے بھی چہرے پر مسکراہٹ سجالی تھی۔

''آپا رشتے تو آپ نے کرلیے ہیں۔ رشتے کرنے سے پہلے کم از کم مشورہ کرلیتیں بہن بھائیوں سے تو اچھا ہوتا۔'' چھوٹی پھوپو آخر بہن تھیں، انہیں دکھ ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے گلہ کیا۔

''لو بھئی خیر سے میں عقل رکھتی ہوں۔ اتنا اچھا رشتہ تھا، مشورے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے جھٹ رشتہ طے کردیا۔''

بڑی پھوپو کا جواب چھوٹی پھوپو کے لیے تکلیف دہ تھا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں، لیکن انہیں معلوم تھا جواب تو ایسا ہی ملنا ہے، اس لیے انہوں نے مزید کچھ نہ کہا۔

''لو بھئی تصویریں دیکھ لو۔ کتنا عرصہ تو ہوگیا ہے انہیں کینیڈا گئے ہوئے۔

کہاں تم لوگوں نے انہیں میرے گھر کسی تقریب پر دیکھا ہوگا۔ بلیک سوٹ والے سے بڑی کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

پہلے امی اور پھر پھوپو نے وہ تصویریں دیکھیں بعد میں تصویر میرے ہاتھ میں آئی۔ دونوں خوش شکل تھے۔

''مٹھائی تو کھاؤ تم لوگ، لو کھاؤ۔''

''ضرور کیوں نہیں۔''

امی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ہم نے مٹھائی کھائی۔

''لڑکے کیا کرتے ہیں۔'' امی نے پوچھا تھا۔

''اپنا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ بہت بڑا، وہی چلاتے ہیں۔ویسے پیسوں میں کھیلتے ہیں وہ لوگ۔''

بڑی پھوپو لگ بھگ آدھ گھنٹا مزید بیٹھی تھیں اور ان لوگوں کی امارت کے قصے سناتی رہیں اور سب لوگ سنتے رہے۔

میں بور ہوکر وہاں سے کھسک گئی اور کچن میں آ کر سکون کا سانس لیا۔تھوڑی دیر بعد پھوپو کی بڑی بیٹی میرے پاس کچن میں آ گئی تھی۔

آج وہ بہت خوش تھی۔ بس مغرور مسکراہٹ چہرے پر لیے مسکراتی رہی۔میں نے اُسے مبارکباد دی اور اپنی ہم عمر ہونے کی وجہ سے اُس سے اُس کی پسند کے بابت پوچھا کہ جس سے اُس کی نسبت ٹھہری ہے اُسے وہ پسند بھی ہے یا نہیں۔

میری بات کا اُس نے صرف ایک جواب دیا۔

''شہنیلا بی بی تم جتنا بھی پڑھ لو۔لیکن کبھی بھی ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنے لانبے سلکی بالوں سے گندھی چوٹی ایک ادا سے آگے کر لی۔

اور میں سمجھ گئی کہ وہ میرے بے رونق بالوں پر چوٹ کر رہی ہے۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''مطلب تو تم خوب سمجھتی ہو۔بچپن سے لے کر اب تک تمہیں اپنی پڑھائی پر بڑا فخر تھا۔مگر میں تمہیں چیلنج کرتی ہوں کہ نصیب کے معاملے میں تم میرا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو چکی ہو۔

یاد رکھو عورت کا حسن اُس کی اِن سیاہ گھنی زلفوں میں ہوتا ہے۔اِسی لیے بنگال کی عورت کو اگر جادوگرنی کہتے ہیں تو وہ اِس کے اِن بالوں کی ہی وجہ سے کہتے ہیں۔''

اُس کی باتیں سُن کر میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے۔

میں اپنے انہی حالات میں رہتے ہوئے اپنی تقدیر کو تدبیر سے بدل کر رہوں گی۔

شہنیلا آفندی نے آج خود سے ایک وعدہ کیا تھا۔ بہت ٹوٹکے کیے اور آخر کار اسفند میرے لیے مسیحا ثابت ہوا۔

آج اگر میں نے کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ''لائف بوائے'' کے شیمپو کے استعمال نے میرے بالوں کو خوبصورتی دے کر بھی پورا پورا تعاون کیا ہے۔

☆......☆......☆

جب سوچتی ہوں میں کل کو تو
لگتا ہے یادیں ٹانگ دی ہیں
سب دن دکھ کے اک گٹھری میں
اِک طرف لپیٹ کے رکھے ہیں
اور سکھ کے گلاب
میں نے گملوں میں بو دیے ہیں
جدھر بھی پڑے نظر
بس اِک چین سکون نظر آئے
جب سوچتی ہوں میں کل کو تو
تُو مجھ کو کہیں نہ نظر آئے
جب چور تھکن سے جسم مرا
نیند ہنڈولے جھولتا ہے
بس تُو ہی تُو کیوں دکھتا ہے

میں آج ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں۔

لوگ مجھے یونیورسٹی کی بہترین پروفیسر میڈم آفندی کے نام سے جانتے ہیں۔میرے شوہر بھی گزیٹڈ آفیسر تھے اور اب وہ ملک کے اہم عہدے پر موجود ہیں۔

کل بیت گیا لیکن یاد ہے مجھے اِک اِک پل

میں بالوں کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔
اسفند نے مجھے اپنے ڈاکٹر دوست سے صرف ایک Solution لا کر دیا۔ جسے آج میں پوری دنیا خصوصاً آج کی گرلز کو بتا دینا چاہتی ہوں۔
اسکن اسپیشلسٹ نے کہا تھا کہ بالوں کے گرنے کی سب سے اہم وجہ دوسروں کے کہنے سے غلط شیمپو کا استعمال اور نئی پراڈکٹس کا بے دریغ بالوں پر استعمال ہے۔
صرف ایک واحد شیمپو ایسا ہے جسے استعمال کر کے 100 فیصد سے بھی زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جی ہاں وہ کوئی Strange شیمپو نہیں بلکہ ہمارا آپ کا دیکھا بھالا ''لائف بوائے شیمپو'' ہے۔
لائف بوائے...... بالوں میں جان لائے
لائف بوائے...... بال خوبصورت بنائے
لائف بوائے...... لڑکی کو حسین بنائے
لائف بوائے...... اچھی جگہ رشتہ کرائے
بالکل...... لائف بوائے اچھی جگہ رشتہ کرائے۔ میں نے اسفند کے کہنے پر لائف بوائے شیمپو کا استعمال کیا اور بال آہستہ آہستہ اتنے پیارے ہونے لگے کہ میں حیران رہ گئی۔
رضوان احمد کا رشتہ ہوا تو بھی میرے خوبصورت بال ہی وجہ قرار پائے۔
اور یونیورسٹی میں بطور پروفیسر اپائنٹ ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس کے لیے خاص اٹریکشن یہ بال ہی قرار پائے۔
ایک اسٹوڈنٹ شاہانہ وسیم تو میرے لیے بہت اسپیشل ثابت ہوئی۔ اس کے بالوں کے ساتھ بہت مسئلہ تھا۔
میں نے اُس کے بہت اصرار پر اُسے بھی لائف بوائے شیمپو کا مشورہ دیا اور آج...... وہ اپنے احساسِ کمتری سے نجات پا کر بہترین اسٹوڈنٹس میں شمار ہے۔
جب اُس شام میں نے اسفند کو بتایا کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ تو وہ بھی حیران رہ گیا۔
ساتھیو! اکثر ہم لوگ پتھر کو ہیرا اور ہیرے کو پتھر سمجھ لیتے ہیں۔
لائف بوائے کی قیمت ایک عام آدمی کی Range کو دیکھتے ہوئے رکھی گئی ہے۔ مگر جب تک یہ سوچ ہم نہیں بدلیں گے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ہم ناکام رہیں گے۔
ایک بات اور مجھے بھی محبت میں بے وفائی ملی تھی۔ میری فرینڈ شازیہ مجھے زندگی کی طرف واپس لے کر آئی۔
اس نے مجھے زندگی کی اصل خوشیوں کی طرف راغب کیا اور کوشش کر کے یونیورسٹی میں لیکچرار کی نوکری دلانے میں شازیہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور میں اپنی اِس کامیابی کا کریڈٹ اپنی بڑی پھوپو کو بھی دوں گی کیونکہ اُس دن جب وہ اپنی بیٹیوں کی منگنی کی مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آئیں تو ساتھ ساتھ جہاں اُن کی بیٹی نے میرے بالوں کا مذاق اڑایا وہیں وہ میرے سر پر کامیابی کے تاج کے ساتھ ساتھ کامیابی کا ٹوکرا بھی نادانستگی میں مجھے تھما گئی تھی۔
محبت سب کچھ ہوتی ہے اور محبت کچھ بھی نہیں ہوتی ہے۔
لیکن محبت کرنا ہے تو پہلے اپنے آپ سے کریں۔ جب خود سے محبت کریں گے تو سب سے محبت آپ ہی آپ ہو جائے گی۔ میری اس کامیابی کے در پر برد Lifebuoy ہے۔ آئی لو یُو لائف بوائے شیمپو۔
تم سا پیارا دوست...... ہر خوشی لائے
☆☆......☆☆



عقیدتوں کا سفر

کاروانِ حجاز

مولانا ماہر القادری

حرمین شریفین کے خوش بخت لمحات کی روداد خاص

اب ہم مکہ مکرمہ سے قریب تر ہوتے جارہے ہیں۔ تمام لوگ احرام پہنے ہوئے ہیں اور بڑے ذوق وشوق کے عالم میں تلبیہ پڑھ رہے ہیں۔
لیجیے حدود حرم سے بھی کچھ آگے نکل آئے۔ تلبیہ پڑھتے ہیں آنکھیں بھی زبان اشک سے لے میں لے ملا رہی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے قریب کے میدان اور پہاڑیوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ حضور نبی کریم ادھر سے ضرور گزرے ہوں گے۔ کیا عجب ہے ان وادیوں میں سرکارﷺ نے بکریاں بھی چرائی ہوں۔ نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضورﷺ کی پابوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔



مکہ مکرمہ کی آبادی آ گئی۔ رات کا وقت ہے۔ ایسے میں جو ٹیلہ، جو پہاڑی اور جو مکان بھی نظر آتا ہے، عقیدت کہتی ہے کہ اسے دل میں اتار لیجیے۔ یہ لندن اور پیرس نہیں مکہ مکرمہ ہے۔ یہ بلدامین ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹوں نے اس مقدس سرزمین پر کعبہ کی بنیادیں اٹھائی تھیں اور اس پاک اور مبارک شہر کا

سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ یہ انسانیت کے محسن اعظم دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور نبیوں کے خاتم، محمد عربی ﷺ (فداہ ابی وامی) کا مولد ومنشاء ہے۔ زمانہ کی قدر ناشناسی اور دنیا کی غفلت کے ہاتھوں انسانی مجد وشرف کی تاریخ یا تو لوگوں نے بھلا دی تھی یا پھر اسے مسخ کر دیا تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ کا پہلا ورق اسی سرزمین پر مرتب ہوا۔ اسی شہر میں حق کی آواز بلند ہوئی جس نے باطل کے جسم میں تھرتھری پیدا کر دی۔ یہ تاریخی شہر نہیں بلکہ خود 'تاریخ ساز' شہر ہے۔ اس شہر پر تاریخ کا ذرہ برابر بھی احسان نہیں بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان ہے، تاریخ اس شہر سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اگر تاریخ سے 'مکہ مکرمہ' کو نکال دیا جائے تو پھر تاریخ میں رہ کیا جائے گا۔

''باب السلام' سے داخلہ ہوا۔ اور بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی زبان پر تکبیر جاری ہو گئی۔

اللہ اکبر' اللہ اکبر' لا الہ الا اللہ واللہ اکبر!

جلال وہیبت اور جبروت وسطوت کا سامنا ہے۔ ایک عالم گومگو اور ایک کیفیت بے نام ہے جو طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں!

یا اللہ! میں کہاں آ گیا! یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں! مجھ سا پلید اور حرم مقدس میں! مجھ سا خطا کار' گنہ گار اور معاصی سرشت اس مقام پر جہاں ہر زمانہ کے اتقیاء وصلحا' پاکبازوں اور نیکو کاروں نے سجدے اور طواف کیے ہیں۔ یہ پیروں سے نہیں، سر کے بل چلنے کا مقام ہے۔ یہاں کا جتنا بھی احترام کیا جائے تھوڑا ہے۔ ہمہ شما کا کیا ذکر ہے۔ اللہ کے جس گھر کا خود حضور سید المرسلین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طواف کیا ہو، جہاں حضور ﷺ نے نمازیں پڑھی ہوں اور رو رو کر دعائیں مانگی ہوں وہاں مجھ جیسے نابکار کی حاضری ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جب فضل کرتا ہے تو ایسے معجزے ظہور میں آتے رہتے ہیں!

کہاں بلایا گیا ہوں...... العظمۃ للہ!

اب ہم اس مقام (بیت اللہ) کا طواف کر رہے ہیں۔ اس کی طرف ساری عمر نمازیں پڑھی ہیں اور بچپن میں کعبہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر قسمیں بھی کھائی ہیں۔ خوش قسمتی سے وقت ایسا ملا کہ شمع کے گرد پروانوں کا بہت زیادہ ہجوم نہیں، اس لیے حجر اسود پر نگاہ پڑتے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ قول یاد آ گیا کہ:

''اے اسود! تُو بس ایک پتھر ہے۔ تُو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع! میں تجھے اس لیے چومتا ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چومتے ہوئے دیکھا ہے۔''

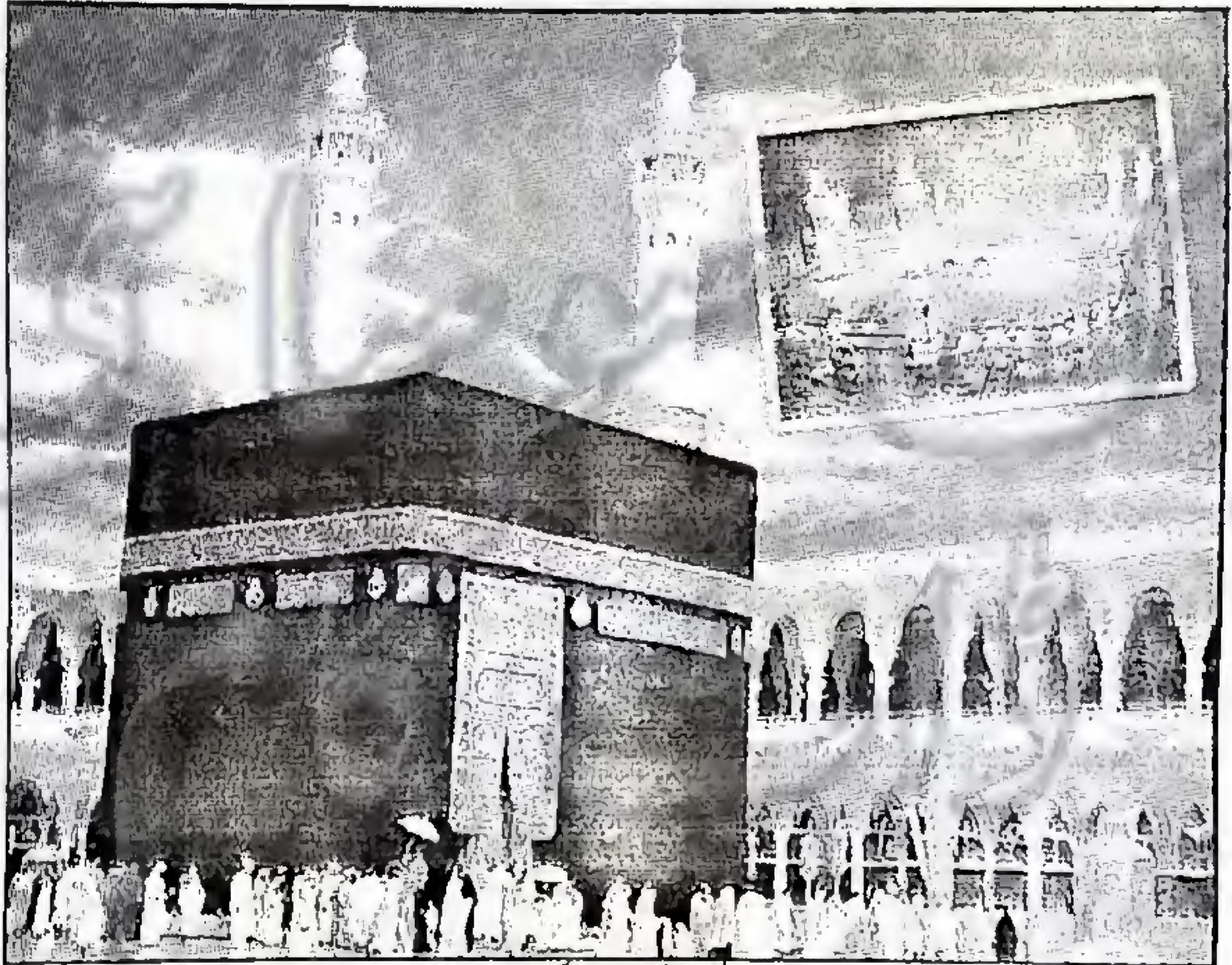
اسلام کا یہی وہ مقام توحید ہے جہاں دوسرے مذاہب گرد منزل اور غبار راہ نظر آتے ہیں۔ توحید کے معاملے میں اسلام جذب وشوق کے کسی تقاضے کے لیے ذرا سی بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ غلط کہتے ہیں جو بھی کہتے ہیں کہ عشق شریعت کے حدود توڑ دیتا ہے۔ اس قسم کا عشق سنیاسیوں اور بیراگیوں کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے، مگر اسلام میں ٹھکرا دینے کے قابل ہے!

یہ رکن عراقی ہے۔ یہ رکن شامی اور رکن یمانی ہے۔ یہ حطیم ہے، یہ میزاب رحمت ہے، یہ مقام ابراہیم ہے، یہ باب کعبہ ہے، یہ ملتزم ہے...... یا اللہ! کیا کروں کیا نہ کروں؟ مجھ سے تو کسی ایک مقام تجلی کی تعظیم کا تھوڑا سا بھی حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں تو ہر بن مو کو سراپا محویت واستغراق ہو جانا چاہیے تھا۔ خدانخواستہ میں منافق تو نہیں ہو گیا؟ اے میرے پتھر دل! خدا کے لیے نرم ہو جا۔ پگھل اور اتنا پگھل کہ غلاف کعبہ پر تیرے خون کی سرخی نظر آنے لگے۔ ارے کم بخت اس سے زیادہ خشیت اور تواضع اور توجہ الی اللہ کی گھڑی اور کب آئے گی! اے غفلت کوش اور غفلت شعار! یہاں بھی اگر بیدار نہ ہوا تو پھر تیرے لیے ابد تک موت ہے!

ایک عجیب عالم میں مطاف کے سات شوط (چکر) پورے کیے اور اس کے بعد حجر اسود کو چوما اور

وہاں سے مقام ابراہیم پر آ کر دو رکعات پڑھیں اور پھر ملتزم پر پہنچے۔

اے میرے دل خدا کے لیے چونک! اور دل چونکنے لگا۔ اے میری آنکھو! اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ آج آنسو بہانے میں کمی نہ کرنا اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ملتزم پہنچ کر اللہ کا فضل ہے کہ



آنکھوں نے دل کا بہت کچھ غبار دھو دیا۔ ان لمحوں کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی! دعائیں کیں، دیر تک' بہت دیر تک...... ملتزم سے چمٹ کر' غلاف کعبہ کے سائے میں۔ توبہ، استغفار، عفو و رحمت کی طلب۔ آئندہ اچھی زندگی گزارنے کا عہد و پیمان۔ اپنے لیے اور ماں باپ کی مغفرت کے لیے عزیزوں اور دوستوں کے لیے دعائیں۔ کیا عجب ہے کہ اللہ کی رحمت میرے بھکاریوں جیسے عجز و تذلل اور مجرموں جیسی ندامت و بدحواسی کو دیکھ کر مسکرا دی ہو۔

میدان احد

ایک دن حیدر آباد دکن کے چند زائرین کے ساتھ ہم مدینہ منورہ سے پیدل احد آئے۔ مسافت دو ڈھائی میل کے قریب ہوگی۔ گھنٹہ پون گھنٹہ میں بڑی سہولت کے ساتھ احد پہنچ گئے۔

یہ وہ احد ہے، جس کے لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

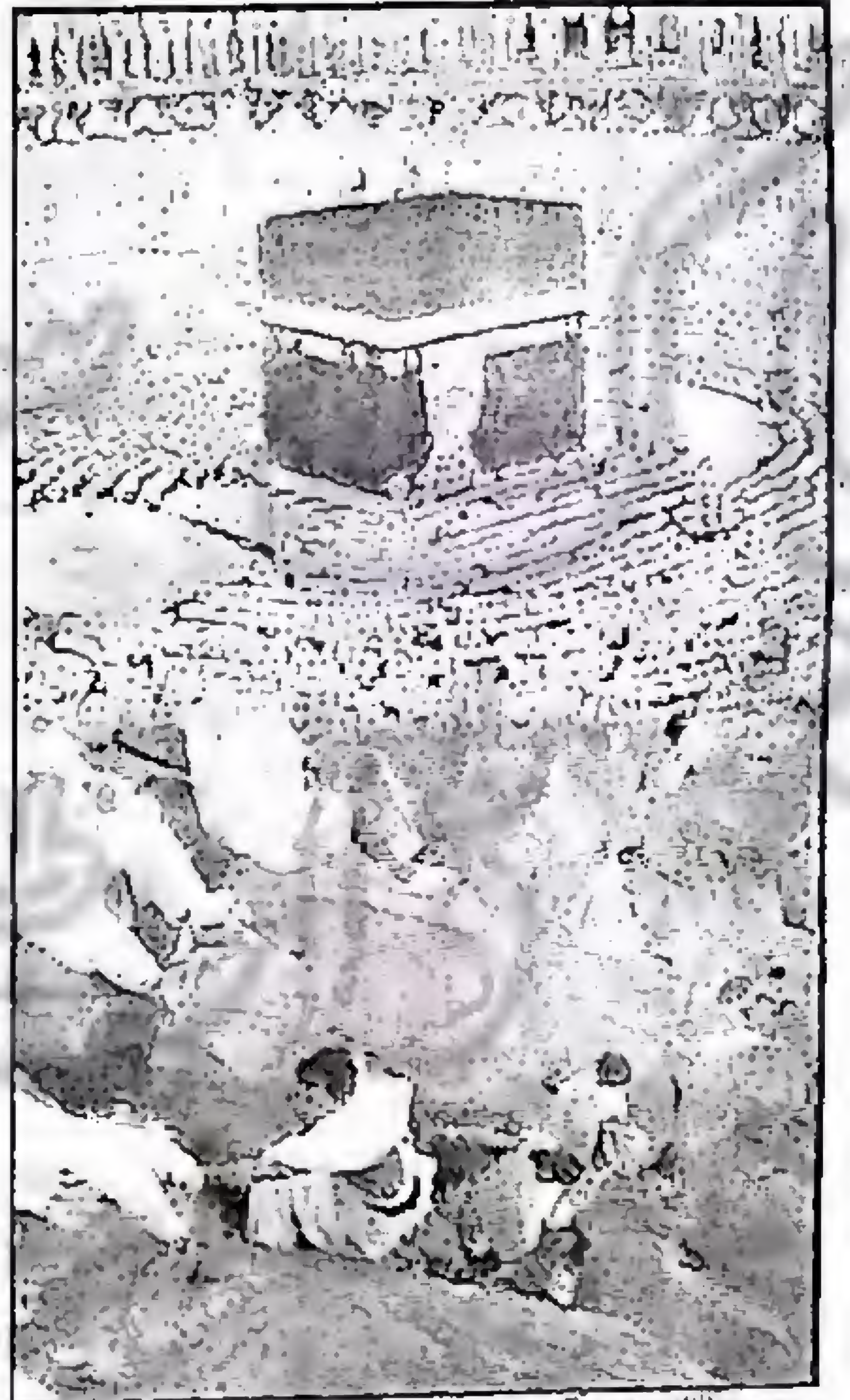
''احد ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم احد کو دوست رکھتے ہیں۔''

تینوں طرف بلند پہاڑیاں اور ان کے جنوب میں میدان! یہاں ہمارے ساتھی بھی مل گئے۔ انہوں نے اشارہ کر کے کہا کہ ہم اس غار کو دیکھ کر آئے ہیں۔ تم چاہو تو تم بھی دیکھ آؤ۔ یہاں آ کر احد کے غار کو دیکھے بغیر، کس طرح چلے جاتے۔ مگر پوری احتیاط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے، نوکیلے پتھروں اور کھردری چٹانوں سے گزرنا پڑا۔ چڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ اس غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔

یہ جگہ زمین سے کئی سو فٹ بلند ہوگی۔ پہاڑیوں کے درمیان ایک خلا سا بن گیا ہے جس میں مشکل سے

دو تین آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ غزوہ احد میں زخمی ہونے کے بعد پہاڑ کی جس محفوظ چوٹی پر تشریف لے گئے تھے، چوٹی یہی ہو کہ جنگی نقطہ نگاہ سے یہ مقام محفوظ ہو اور نیچے سے اوپر آنے والے غنیم پر پتھروں اور تیروں کی بڑی کارگر زد پڑ سکتی ہے۔

شاید اسی چوٹی پر صحابہ کرامؓ نے ابوسفیان کے: ''اعل ھبل..... اے ہبل تُو اونچا رہ'' نعرے کو سن کر



حضور ﷺ کے حکم سے: ''اللہ اعلیٰ و اجل...... خدا اونچا اور بڑا ہے۔'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔

احد کی بلند ترین چوٹی کے اس غار میں دو رکعت نفل میں نے پڑھے۔ اس غار میں ایک گدڑی رکھی ہوئی دکھائی دی۔ شاید کوئی خدا کا بندہ رات یہاں آ کر بسر کرتا ہے۔ میں نے اجنتا، ایلورا کے غار دیکھے ہیں جو سنگ تراشی اور مصوری کے 'نیم ربانی' آثار کہے جاتے ہیں، مگر جبل احد کی ایک ایک ٹھیکری قدر و قیمت اور مجد و شرف میں ان سے بڑھ کر ہے۔ اس غار

کے یہ چند لمحے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

احد کا میدان ہمارے سامنے ہے۔ اسلام کی تاریخ کا مہتم بالشان ورق! حضور ﷺ ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ کر مدینہ سے یہاں کے لیے چلے تھے، مگر منافقوں کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی تین سو سپاہیوں کو لے کر واپس ہوگیا۔ ادھر کل سات سو صحابہؓ تھے اور ادھر کفار قریش کے ساز و سامان کا یہ عالم تھا کہ دو سو تو کوتل گھوڑے ان کے ساتھ تھے۔ بچاؤ کے لیے سروں پر خود اور بدن پر زرہیں ان کے پاس تھیں۔ نیزے، ڈھالیں، تلواریں، تیر کمان اور حربے، کیا چیز تھی جو ان کے پاس نہ تھی۔

حضرت انسؓ کے چچا حضرت نضرؓ اسی احد کے سنگلاخ میں جنت کی خوشبو سونگھ کر کافروں کی فوج میں دراتے ہوئے گھس گئے اور اس بہادر کے ساتھ شہادت پائی کہ جسم پر اسی سے زیادہ زخم تھے لاش کا پہچاننا مشکل تھا!

حضرت ابودجانہ حضور ﷺ کی عطا کی ہوئی تلوار اسی احد کے میدان میں لے کر جو نکلے تو چال میں تکبر پیدا ہوگیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ چال خدا کو ناپسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے۔''

اسی میدان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے سامنے حضور ﷺ نے اپنا ترکش ڈال کر فرمایا:

''تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر چلاتے جاؤ۔'' یہ فخر سعدؓ بن ابی وقاص کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

اسی میدان جنگ میں حضور ﷺ کے پیارے چچا حضرت سیدنا حمزہؓ کی لاش کا مثلہ کیا گیا۔ اور ہندہ نے آپ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ دو چار نہیں ستر صحابہؓ اس غزوے میں شہید ہوئے، جن کا ہر فرد ایک امت کے برابر تھا!

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خوب بات کہی کہ احد وہ میدان ہے جس نے لغت کو شجاعت کے الفاظ دیے ہیں!

(''کاروانِ حجاز'' سے ماخوذ، سفر 1954ء)

☆☆......☆☆



عقیدتوں کا سفر

حجاز میں چودہ دن

شورش کاشمیری

حرمین شریفین کے خوش بخت لمحات کی روداد خاص

لبیک اللھم لبیک! ناقہ کہاں کہ میں اس کی مہار تھام کر حرم کے حدود میں داخل ہوتا کہ یہ بھی سنت نبوی ﷺ ہے۔ دل نے کہا کہ پلکوں سے موتی چنو، وہاں آگئے ہو جہاں ابراہیمؑ آئے تھے، ہاجرہ آئی تھیں، اسماعیلؑ آئے تھے، جہاں محمد ﷺ پیدا ہوئے تھے اور جہاں وقت کے بہترین انسانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا تھا، جہاں بدترین انسانوں نے ان کی نافرمانی کی تھی، ان کا مذاق اڑایا تھا اور وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ پھر جہاں وہ فاتح کی حیثیت سے اس طرح لوٹے تھے کہ ابوسفیان ہی کا گھر سب کی پناہ گاہ بنا دیا تھا۔ جہاں باد صبح گاہی میں محمد ﷺ کی سانسیں چلتی اور شب کے آویزے (تارے) ان کے آنسوؤں سے تیار ہوتے تھے، جہاں اب بھی بلالؓ کی اذانیں محفوظ ہیں اور سنی جاتی ہیں، جہاں ہر چپہ ایک تاریخ ہے، جہاں ایک عہد کے سب سے بڑے انسان عمریں بتا گئے ہیں، جہاں کی مشعلیں روشن ہیں، جہاں ان کے نقش قدم سنگ میل ہیں، جہاں جبرئیل آتے رہے، وحی نازل ہوتی رہی اور قرآن اُترتا رہا۔

[illegible] اللہ کے مینار ابھر آئے اور میں ان پہاڑوں سے گزر رہا تھا جن میں سے ایک پہاڑ (کوہ صفا) پر چڑھ کے حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔

"اے معشر قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟"

سب نے کہا ہاں! کیونکہ تم ہمیشہ سچ بولتے ہو۔

آپ ﷺ نے فرمایا تو میں یہ کہتا ہوں اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر شدید عذاب نازل ہوگا۔"

یہ مکہ ان زندہ پائندہ انسانوں کا گھر ہے جو بظاہر ہم میں نہیں لیکن ہر لحظہ ہم میں ہیں اور جن پر دنیا بھر میں جہاں تہاں اسلام کی آواز ہے، دن میں کئی کئی دفعہ درود وسلام بھیجا جاتا ہے۔ جس طرح بدلیاں پانی کے ڈول بھر کر چلی آتی ہیں اس طرح کرہ ارض کی ہوائیں ان کے لیے درود وسلام کے گلدستے لے کر آتی اور لٹا کر لوٹ جاتی ہیں۔ صدیوں سے صبح وشام یہی ہو رہا ہے اور یہ قافلہ ابد تک کے لیے رواں دواں ہے۔

سلام ہو اس زمین پر جس کے ویرانے نے ہمیں آباد کیا اور جس کے نشیب پر دنیا بھر کی بلندیاں کھنچی چلی آتی ہیں۔ سب سے بڑی سجدہ گاہ! جہاں ایک پتھر

کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ کروڑوں انسان صبح و شام ایک عظیم انسان ﷺ کے اتباع میں اسے بوسہ دیتے اور یہ اعزاز ... صبح محشر تک اس کے لیے خاص ہو گیا ہے... لبیک اللھم لبیک

بیت اللہ

بیت اللہ کی ہیبت مجھ پر چھا گئی۔ پھر ایک لہر تھی کہ صدیوں کی سرگزشت سمیٹتی ہوئی نکل گئی۔ ایکا ایکی سیکڑوں دور خیال کی سی تیزی لیے بیت گئے اور وہ دل جو ابھی تک مرعوب تھا خوشی سے جگمگا اٹھا۔ میں وہاں تھا جہاں اللہ تعالیٰ نے عرش و فرش کی تمام فضیلتیں جمع کر دی ہیں، جہاں چوبیس گھنٹے اللہ تعالیٰ کے فرشتے ملاء اعلیٰ سے درود و سلام کی جھولیاں بھر بھر کے لاتے اور بندگان تسلیم و رضا کو پہنچاتے ہیں۔

بیت اللہ مکہ مکرمہ کے نشیب میں اس طرح ہے جس طرح نون کے وسط میں نقطہ یا کٹورے کی تہہ کا دائرہ۔ اس نشیب کو مسجد الحرام نے آغوش میں لے رکھا ہے اور مسجد الحرام کے چاروں طرف پہاڑ کھڑے ہیں۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

فضل حق نے میرے ساتھ معلم کر دیا اور میں نے طواف کے سات چکر پورے کیے۔ ہر چکر میں مختلف دعائیں مانگیں۔ پہلے چکر میں حجر اسود کو بوسہ دیا، پھر ہر چکر میں استلام کیا۔ آخری چکر میں بوسہ دے کر ہٹا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ اس درجہ کیفیت پیدا ہوئی کہ اس وقت بیان کرنا مشکل تھا، اب بیان کرنا بس سے باہر ہے۔ بعض چیزیں آدمی محسوس کرتا ہے، کہہ نہیں سکتا۔ انسانی نطق اپنے تمام اثاثے کے باوجود ان کیفیتوں کو بیان کرنے سے معذور ہے۔ کیفیت چیز ہی وہ ہے جو بیان نہ ہو۔ کوئی انسان ان واردات کو جامۂ الفاظ نہیں پہنا سکتا جو عشق کے دربار اور ایمان کے جلو میں پیدا ہوتے ہیں۔ طواف کی لذت ہی ایسی ہے کہ الفاظ اس کے بیان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ میں گھوم رہا تھا اور معلوم ہو رہا تھا کہ تاریخ پیچھے کو لوٹ رہی ہے۔

یکا یک نظریں ٹھہر گئیں۔ بیٹا گارا ڈھو رہا، اینٹیں لا رہا اور باپ معماری کر رہا ہے۔ پھر ان کی دعائیں سنیں:

''اللہ العالمین! ہم نے یہ گھر تیرے منشا پر، تیری عبادت کے لیے بنایا ہے۔''

غار حرا

یہ غار سیرت النبی ﷺ کا پہلا پڑاؤ ہے۔ اب تک وہاں حضور ﷺ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور ان کے ہونٹوں کا ارتعاش صبا میں گھلا ملا معلوم ہوتا ہے۔

''اقرا باسم ربک الذی خلق'' کی آواز آ رہی ہے۔

سلام ہو...... اے جبلِ نور
سلام ہو...... اے غار حرا
سلام ہو...... اے گزرگاہ رحمتہ اللعالمین ﷺ
سلام ہو...... اے مہبطِ وحی
سلام ہو...... اے سرور کائنات ﷺ کی تنہائیوں کے نشیمن

تُو نے چالیس برس ازل سے ابد تک کے سب سے بڑے انسان کے پاؤں چومے ہیں۔
تُو نے اس سے اور اس نے تجھ سے باتیں کی ہیں۔
تُو نے اُسے آتے جاتے دیکھا ہے، سب سے پہلی وحی تیری آغوش میں ہی اُس پر نازل ہوئی تھی۔
تُو نے جبرئیل کے شہپروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی ہے۔

سلام ہو...... اے جبلِ نور، لاکھوں سلام صبح و شام
سلام اے غارِ حرا......
ہم تیرے شکر گزار ہیں،
ہم تیرے احسان مند ہیں،
تمام کرۂ ارضی تیرا ممنون ہے،
تُو نے رحمتہ اللعالمین ﷺ کو تخلیہ مہیا کیا،
تُو نے اُن کی خلوتوں کا گداز پایا،
تُو نے اُن کے آنسوؤں سے موتی چُنے،
اُن کے نفس کی مہک سے جنتی ہو گیا،
تیری پیشانی پہ ابد کا جھومر لٹک رہا ہے،
تیری آغوش میں کلام اللہ کا پہلا بول اُترا تھا،
سلام ہو اے جبلِ نور، سلام ہو اے غارِ حرا،

تو سجدہ گاہ معرفت ہے،
کعبۃ اللہ میں عقیدہ کے فرمان پر جبینیں جھکتی ہیں،
روضہ اطہر پر عشق کے حکم سے دل جھکتے ہیں،
اور...... اے غارِ حرا،
تیری بارگاہ میں وجدان کے اقتضاء پر نگاہیں جھکتی ہیں
سلام ہو...... اے غارِ حرا
سلام ہو...... اے جبلِ نور

یہ اس عاجز گناہ گار، روسیاہ، خاطی اور محتاج کرم کی پکار ہے جو تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہے جس طرح کشکول بدست فقیر غنی کی چوکھٹ پر صدا دیتا، موج ساحل کو پکارتی، تنہائی عشق سے ہم کلام ہوتی، وصال اپنے جاوداں ہونے کی دعا مانگتا اور عمر رواں آخرت کے سفینے پر آ کر ٹھہر جاتی ہے۔

مدینتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جوں جوں مدینہ کے آثار قریب ہوتے گئے دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں یہاں تک کہ اندر دگرگوں ہوگیا۔ عقل نے کہا اس سے آگے جانا میرے لیے مشکل ہے، یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ عشق نے کہا...... یہاں سے دل کی بادشاہت شروع ہوتی ہے۔ جانتی ہو ابھی تھوڑی سی دیر میں کہاں پہنچ گئے؟ جہاں سے آ رہے ہو وہ اللہ کا گھر تھا، وہاں بندے کا ناز اپنے خالق سے ہے۔ یہ اللہ کے محبوب ﷺ کا گھر ہے، یہاں وجدان کی ناقہ پر عرفان کا محمل سجالو۔ آہستہ چلنا، یہ ادب والوں کا قبلہ ہے اور صرف باادب حاضر ہو سکتے ہیں۔ امام مالکؒ کی سن لو فرماتے ہیں۔

''میں اس شخص کو سو درے لگاؤں گا جس نے کبھی مدینہ کے موسم کی شکایت کی یا کسی چیز میں مین میخ نکالی۔ جہاں وجہ نمود کائنات کی آرام گاہ ہو وہاں کے موسم میں خلل و خرابی ممکن ہی نہیں۔''

...... اپنی بے سروسامانی پر غور کرو۔ تم اس قابل تھے کہ یہاں چلے آئے ہو؟ یہ حوصلہ؟ یہ جسارت؟ کہاں سے آئے ہو؟ آئے ہو یا بلائے گئے ہو؟ ختم المرسلین ﷺ کے دربار میں جا رہے ہو، درباروں میں بے مایہ لوگ نہیں جایا کرتے؟ مجرم و خاطی شہنشاہوں سے منہ چھپاتے ہیں۔ تم نے بڑا حوصلہ کیا، گنہگار ہو کر چلے آئے ہو، پکڑے جاؤ گے۔

شفیع المذنبین ﷺ کی چوکھٹ پر جا رہے ہو، جاؤ



لیکن ذرا رک جاؤ۔ وہ ٹکڑا جہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہیں بالاتفاق تمام کائنات سے افضل و برتر ہے۔ ساری کائنات مل کر بھی اس ٹکڑے کے برابر نہیں، تم کیا ہو؟ تمام کائنات کے روسیاہوں میں سرفہرست؟ کہاں اس گھر کی عالم پناہی اور کہاں ذرہ حقیر کی روسیاہی؟ کہاں رسالت مآب ﷺ کا آستانہ اقدس، کہاں ننگ خلائق کی جبین حقیر؟ کہاں عرش پہ جانے والا احسن و اکمل، کہاں فرش پہ رہنے والوں میں ارزل و اسفل۔

حضور ﷺ کے سامنے حاضر ہونا سہل نہیں۔ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی

تھے جوان کے روبرو حاضر ہوتے اور گفتارِ نبوت کے موتی چنتے تھے۔ صحابہؓ کا دل یا جگر کہاں ہے کہ حاضر ہو رہے ہو۔ وہاں جا رہے ہو جس کے چپہ چپہ پر محمد ﷺ واحمد ﷺ کے حسن خرام کے پھول کھلے ہیں، جہاں وقت کے بہترین انسان چلتے پھرتے تھے۔ دل نے کہا کچھ ملنے ہے؟ یہ سوچ کر لرز گیا کہ سوائے حسرت تعمیر کچھ بھی نہیں۔ عشق نے کہا چل رُک نہیں، کیوں رُکتا ہے؟ رحمتہ اللعالمین ﷺ کے آستانے پر جانے والے اسی طرح جاتے اور جھولیاں بھر کے لاتے ہیں۔

چشموں، دریاؤں اور کنوؤں نے کبھی کسی جام، کاسہ یا مشکیزہ کی خواہش نہیں کی۔ سورج نے کبھی چراغوں سے روشنی نہیں چاہی۔ تیری رات اندھیری ہے تو اس سورج سے روشنی لے جو آمنہ کی گود میں طلوع ہوا تھا، چودہ سو برسوں سے چمک رہا ہے جس کے لیے کوئی غروب نہیں۔ یہی مدینتہ النبی ﷺ ہے، یہی آستانہ رسول ﷺ ہے، سلام پڑھ، درود بھیج، یہ شہر درود و سلام کا شہر ہے۔

سیارہ (موٹر) رقص کی طرح پہلو بدلتی ہوئی سڑک پر کروٹیں لیتا ہوا مدینہ النبی ﷺ میں داخل ہو گیا۔

جلوہ گاہ ناز کے پردوں کا اٹھنا یاد ہے
پھر ہوا کیا اور کیا دیکھا یہ کس کو ہوش ہے

اب جو ساتھی آگے بڑھنے لگے تو میں رُک گیا۔ انہیں تو یہاں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ سال بھر میں کئی کئی حاضریاں دیتے ہیں۔ میں کیا؟ میری بساط کیا؟ ایک مجموعہ فسق، مجھ میں یہ بال و پر کہاں سے آ گئے کہ اڑ کے یہاں چلا آیا؟ بہت ہمت کی، قدم اٹھتے ہی نہیں۔ ایک سیاہ کار کا رسول اللہ ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہونا بہت بڑی جسارت ہے۔ میں اس احد تک تو پہنچ گیا جہاں تک 161 ہجری میں توسیع ہوئی تھی، اس سے آگے حوصلہ مفقود تھا۔ ہاتف نے کہا رُکو نہیں، یہاں رُک گیا تو کہیں کا نہیں رہے گا۔ ستون ابولبابہؓ کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا کہ حضور ﷺ حجرۂ عائشہؓ میں فروکش ہیں۔ میں نے اپنے تئیں بندھا ہوا پایا۔ حضور ﷺ بلائیں تو آگے بڑھوں، اُن کی طرف سے بندش ڈھیلی نہ ہو گی تو ہلوں کا کیونکر؟ دل نے کہا بڑھ، نالائقوں کے نالائق۔ روسیاہ! جب تک اس در پر کھڑا نہ ہو گا یہ روسیاہی نہیں دھلے گی، یہ داغ نہیں مٹیں گے پاگل! اس سے مایوس ہوتا ہے جو مایوسیاں دور کرنے آئے ہیں۔ لاتقنطوا کا مژدہ کون لایا؟ وہی تو لائے تھے۔ اب نفس کا نخرہ دکھا رہا ہے۔ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ندامت کا غلبہ ہے، ہمت جواب دے گئی ہے۔ نفس کی فریب کاری تاکے؟ چشمے پر تشنگی مٹانے پہنچا ہے اور اب لب خشک کیے کھڑا ہے۔ بڑھ آگے اور کھڑا ہو جا ان کے سامنے جو ہر جہان کے لیے رحمت ہیں۔ اُن کا خزانہ کھلا ہے، جھولی بھر، دونوں ہاتھوں سے بھر، صبح شام بھر، یہاں سے ہر شخص کو خلعت فاخرہ ملتی ہے۔ کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔ یہ رحمتہ اللعالمین کا دربار ہے۔ سورج کالے گورے پر یکساں چمکتا ہے۔ ہوا گنہگاروں کے لیے رُک نہیں جاتی، وہ سب کے لیے مشام جان ہے، خوشبو پھیلنے کے لیے ہے۔ چشمے کسی کے لیے اپنے سوتے نہیں موڑتے، وہ سب کے لیے رواں دواں ہیں۔ لوگ آتے اور تشنگیاں مٹا کے چلے جاتے ہیں۔ آب رواں نے کبھی کسی تشنہ لب سے اس کی ذات پات نہیں پوچھی، ہمیشہ ظروف بھر دیے ہیں۔

آخر وہاں گیا جہاں پہنچنے کے لیے آیا تھا...... روضہ مبارک کے روبرو،

الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ
الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ
الصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ

تین بیضوی جھروکوں میں پہلا جھروکا سرورِ کونین ﷺ کا ہے، دوسرا ابوبکرؓ کا، تیسرا عمر فاروقؓ کا۔

جانے کتنی دیر گم سم کھڑا رہا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انسانوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور سب اشکبار ہیں۔ اس حد تک تحیر ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی آگاہ نہیں، لوگ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ پہرے دار کھڑے ہیں، راستہ بن رہا ہے، خلقت نکل رہی اور دعائیں لٹ رہی ہیں۔ شمع روشن ہے، پتنگے جمع

ہیں، گنتے ہی نہیں بڑھتے چلے جاتے اور لو میں کٹتے جارہے ہیں۔ دعائیں، ہر اور ہر آرزو ختم ہوگئیں۔ سلام و درود نذر ہوتے رہے۔ ۔ مزار جو مواجہ پر تھا، ہر آن بڑھتا گیا۔ ادب کی آخری حد، عشق کا منتہی، حسن کی جولاں گاہ! بالا تک عرش الٰہی سے آرہے اور سلام کے



موتی نذر کررہے ہیں۔

میں نے باب توبہ کی طرف ایک تخلیہ میں نشست جمائی اور روضہ اقدس کی طرف ٹکٹکی باندھ کے درود پڑھتا اور سلام بھیجتا رہا۔ عجب عالم محویت تھا، قرن اول کو لوٹ گیا...... مدینہ میں ایک غلغلہ مچا ہوا ہے۔ تمام شہر نکل پڑا ہے۔ لوگ پو پھٹنے سے پہلے مرحلہ سے باہر کھڑے دوپہر تک انتظار کرتے ہیں لیکن جس کا انتظار ہے وہ نہیں آرہا۔ خبر عام ہے کہ وہ آرہے ہیں، مکہ سے روانہ ہوچکے ہیں۔ مسافر ابھی تک نہیں پہنچا۔ پھر ایک دن وہ آ گیا کہ تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔ انصار ہتھیاروں سے سج سج کر گھروں سے نکلے اور مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا کی آبادی میں خیر مقدم کو پہنچ گئے۔ حضور ﷺ نے عمرو بن عوف کے خاندان میں کلثوم بن الہدم کے گھر کو شرف میزبانی بخشا۔ حضور ﷺ کے علاوہ صحابہؓ جو پہلے آچکے تھے وہ بھی انہی کے مہمان تھے۔

حضور ﷺ نے عبوری قیام کے دنوں میں حضرت کلثومؓ سے زمین لے کر اس کی نیو اٹھائی۔ خود پتھر اٹھاتے اور بچھاتے رہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہم کافی ہیں لیکن حضور ﷺ اللہ کے اس گھر کو بنانے میں منہمک رہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ مزدوروں کی طرح تھکن مٹانے کو اشعار پڑھتے...... اور حضور ﷺ ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملائے جاتے۔

(وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا اور رات کو جاگتا ہے)۔

اب قافلہ مدینہ کی طرف آرہا ہے۔ محلہ بنی سالم آ گیا۔ جمعہ کی نماز کا وقت ہے۔ سب سے پہلے نماز جمعہ ادا کی جارہی اور سب سے پہلا خطبہ نماز پڑھا جارہا ہے۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ لوگ کھڑے ہیں۔ ہر قبیلہ سامنے آ آ کر عرض کررہا ہے۔ حضور ﷺ یہ گھر آپ ﷺ کا ہے، یہ مال آپ ﷺ کا ہے، یہ جان آپ ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ محبت کا اظہار فرماتے، دعائے خیر دیتے شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیجیے اب رحمتہ اللعالمین ﷺ کا جلوس شہر میں ہے۔

معصوم بچیاں دف بجا بجا کر گا رہی ہیں
ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں
محمد ﷺ کیا اچھا ہمسایہ ہے

خوش نصیب ہوائے بچیو کہ محمد ﷺ عربی کو خوش آمدید کہہ رہی ہو! تم نے اپنی جنت خرید لی۔ یہ بول جو تمہارے معصوم ہونٹوں سے نکلے ہیں، ابدی ہوگئے ہیں۔ انہیں ہر دور کی بیٹیاں دہراتی رہیں گی اور صبح قیامت تک گونجتے رہیں گے۔ تمہاری آوازیں اس دن کی سب سے اچھی آوازیں ہیں۔ ان میں شہد، مکھن اور دودھ گھلا ہوا ہے۔ یہ سہ آتشہ ہیں۔ صبا اٹھا کے لیے جارہی ہے کہ ساری کائنات کے چمنوں کی شاخوں میں غنچوں کے رستے ان سے بھر دے اور چہچہاتے ہوئے طائروں میں لٹا دے اور دف کی دل کشی کتنی سحر آور ہے کہ فضا جوان ہوگئی ہے۔ کاش میں ہی وہ لمحہ ہوتا جو ان آوازوں کے لیے گوش برآواز تھا، وہ جھونکا ہوتا جو قدوم میمنت لزوم کو بوسہ دے کر گزر رہا تھا۔ نجار کی ان لڑکیوں کی نگاہ ہوتا جو چہرہ اقدس کے نور میں ڈوب کر جاوداں ہوگئی۔

جنت البقیع

اگلے روز نماز فجر پڑھ کر روضہ اطہر پر سلام عرض کیا۔ وہاں سے عباس ملک کے ہمراہ جنت البقیع گیا۔ حرم نبوی ﷺ کے مشرق کی جانب دو فرلانگ کے

فاصلے پر ہے۔
داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کے ایک کونے میں حضور ﷺ کی پھوپیوں، عاتکہ، صفیہ اور فاطمہؓ کے مزار ہیں۔ آگے بڑھیں تو دائیں طرف نو امہات المومنین محوِ خواب ہیں...... عائشہؓ، سودہؓ، زینبؓ، حفصہؓ، اُم المساکین ام سلمہؓ، جوریہؓ، اُم حبیبہؓ، اور صفیہؓ۔ ان کے ساتھ کی روش پر حضرت عقیلؓ، حضرت جعفر طیارؓ، امام مالکؒ، اور امام نافعؒ، آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے ایک طرف شہداء کے مزارات کا ٹکڑا ہے، سامنے حضور کے فرزند ابراہیم کی لحد ہے۔ اِدھر اُدھر عبدالرحمٰنؓ بن عوف، رقیہؓ بنت عثمانؓ، عثمانؓ بن مظعون، سعدؓ بن ابی وقاص، فاطمہؓ بنت اسد، عبداللہؓ بن عمرؓ، مالک الانصاریؓ، اسماعیل بن جعفر صادقؓ، کے مدفنوں کی ڈھیریاں ہیں۔ آخری نکڑ پر حضرت عثمانؓ کا مزار ہے۔ اس مزار سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ حلیمہ سعدیہؓ کی قبر ہے۔
امہات المومنین کے مزارات سے دس بارہ گز آگے ایک غیر کشیدہ مثلث ٹکڑی میں جو زیادہ سے زیادہ 5x3 گز کی ہوگی، چھ ڈھیریاں ہیں۔ اُن پر کوئی نشان نہیں۔ قبروں کی شکل ہے، سنگریزوں کا حاشیہ، سینہ پر کنکریاں، دائیں طرف بنتِ رسول پڑی ہیں۔ سامنے رسول ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ ہیں۔ حضرت عباسؓ کے جسد مبارک کی داہنی طرف امام حسنؓ، امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ لیٹے ہیں...... یہ ساری جگہ مسجد نبوی ﷺ میں واقع حضرت فاطمہؓ کے حجرے سے بھی چھوٹی ہے۔
اس کربلا میں چچا نگران ہیں، بچے ماں کی گود میں ہیں اور جو کربلا میں رہ گئے تھے ان کی جدائی کا حزن ماں کی قبر سے محسوس ہو رہا ہے۔ شوہر نجف اشرف میں اور باپ...... وہ سامنے کہ بیچ میں چند مکان حائل ہیں۔
دنیا والوں نے مرنے کے بعد بھی دیواریں کھینچ دی ہیں۔ گنبد خضریٰ کو اس رُخ سے دیکھیے، سوگوار معلوم ہو رہا اور اس ویرانی کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے...... اس کے ہونٹوں پر جنبش سی ہے۔
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

''فاطمہؓ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اس کو دکھ پہنچے گا مجھے بھی اذیت ہوگی۔'' (ارشاد نبوی ﷺ)
ماں کہتی ہے زین العابدین! میرے لخت جگر کے مہ پارے! باپ کہاں رہ گیا؟
زین العابدین کہتے ہیں دادی اماں پھوپی زینبؓ سے پوچھیں۔ وہ لٹی پٹی بے کجاوہ اونٹ پر آ رہی ہیں، ابا کا سر نیزے پر لٹک رہا ہے اور 72 سر مشایعت کر رہے ہیں۔ مدینہ میں کہرام بپا ہے۔ بنو ہاشم کی عورتیں بنت عقیل بن ابی طالبؓ کے جلو میں چلاتی ہوئی گھروں سے نکل آئی ہیں کہ محمد ﷺ کا گھرانا شام سے لٹ کر آ رہا ہے۔ وہ نوحہ کر رہی ہیں۔
کیا کہو گے جب نبی ﷺ تم سے سوال کریں گے۔
''کہ اے وہ جو سب سے آخری امت ہو، تم نے میری اولاد اور میرے خاندان سے میرے بعد کیا سلوک کیا؟ ان میں بعض قیدی ہیں اور بعض خون میں نہائے ہوئے ہیں۔''
بنتِ رسول کی لحد کے سامنے میں کوئی گھنٹہ بھر ساکت و صامت کھڑا رہا جیسے کوئی چیز گزر گئی ہو اور اس میں زندگی کے آثار مطلقاً نہ رہے ہوں۔ ملک عباس دیر تک دعائیں مانگتے رہے لیکن میں تھا کہ ''بے دست و پا'' کھڑا تھا۔ جب محویت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہوش رہے نہ حواس جیسے کوئی آہ نارسا منجمد ہو چکی ہو یا آنسوؤں کی طغیانی نہ رُک گئی ہو تو عباس ملک نے مجھے گم سم پا کر کہا:
آغا صاحب! فاتحہ پڑھیے۔
میں پوری طرح ہل چکا تھا۔ عباس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''آغا صاحب!'' اور میں کالنقش فی الحجر کی طرح تھا۔ انہوں نے جھنجوڑا...... فاتحہ پڑھیے۔ میں نے کہا: ''ملک صاحب! فاتحہ کس لیے؟ کیا انہیں ہمارے ہاتھوں کی احتیاج ہے؟ ہم کیا اور ہماری دعائے مغفرت کیا؟ ہم تو خود ان کے محتاج ہیں۔ ہماری مغفرتیں ان کی بدولت ہوں گی۔''
(''حجاز میں چودہ دن'' سے ماخوذ)



آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِمبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یو اے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے II 88-C فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

پہلی سچ بیانی

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر پڑھنے والوں کی خوشبو، اُن پاس محسوس ہوتی ہے

مجرم کون؟

سید ملازم حسین شیرازی

اُس محب وطن کی لازوال داستان، جس نے اولاد پر وطن کو ترجیح دی تھی

قانون نے اُسے پچیس سال کی سزا دی تھی۔ وہ عرصہ دس سال سے جیل میں قید کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے اٹھارہ سال کے نوجوان، نہایت خوبصورت بیٹے کا قتل کیا تھا۔ یہ قتل اس نے بارہ سال قبل کیا تھا۔ اپنی ہی بلڈنگ کے احاطے میں دیگر مکینوں اور چوکیداروں کے سامنے اپنے بیٹے کے سینے میں تین گولیاں اُتاری تھیں۔ جس نے اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ ارتکاب قتل کے بعد خود پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ قتل کے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ اور ریوالور پولیس کے حوالے کیا۔ دو سال مقدمہ چلتا رہا' وکیلوں کی بحث مباحثہ کے سامنے، ججوں کے سامنے، پریس کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا چونکہ اُس نے اقبال جرم کیا تھا۔ اور خود بحوالہ پولیس ہوا تھا۔ گواہان اور شہادتیں موجود تھیں۔ دن کا وقوعہ تھا لہٰذا عدالت نے اسے اپنے بیٹے کے قتل کے جرم میں پچیس سال کی سزا دی۔

وہ کون تھا؟ وجہ قتل کیا تھی؟ اس کے سینے میں کیا راز دفن تھا؟ اُس نے اپنے لب کیوں سی لیے تھے؟

یہ واقعہ کراچی میں پیش آیا تھا۔ وہ دو سال کراچی جیل میں قید رہا پھر اُسے سندھ کے دور دراز ڈسٹرکٹ جیل میں منتقل کیا گیا وہ یہاں آٹھ سال سے قید تھا۔ اس کی عمر 55 سال تھی۔ نورانی چہرہ، دراز قد، چاندی جیسے چمکتے سفید گھنے بال اُس کی چال ڈھال اٹھنے بیٹھنے بات کرنے میں وقار اور تمکنت تھی۔ وہ وجیہہ اور پر وقار شخص تھا۔ اُس کی باتوں میں مٹھاس، اس کی طبیعت میں نفاست تھی۔ اس لیے جیل میں وہ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے نمٹاتا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں اس کی کبھی ملاقات نہ آئی تھی۔ کوئی اپنا غیر اُس سے ملنے نہ آیا تھا۔ وہ خاموشی اور صبر سے اپنے دن رات گزار رہا تھا۔

6 بجے صبح بیرک کے دروازے کھل جاتے۔ لنگر خانے سے بالٹیوں میں چائے آتی۔ ہر قیدی لین میں کھڑے اپنے برتنوں میں چائے اور آدھا نان لیتے۔ وہ بھی ناشتا لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ دوپہر اور رات کو بھی لنگر خانے سے سالن روٹی آتی۔ دوسرے قیدی سالن میں مزید گھی مسالے ڈال کر تڑکہ لگاتے لیکن اُسے ضرورت نہ تھی۔ جو بھی جیل سے کھانا آتا وہ بسم اللہ کر کے کھا لینے میں فرحت محسوس کرتا۔ اسی طرح دوسرے قیدیوں سے ملاقات میں آنے والے وافر مقدار میں پھل فروٹ، مٹھائیاں و دیگر لوازمات لے آتے۔ ہر قیدی اُسے یہ چیزیں پیش کرتا لیکن وہ

مہذب طریقے سے انکار کرتا۔
میں پچھلے ایک سال سے اسی جیل میں دو سال کی سزا کاٹ رہا تھا۔ میں نے کسی دوست پر اندھا اعتماد کیا۔ اس کی ضمانت کرائی تھی وہ خود تو مفرور ہو گیا اور مجھے اس ناکردہ جرم میں پھنسا گیا چونکہ میں ضامن تھا لہٰذا قانون نے مجھے دھرلیا۔
اس کا پورا نام سید عرفان رضا تھا۔ جیل ریکارڈ سے پتا چلتا تھا وہ ایک معزز وکیل اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ جرم اس نے کیوں کیا؟ بہت کوشش کی گئی تھی کہ وہ اس راز سے پردہ اٹھائے لیکن وہ دھیمے پن سے معذرت کرلیتا۔ جیل میں پانچ احاطے تھے ہر احاطے میں دو دو بیرکیں تھیں اور ہر بیرک میں 60/70 قیدی ہوتے تھے۔ ہر قیدی فرش سے 4 اونچی تھلی جسے کھڈی کہتے تھے اس پر بستر لگا کر سوتے تھے۔ اپنی ضروریات کی اشیا، اس کھڈی کے کنارے کارٹن یا ٹن کے ڈبے میں رکھتا تھا۔ عرفان صاحب کے ساتھ میری کھڈی تھی۔ ہم بیرک کے آخری کونے میں تھے جس کے بعد 3 عدد باتھ رومز، ٹائلٹ، وضو کے لیے نل وغیرہ تھے۔ صبح 6 بجے بیرک کے دروازے کھل جاتے چائے وغیرہ کے بعد کچھ قیدی اپنی اپنی مشقت پر نکل جاتے، کچھ وہیں پڑے سوتے رہتے، گیارہ سے ایک بجے، پھر گنتی بند ہو جاتی۔ ایک بجے ہمیں نکالا جاتا پانچ بجے شام دوبارہ صبح چھ بجے تک بند ہو جاتے۔
عرفان صاحب نہایت کم گو تھے۔ ہر قیدی اُن کی عزت کرتا تھا وہ دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ جج صاحبان کو پیش کی جانے والی درخواستیں



لکھتے۔ مختلف مقدمات اور کیسز کے پوائنٹس، مقدمات کی دفعات کی تشریحات وغیرہ بتاتے' انہیں کسی سے کسی قسم کا لالچ نہ تھا۔ وہ صرف انسانی ہمدردی کے طور پر قیدیوں کو جملہ قانونی امور پر مشورے دیتے۔ قیدی وکیلوں اور کچہریوں کے چکروں میں پریشان رہتے تھے۔ بھاری فیسیں ادا کرتے۔ لیکن انہیں دلی تسلی کے دو لفظ نہ کہتے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بہت مان سمان دیتے تھے۔ میں بھی اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ مختلف مواقع پر کوشش کی کہ وہ اس راز سے پردہ اٹھائیں۔ اپنے بارے میں بتائیں لیکن وہ نرمی سے بات ٹال دیتے۔

کچھ دنوں سے وہ کمزور کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت خاموش رہتے تھے انہیں میں جیل اسپتال لے جاتا۔ کئی مرتبہ خود ڈاکٹر انہیں دیکھنے آتے لیکن وہ دن بہ دن کمزور ہوتے گئے۔ بات چیت بہت تھوڑی کرتے تھے میں اُن کی صحت کے بارے میں فکر مند تھا۔

باہر کی دنیا سے کوئی آدمی نہ تھا جو ان کی ملاقات پر آتا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بارے میں بتائیں۔ وہ کون ہیں؟ کہاں سے تعلق ہے؟ کیا وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کو اپنے ہی ہاتھوں قتل کیا۔

آخر ایک دن میرے بے حد اصرار پر وہ راضی ہوئے۔ اس طرح گویا ہوئے۔

''بیٹا!'' نہایت نرمی سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں چراغ شب آخر ہوں۔ کب موت میری دہلیز پر آجائے۔ بیزاری، بیماری اور تنہائی کی عمر کے اسی حصے میں مزید برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس راز کو راز رکھوں۔ کبھی لب کشائی نہ کروں۔ لیکن اب میں خود بتانا چاہتا ہوں۔ میں کون ہوں؟ کیوں اپنے جان سے پیارے بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں قتل کیا۔ میں موت کے قریب ہوں اور مرتے وقت کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔'' میں نہایت دل جمعی اور وارفتگی کے ساتھ اُس کی باتیں سننے کے لیے بے تاب اور بے چین تھا۔

میرا نام سید عرفان رضا ہے۔ میرا تعلق صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کے دور دراز علاقے سے ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے والدین مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں بھی انہیں بہت چاہتا تھا اور ان کا بے حد فرماں بردار تھا۔ تعلیم کے لیے کراچی آ گیا۔ میں نے کراچی سے ایل ایل بی اور پھر ایل ایل ایم کیا۔ لاء کی آپرنٹس شپ سے پہلے چھ ماہ کے لیے ایران گیا۔

تہران میں ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ وہیں ایک ایرانی فیملی کے پاس Paying Guest ہو گیا۔ میرا قیام ان کے گھر کی بالائی منزل پر تھا۔ جہاں ایک فرنشڈ بیڈ روم، علیحدہ باتھ روم، چھوٹا سا کچن اور وسیع ٹیرس تھا۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا اُن کے ہاں سے کھاتا تھا اور لنچ اپنے آفس میں کرتا تھا۔ والدین سے باقاعدہ رابطہ رہتا تھا۔ سروس بہت اچھی تھی۔ آفس و گھر کا ماحول بہت بہتر تھا۔ زندگی سکون اور آرام سے گزر رہی تھی۔ اتوار یا فرصت کے شب و روز اکیلے سیر و تفریح میں گزارتا تھا۔ تہران و مختلف شہروں کی سیر و تفریح بہت اچھی لگتی تھی۔ انہی دنوں تہران کے علاوہ اصفہان، شیراز، مشہد، یزد، کرمان و دیگر بڑے اور اہم شہر دیکھ لیے تھے۔ تاریخی مقامات اور مقدس ہستیوں کے مزارات دل کو بہت سکون دیتے تھے۔

وہ چھٹی کا دن تھا پروگرام بنایا کہ آج سارا دن چھوٹے موٹے کاموں اور آرام سے گزاروں گا۔ موسم سرد تھا۔ باہر چمکیلی دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی موسم بہت سہانا تھا۔ باہر برآمدہ میں بیٹھا اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ہمارا مکان ایک صاف ستھری گلی میں تھا۔ گلی کے دائیں طرف دس مکانات اور اُن کے سامنے اتنی ہی تعداد میں خوبصورت مکانات تھے۔ ہمارے مکان کے سامنے بہت دیدہ زیب مکان تھا۔ جس میں ایرانی فیملی رہتی تھی۔ سربراہ کا مین مارکیٹ میں قالین کا شوروم تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ خوشحال اور صاحب حیثیت لوگ تھے۔ آتے جاتے سرِ راہ اُن کے سربراہ سے دعا سلام رہتی تھی۔ وہ پچاس، پچپن سال کے وجیہہ انسان تھے۔ ان کے گھر کے آگے دو، تین گاڑیاں پارک رہتی تھیں۔ اندر گیراج میں دو

گاڑیاں ہمہ وقت موجود رہتیں۔ اخبار پڑھتے ہوئے ناگہاں سامنے گھر پر نظر پڑی۔ دیکھا چھت پر ایک خوبصورت دوشیزہ ہاتھوں میں برش لیے گیلے بال سکھا رہی تھی۔ اُس کا سراپا دراز قد، شہابی رنگت، سیاہ چمکدار آنکھیں، شیشے کی طرح شفاف اور سانچے میں ڈھلا ہوا وجود چہرے سے چھلکتی معصومیت اور بانکپن، خوبصورتی اور معصومیت کا حسین امتزاج، ملکوتی حُسن، نوخیز حسن رعنائی، ایسی حسین وجمیل دوشیزہ میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔

میں اس وقت چوبیس، پچیس سال کا خوبصورت اور نہایت اچھی شکل وصورت کا حامل جوان تھا۔ طبیعت اور فطرت میں قدرت کی رعنائیوں کی چاشنی تھی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ عشق ومحبت میں کسی کی زُلفوں کا شکار ہوا یا کسی صنفِ نازک میں دلچسپی لی۔ اُسے دیکھا تو میں بے خود ہو گیا۔ وہ اپنے آرائشِ گیسو میں مصروف تھی۔ اُسے پتا نہ تھا کہ تھوڑے سے فاصلے پر وہ کسی کی نظروں کا محور تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چھت سے اُتر گئی اور میرے دل کی دھڑکنیں اپنے ساتھ لے گئی۔ سارا دن میں بے چین رہا اس کے بارے میں سوچتا بار بار میری نظریں اُس کی چھت پر اٹھ رہی تھیں۔ لیکن پھر وہ نظر نہ آئی۔

دوسرے دن صبح وہ چھت پر کسی کام سے آتی نظر آئی۔ اُس نے کالج کی یونیفارم پہن رکھی تھی اور کالج جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ پتا لگاؤں گا کہ وہ کس کالج جاتی ہے۔ وہ گھر سے نکلی چند سہیلیاں اور بھی آ گئی تھیں۔ وہ ان کے جلو میں روزانہ ہوئی۔ میں چند قدموں کے فاصلے پر اُس کے پیچھے پیچھے روانہ تھا۔ تین چار فرلانگ کے فاصلے پر کالج آ گیا۔ وہ ہنستی مسکراتی تمکنت اور وقار کے ساتھ کالج پہنچی تھی۔ میں نے چوکیدار سے معلومات لیں کہ کالج کس وقت بند ہوتا ہے۔ بتایا گیا کہ دو بجے چھٹی ہوتی ہے۔ آفس چلا گیا اور ڈیڑھ بجے اسی کالج کے دروازے پر موجود تھا۔ شرم بھی آ رہی تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ زندگی میں بھی ایسی حرکت نہ کی تھی لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ یہ بھی حقیقت کہ میری نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔ ٹھیک دو بجے وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں خراماں خراماں چلتی نظر آ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا اس کا گھر اور میرا گھر آمنے سامنے تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہوتی اور پھر یہ سلسلہ کئی روز چلتا رہا۔

ایک دن میں اسی روش پر گامزن تھا۔ کالج سے واپسی پر تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنے گھر داخل ہوئی۔ میں بھی اپنے گھر داخل ہونا چاہتا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''رُک جاؤ.....'' پلٹ کر دیکھا تو اُس کا والد معہ اپنے دو بیٹوں کے جن کے ہاتھوں میں خنجر نما تلواریں تھیں غصے کے عالم میں تھا۔

میں نے دو قدم بڑھاتے ہوئے ادب سے سلام کیا سرسری جائزہ لیا۔ بزرگ کے پیچھے بیٹے کھڑے تھے اور ان کے پیچھے پردے کی اوٹ میں خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی بیٹی کو میرے تعاقب کا پتا چل گیا تھا اور اس صورتِ حال سے گھر والوں کو آگاہ کیا۔ اسی سلسلے میں وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ بزرگ گویا ہوئے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں سے تعلق ہے؟ اور کیا کرتے ہو؟'' میں نے ادب، احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا نام سید عرفان رضا ہے۔ پاکستان سے تعلق ہے، اور یہاں ایک کمپنی میں 6 ماہ کے کنٹریکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ تین ماہ گزر گئے ہیں اور باقی تین ماہ رہ گئے ہیں۔''

اُن کے بیٹے بدستور مجھے خونخوار اور تیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بزرگ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارتے ہوئے پوچھا۔

''میری بیٹی کا تعاقب کیوں کرتے ہو؟ کئی دن سے تم یہ تماشا کر رہے ہو۔ ہمیں رسوا کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں پتا ہے ان اوچھی حرکات کا انجام کیا ہوگا۔'' غصے سے ایک ساتھ کئی سوال کر رہے تھے۔ میں حقیقتاً گھبرا رہا تھا کہ جسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں آباد رکھا اس

نے قدر نہ کی اور اپنے اہل خانہ کو میری شکایت کردی۔ دکھ اس کے گھر والوں کو سلوک یا ناراضگی کا نہ تھا بلکہ اپنے دل کی دنیا لٹنے اور اس کی بے رخی کا تھا۔ میں نے اپنی خودی، قوتِ ارادی اور نیک نیتی کا سہارا لیتے ہوئے بزرگ سے مخاطب ہوا۔

''محترم آپ کا کہنا درست ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں آپ کی بیٹی کا تعاقب۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ پیچھے سے بیٹوں نے تلواریں بلند کردیں۔'' باپ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا اور خاموش رہنے کو کہا۔ اور غور سے مجھے دیکھنے لگے۔

''میرے محترم آپ کا کہنا بجا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نازیبا حرکات کا مرتکب رہا ہوں لیکن اپنی بیٹی سے پوچھیں کہ اس تمام عرصے میں، میں نے کبھی اس کا راستہ روکا، کوئی روک ٹوک کی۔ کوئی غلط حرکت کی۔ میں نے اس سے یا اس کی سہیلیوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مجھ سے کوئی بدتمیزی ہوئی، کوئی اوچھی حرکت کی۔'' میں دلیری اور خود اعتمادی کے ساتھ اُن سے مخاطب تھا۔

بزرگ نے پلٹ کر پیچھے پردے میں کھڑی بیٹی سے اشارتاً پوچھا! بیٹی نے اپنے سر کی جنبش سے بتایا کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں نے کوئی غلط قدم نہ اٹھایا۔ بزرگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر ایسا کیوں کرتے ہو! تمہاری ان حرکات کا مقصد کیا ہے؟ تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے نہایت دلیری اور جرأت سے کام لیتے ہوئے بے دھڑک کہا۔

''میرے محترم بزرگ اگر آپ اجازت دیں اور آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے دل کے نہاں خانے میں آباد تھی۔ میں اس کی محبت کا اسیر تھا۔ میری نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔

میری بات سنتے ہی اس کے بیٹوں نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے پیش قدمی کرنا چاہی وہ سخت طیش میں تھے لیکن ان کے والد نے انہیں روکا بلکہ ڈانٹ دیا۔ پھر وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ کچھ دیر بعد سوچتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''تم ایسا کرو آج شام سات بجے ہمارے گھر آؤ کچھ باتیں کریں گے۔'' میں نے حامی بھری اور ادب سے سلام کرتے ہوئے اپنے گھر داخل ہوا۔

سارا دن بے چینی اور مختلف سوچوں اور خیالات میں گزرا۔ وہ کیا باتیں کرنا چاہ رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے نقصان پہنچائیں بہر حال جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ چونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ مجھے کوئی ڈر یا خوف نہ تھا۔ احتیاطاً اپنے آفس کے دو دو دستوں جن کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ میں سات بجے ان کے گھر جاؤں گا۔ نو بجے اگر تم لوگوں سے رابطہ نہیں کیا تو حالات کی سنگینی سے آگاہی کر سکتے ہو۔

دوستوں نے بہت روکا کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے ان کے گھر نہیں جانا چاہیے۔ وہ کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے ہیں۔ میں ان کی تسلی کرائی اور واشگاف الفاظ میں بتایا کہ میں ضرور جاؤں گا جو بھی انجام ہو دیکھا جائے گا۔''

☆......☆......☆

وقت بے چینی اور اضطراب سے گزر رہا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا۔ شام دھیرے دھیرے چہار سو اپنے اندھیرے پھیلا رہی تھی۔ اور میرے فیصلے کی گھڑی قریب آ رہی تھی۔

میں نے مناسب کپڑے زیب تن کیے اور نہایت اعتماد سے نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اُن کے مین دروازے پر بیل بجا رہا تھا۔ اُن کے دو بیٹوں میں ایک بیٹا باہر آیا اور مجھے اپنے ساتھ اوطاق میں لے گیا۔

نہایت صاف ستھرا اور قرینے سے سجا کمرہ تھا۔ ایرانی قالین، مہین پردے، مہاگنی کا فرنیچر نہایت سلیقے سے آراستہ تھا۔ مجھے بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بزرگ تشریف لائے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں کہ نہ جانے کیا سلوک ہو۔ اندر سے قہوہ اور دیگر لوازمات لائے گئے۔ ان کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن اُن کے چہروں پر غصے کے آثار نہ تھے۔ دعا سلام کے بعد بزرگ نے پوچھا۔

''تمہارا خاندان کہاں ہے؟ اور تم گھر کے کتنے افراد ہو؟''

''جی...... میرے خاندان میں میرے والد اور والدہ صاحبہ ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اور ہم لوگ پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک خوبصورت اور دریا کنارے آباد شہر میں مقیم ہیں۔''

''یہاں ایران میں کیا کرتے ہو؟'' نہایت سعادت مندی سے عرض کیا۔

''جی ایک بین الاقوامی فرم میں چھ ماہ کے کنٹریکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ تین ماہ ہوگئے باقی تین ماہ پورے کر کے اپنے دیش چلا ؤں گا۔''

''تو تم ہماری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' بزرگ نے پوچھا۔ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے ادب سے جواب دیا۔

''جی ہاں! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں۔''

جب ہماری گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا پردے پیچھے گھر کی خواتین کھڑی تھیں جو بغور صورتِ حال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تھوڑا آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے! کیا تم اس سلسلے میں گھر والوں کو ایران بلانا چاہو گے۔ تاکہ بات چیت طے کر کے پروگرام کو آخری شکل دی جائے۔''

میں بہت خوش و خرم اور نہال تھا۔ جواباً کہا کہ جب بھی حکم کریں۔ میرے والد اور والدہ صاحبہ ضرور آئیں گے۔''

''تم اس سلسلے میں تیاری کرو!'' اور یوں انہوں نے مجھے اپنی دامادی میں قبول کیا۔ شرم و حیا اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں زیادہ باتیں نہ کر سکتا تھا۔ پردے کے پیچھے کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ حرکات و سکنات دکھائی دے رہی تھیں، شاید وہاں سے رضا مندی کے آثار تھے۔

☆......☆......☆

پھر یوں ہوا کہ میں نے اپنے والدین کو ایران بلا لیا۔ ملاقاتیں ہوئیں۔ امور طے پائے مجھ سے زیادہ میرے والد اور والدہ خوش تھے۔

تین ماہ کے اندر شادی ہوگئی اور میں اپنی جان سے پیاری بیوی سردیا ناز کو کراچی لے آیا۔ میری سچائی، خلوص نیک نیتی اور دلیری نے اُن کے دل موہ لیے تھے۔ سردیا ناز کو میں نے حقیقتاً تلواروں کے سائے میں اپنی شریک حیات بنایا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ بہن بھائیوں، عزیز اقارب، دیش وطن، کلچر زبان، سب کچھ چھوڑ کر میری رفاقت میں آ گئی تھی۔

وقت خوشی اور سکون سے گزر رہا تھا، دن بھر کی مشقت اور کام کاج سے فارغ ہو کر سرِ شام کراچی کی شاہراہوں اور ریسٹورانٹس میں ہم رکاب ہوتے۔ اسے کراچی کے ساحل، ڈیفنس، کلفٹن، سینڈسپٹ، ہاکس بے، منوڑا بہت پسند تھے۔ وہ ان ساحلوں پر کھڑی دور بہت دور اپنے وطن کی ٹھنڈی ہواؤں کو محسوس کرتی۔ کبھی کبھی اسے تہران کی وہ گلی، کالج، مکان کی چھت اور میرا جنون اسے یاد آتے تو میرے شانوں پر اپنے بکھرے بال پھیلا دیتی۔

اس وقت کراچی پر سکون تھا' حالات خراب نہ تھے۔ وہ واقعی روشنیوں کا شہر تھا۔ لمبی لمبی سڑکوں پر اکیلے سفر کرنے میں کوئی ڈر خوف نہ تھا۔ ہر شخص بغیر کسی ڈر خوف کے اپنے اپنے کاموں میں مگن رہتا۔ دہشت گردی، فرقہ واریت، ٹارگٹ کلنگ نہ تھی۔ ڈر کے چوریاں خال خال ہوتے تھے۔ کراچی اس وقت امن کا گہوارہ تھا۔ مغرب کی طرف سے آتی ٹھنڈی ہوائیں دل کو لبھاتی تھیں۔

سردیا ناز جب میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر کی نرم اور ٹھنڈی ریت پر قدم بہ قدم ہوتی تو ہم دونوں لوگوں کی حسرت بھری نگاہوں کا مرکز ہوتے۔ میرے والدین فوت ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی ہم اپنے آبائی شہر جاتے۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد میرے اس دیس کو پھولوں کا شہر کہتے تھے۔ لوگ پُر خلوص اور بہت محبت کرنے والے تھے۔ وہ اس شہر کے باسیوں اور میرے رشتے داروں کی چاہتوں کی گرویدہ تھی۔ وہ وہاں کی خواتین کا مرکزِ نگاہ تھی۔

دو سال بعد میرا بیٹا علی رضا پیدا ہوا۔ وہ نہایت خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ وہ ہو بہو مشابہت میں اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہ ہماری امیدوں کا مرکز تھا۔ وہ نہایت

سعادت مند، فرماں بردار تھا۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ علی اب اٹھارہ سال کا کڑیل جوان تھا۔ کالج کے فائنل ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ پڑھائی میں ہمیشہ وہ اچھی پوزیشن لیتا۔ اساتذہ اس سے مطمئن اور بہت خوش تھے۔ وہ حقیقتاً سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔

ہمارا فلیٹ کراچی کے ایک پوش اور خوبصورت علاقے میں دوسری منزل پر تھا۔ نیچے مختلف دکانیں تھیں۔ جن میں ریسٹورنٹ جنرل اسٹور کیمسٹ، ڈرگسٹ وغیرہ شامل تھیں۔ ایک دن علی اپنی ماں کے ساتھ نیچے کیمسٹ کی دکان پر دوائی لینے گیا۔ دکان میں تین، چار گاہک تھے۔

کراچی میں ان دنوں حالات بہت خراب ہورہے تھے۔ چوریاں، ڈاکے اور دوسری مختلف وارداتیں عام تھیں۔ علی نے دوائی کی پرچی دکان دار کو دی۔ دکان دار دوا نکالنے لگا کہ اسی اثناء میں دو ڈاکو ہاتھوں میں ریوالور لیے داخل ہوئے سب کو ہینڈز اپ کیا۔ اُن کا تیسرا ساتھی باہر موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔

انہوں نے کیش سمیٹنا شروع کیا۔ نہایت بے دردی اور سفاکی سے عورتوں کے ہاتھوں اور کانوں سے زیورات اُتارنے لگے۔ وہاں موجود دکاندار اور خواتین نے بس وپیش اور شور مچانے کی کوشش کی تو ان ظالموں نے فائرنگ شروع کردی اور تو بچ گئے لیکن میری بیوی علی کی ماں اُن کی فائرنگ کی زد میں آگئی۔ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔ وہ بھاگ گئے۔

علی بہت پریشان تھا۔ اس کے اوسان خطا تھے۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ اس کی ماں مرنے والی تھی۔ مدد کے لیے آوازیں دے رہا تھا۔ دکانیں بند ہوگئیں۔ باہر موجود پولیس بھاگ گئی۔ ٹیکسی رکشے غائب تھے۔ علی کے ہاتھوں میں سسکتی، بلکتی، تڑپتی ماں کی لاش تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ منت سماجت کررہا تھا۔ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

''خدا کے لیے میری ماں کو اسپتال پہنچادو۔ لیکن وہاں ویرانی تھی۔ کہیں سے مدد نہ آرہی تھی اور یوں میری بیوی علی کے ہاتھوں میں تڑپتی مچلتی دم توڑ گئی۔ وہ مرگئی۔

نیم وا آنکھوں سے میرا انتظار کرتے ہمیشہ کے لیے سوچکی تھی۔

اس کی لاش کو گھر لایا گیا۔ علی اس کے سرہانے حسرت وغم اور صدمے سے نڈھال نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ میں اس وقت شہر سے دور تھا۔ مجھے اطلاع ملی تو میری دنیا لٹ چکی تھی۔ میری بیوی مرگئی تھی۔ کبھی بیوی کی لاش کو دیکھتا کبھی اپنے بیٹے کی حسرت ویاس سے محو صورت کو دیکھتا۔ میں اس وقت خود ذہنی وقلبی اذیت میں ڈوبا تھا۔

بیوی کی تجہیز وتکفین کی گئی اور پھر علی ہمیشہ غمزدہ اور خاموش خاموش رہنے لگا۔ اسے ماں سے بہت زیادہ پیار تھا۔ اس کی موت نے دنیا سے اس کا دل اچاٹ کردیا تھا۔ کالج، تعلیم سب چھوڑ چکا تھا۔ ہر وقت گھر میں چپ چاپ اور اُداس رہنے لگا۔ کبھی کبھی گھر سے دور کسی مدرسے میں جانے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے دوبارہ زندگی کی طرف راغب کروں لیکن اس کی خاموشی نے مجھے توڑ دیا تھا۔ ہم باپ بیٹا دونوں فلیٹ میں دیواروں کو تکتے رہتے وہ اپنی ماں کو کھو چکا تھا۔ میں اپنی جان سے پیاری بیوی اور بیٹے کی حالتِ زار پر صدمے سے دوچار تھا۔ علی نے پانچ وقت نمازیں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کردیں۔ ہر وقت مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں لاتا اور پڑھتا تھا۔

☆☆............☆☆

ایک صبح وہ نماز کے لیے نہ اٹھا میں اسے اٹھانے اس کے بیڈ روم گیا۔ تو وہ فون پر کسی سے بات کررہا تھا علی۔

''فکر نہ کریں میں ٹھیک نو بجے پولیس لائن کے مین گیٹ سے تھوڑی دور پہلے موٹر سائیکل پر موجود رہوں گا۔''

دوسری طرف کون باتیں کر رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا...... میں نہ سُن سکتا تھا۔ علی کہہ رہا تھا۔

’’جی فکر نہ کریں۔ میں موٹر سائیکل چھوڑ دوں گا۔ جی جی، میں سفید کرولا گاڑی جانتا ہوں۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گا۔ فکر نہ کریں ساری کارروائی پندرہ منٹ میں مکمل ہوگی۔ مین گیٹ سے داخل کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔‘‘

اُن کی باتیں میری سمجھ میں نہ آ رہی تھیں لیکن اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کوئی غیر قانونی غیر انسانی حرکت کرنا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ اسے استعمال کر رہے تھے۔ میرے پیروں سے زمین نکل گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

میرا علی کہاں جا رہا ہے۔ میں اضطرابی حالت میں اس سے ہمکلام تھا۔

’’علی...... یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟‘‘ میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

’’فکر نہ کریں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ غم کے بادل چھٹنے والے ہیں۔ میری ماں میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اُن کی بانہوں میں سونا چاہتا ہوں۔ پھر پاپا ہم آپ کو بلا لیں گے۔ ہم سب ہمیشہ کے لیے اکٹھے رہیں گے۔‘‘

’’علی یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کارروائی کرنا چاہتے ہو؟‘‘

’’علی، پاپا! میں نے کہا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے جانے دیں میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔‘‘

اب میں سمجھا، میرا بیٹا کسی کے ہاتھوں کھلونا بن رہا تھا۔ وہ پولیس لائن میں دھماکہ کرنا چاہتا تھا۔ خود کو اڑا کر بیسیوں لوگوں کو مارنا چاہتا تھا۔ موٹر سائیکل سے اُتر کر گاڑی میں سوار ہو کر اُسے جیکٹ (بارودی) پہنائی جاتی۔ پھر مین گیٹ سے داخل کروا کر اُس سے دھماکہ کروانا تھا۔ جہاں آج پولیس کی بھرتی ہو رہی تھی اور سیکڑوں اُمیدوار جمع تھے۔ میرے اوپر غم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ میں ابھی اپنی بیوی کی جدائی کے صدمے سے نہ سنبھل سکا تھا کہ میرا اٹھارہ سالہ بیٹا آج خود موت کے منہ میں جا رہا تھا بلکہ اور بے

گناہوں کی اموات کا ذمہ دار بن رہا تھا۔
''علی تم پاگل ہو گئے ہو...... غلط راہوں پر گامزن ہو، کون لوگ ہیں جو تمہاری پشت پناہی کر رہے ہیں۔''
''ہاں پاپا...... میں یہ سب کروں گا۔ وہ لوگ میرے ماں کے قاتل ہیں۔ جب میں رو رہا تھا۔ مدد کے لیے آہ و بکا کر رہا تھا۔ کوئی میری مدد کو نہ آیا۔ دکان سے اسپتال تھوڑی دور تھا۔ میری ماں پہنچا دی جاتی تو وہ بچ سکتی تھی۔ لیکن ان ظالموں نے میری مدد نہ کی۔ یہ حرکت انسان نہیں جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' علی کیا کہہ رہا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔
''علی خدا کے لیے اُن گمراہ کن خیالات اور اقدام سے باز آؤ۔ یہ غلط بہت غلط ہے۔ تم خود غرض ہو، پاگل ہو، اپنی ماں کا بدلہ معصوم لوگوں کی جانوں سے لینا چاہتے ہو۔ تمہیں مذہب، اخلاق، انسانیت اجازت نہیں دیتے کہ بربریت کا یہ کھیل کھیلو۔''
''پاپا میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ آج میں کسی کی نہ سنوں گا۔''
علی یہ کہتے ہوئے اور مجھے ہٹاتے ہوئے تیز قدموں سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے اُتر کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکالا۔ اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں سامنے آ گیا۔ ہاتھوں میں ریوالور تھا۔ میں بلک رہا تھا چیخ رہا تھا۔
لوگ فلیٹوں سے باہر نکل آئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بیٹے پر ریوالور تانے باپ سامنے کھڑا تھا۔ لوگ دم بخود تھے۔ جب علی اسٹارٹ کر کے جانے لگا تو میں پھر چیخا۔
''رُک جاؤ! خدا اور رسول ﷺ کے لیے رُک جاؤ۔'' مگر وہ نہ مانا، ایک طرف بیٹا تھا، دوسری طرف معصوم اور بے گناہ لوگوں کی زندگیاں تھیں......
جب علی نہ مانا اور جانے لگا تو میں نے آنکھیں بند کر کے دو گولیاں اُس کے سینے میں اُتار دیں......

پہلی گولی پر وہ جھک گیا۔ دوسری گولی پر آہستہ آہستہ سانس لیتا وہ جھولنے لگا اور پھر میرے سامنے میرا اٹھارہ سال کا کڑیل جوان بیٹا دم توڑ چکا بھی تھا۔ علی مر گیا تھا۔ اس کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ میں بھی صدمے سے گنگ فرش پر پڑا تھا۔
تھانے، کچہریاں، مقدمے، وکلاء میں سنتا رہا۔ زبان سی لی تھی۔ چونکہ میں نے اقبال جرم کیا تھا۔ لہٰذا پچیس سال کی سزا دی گئی۔ مختلف جیلوں میں رہا۔ راز کو سینے میں دفن کر دیا۔ آج پہلی مرتبہ اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہوں اس لیے کہ موت چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی بلا رہی ہے۔ نہ جانے کب یہ دنیا چھوڑنی پڑ جائے۔''
میں یہ داستان سُن کر دم بخود تھا۔ میں نے آخر میں ان سے سوال کیا۔
''انکل بہت افسوس ہوا لیکن اسے مارنے کی بجائے پولیس کے حوالے بھی تو کر سکتے تھے۔ کیونکہ علی نے کارروائی تو نہ کی تھی۔''
''بیٹے میں خود وکیل ہوں۔ قانون موشگافیوں سے باخبر ہوں۔ تفتیش مقدمے کی تیاری، عدلیہ کے فیصلے، سب جانتا ہوں۔ پولیس کے حوالے کرنے کے بعد کیا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ تین یا چار سال دہشت گردی دفعہ میں سزا ہوتی، دہشت گردی بیرکوں A.T.C میں رہتا۔ کیا وہاں سے نکل کر وہ نیک، اچھے چال چلن کو اپناتا؟ جرم کی دنیا میں داخلہ تو آسان ہے لیکن وہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ بیٹے میری یہ خواہش ہے اگر پوری کرو گے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔ مجھے اپنی بیوی اور بیٹے کی قبروں کے ساتھ میوہ شاہ کراچی کے قبرستان میں دفن کرا دینا تاکہ ہم سکون سے سو جائیں۔''
اور پھر سات روز بعد سید عرفان رضا مر گیا۔ اس کی خواہش میرے والدین نے پوری کر دی تھی۔ آج بھی گھنے درخت کی چھاؤں میں تین قبریں موجود ہیں۔ وہ تینوں اپنی حسرتوں اور ارمانوں کی شامِ غریباں کو سینے سے لگائے منوں مٹی تلے دفن ہیں۔

☆☆......☆☆

واری



محمد سلیم اختر

محبت کرنے والوں کے دلوں میں واری اور بارو کی داستان محبت آج بھی زندہ ہے

امیر علی کا تعلق ایک شکست خوردہ شاہی خاندان سے تھا اور وہ راجپوت کہلاتے تھے۔ امیر علی کئی ایکڑ جائیداد کا مالک تھا۔ اس نے ایک بھرپور اور پُرآسائش زندگی گزاری تھی۔ وہ مذہبی شخص تھا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرتا تھا۔ مگر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اگر وقت ایک جیسی ہی چال چلتا رہے تو پھر یہ اپنی قدر و منزلت ہی کھو دے۔ وقت کی اسی مسلسل رواں دواں دوڑ میں کئی بستیاں ایسے اُجڑ گئیں کہ پھر ڈھونڈنے سے بھی اُن کا نشان نہیں ملا۔ اس دوڑ نے کئی شہنشاہوں کو گداگر بنادیا۔ اور کئی بےنواؤں کو نوا عطا کردی۔

شاہی خاندان کو شکست ہوئی تو امیر علی کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ اس کو مجبوراً اپنے علاقے سے ہجرت کرنی پڑی اور لاہور کے نواح میں آ کر آباد ہو گیا۔ اس کے خاندان کے کچھ اور گھرانے بھی اس کے ہمراہ تھے۔

جب پاکستان بنا تو اس کا خاندان خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس دوران امیر علی کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے بیٹے کبیر علی نے خاندان کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ اپنے باپ ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ چند سال بیت گئے۔ تو ان کا گاؤں ایک سرکاری پراجیکٹ بنانے کی حدود میں آ گیا۔ مجبوراً ان کو وہ گاؤں چھوڑنا پڑا۔ حکومت کی جانب سے جو رقم ملی۔ وہ رقم وصول کر کے انہوں نے لاہور چھوڑا اور گجرات کے علاقے میں دریائے چناب کے قریب زمین خریدی اور وہاں اپنی رہائش کا بندوبست کرلیا۔ انہوں نے مویشی بھی رکھ لیے تھے۔ یوں ان کی گزر بسر اچھی ہونے لگی تھی۔

کبیر علی ہی اپنے خاندان کا سربراہ اور کرتا دھرتا تھا۔ اس کی ماں اور بیوی مذہبی لگاؤ رکھتی تھیں۔ اور نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ اس قبیلے والوں کی بدقسمتی کہ ستر کی دہائی میں ملک میں سیلاب آیا تھا۔ اس سیلاب میں ان کا گاؤں دریا بُرد ہو گیا۔ مال مویشی پانی میں بہہ گئے۔ کئی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔ اتنے بڑے نقصان نے ان لوگوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر انہیں کہیں سے بھی اتنی مالی مدد نہ ملی کہ وہ دوبارہ اپنی بستی بسا سکیں۔ سب لوگ بددل سے ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ کہیں پر مستقل قیام نہیں کریں گے۔ بلکہ بستی بستی گھوم کر وہ اپنی زندگی گزار دیں گے۔

وقت نے اُن کو گداگر بنادیا اور وہ خانہ بدوش بن گئے۔ وہ جہاں بھی جاتے جھگی بنا کر اس میں رہتے۔ اس لیے وہ جھگی نشین بھی کہلانے لگے۔ وہ چھ ماہ کسی سرد

علاقے میں گزارتے اور چھ ماہ کسی گرم علاقے میں۔ ان کی عادات واطوار بھی جھگی نشینوں کے جیسے ہی ہو گئے۔ اب کوئی ان کو پہچان اور سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ یہ راجپوت خاندان سے ہیں۔ ظالم اور بے درد وقت نے ان سے ان کی آن اور پہچان چھین لی۔ اور وہ بستی بستی قریہ قریہ گھومنے لگے۔

سردیوں کا موسم وہ ضلع جہلم کی مغربی سمت میں ایک گاؤں کے قریب گزارتے تھے۔ گاؤں کا نمبردار رحیم

تھیں۔ امیر علی کی پڑپوتیوں کو دینی اور دنیاوی دونوں علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ دینی علم تو وہ حاصل کر ہی رہی تھیں۔ مگر دنیاوی علم حاصل کرنا ان کے لیے مشکل تھا کیونکہ ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ جو نہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنے تئیں کوشش کرتی رہتی تھیں۔

☆......☆......☆

گاؤں کا سب سے اچھا اور شریف گھرانہ رحیم خان کا ہی تھا۔ مگر اس کا چچا زاد سہراب خان رحیم خان سے



خان ایک خدا ترس انسان تھا۔ گاؤں کے اردگرد اس کی بہت ساری زمین تھی۔ خانہ بدوش رحیم خان کی اجازت سے گاؤں سے باہر اُس کی زمین پر ڈیرہ ڈالتے تھے۔ رحیم خان کو ان سے ہمدردی تھی اور ان کا بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ وہ لوگ بڑے ہی غیرت مند تھے اور ان میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مرد اور عورتیں سب نماز روزے کے پابند تھے۔ ان کی عورتیں اور بچیاں دینی تعلیم کے سلسلے میں امام مسجد کی بیوی کے پاس آتی تھیں۔ ان میں امیر علی کے خاندان کی عورتیں بھی شامل

مختلف تھا۔ گاؤں میں سب سے زیادہ جائیداد سہراب خان کی تھی۔ اس لیے اسے اور اس کے خاندان کو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دولت کی فراوانی نے اس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ غریبوں کو تو انسان ہی نہ سمجھتا تھا۔ وہ لمحوں میں اپنے سے کمتر لوگوں کی پگڑی اچھال دیتا تھا۔ کون سی برائی تھی جو اس میں نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رحیم خان اور سہراب کی آپس میں نہ بنتی تھی۔

سہراب خان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جبار خان...... اس کا نام بگڑ کر بارو بن گیا تھا۔ بارو کی منگنی بچپن میں ہی رحیم

خان کی بیٹی جمیلہ سے کی گئی تھی۔ بارو اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا تو رحیم خان نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کردیا۔ یوں دونوں خاندانوں میں ناراضگی ہوگئی۔

ان دنوں بارو مکمل جوان تھا اور زمینوں کا سارا انتظام اس نے سنبھال لیا تھا کہ سہراب خان فوت ہوگیا۔ گاؤں والوں نے افسوس بھی کیا اور شکر کا سانس بھی لیا۔ مگر بارو نے ان کی ساری خوشیاں اور سکون خاک میں ملا دیا۔ وہ اپنی جوانی میں انتہائی تندخو، جابر اور ظالم کے روپ میں پروان چڑھا تھا۔ اس کا قد کاٹھ اور رنگ روپ خوب تھا۔ وہ ایک بھرپور اور وجیہہ جوان تھا۔ مگر اُس کے ساتھ ساتھ بدتمیز بھی تھا۔ اس کی شخصیت خاندانی وجاہت بارعب قد کاٹھ اور دبدبہ لوگوں پر دہشت طاری کردیتا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ وہ بہت بڑی زمین کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ چوڑی چکلی چھاتی، لمبی مونچھیں اور بھاری بھرکم جسم سے وہ سروں پر کچھ زیادہ ہی رعب بڑھ جاتا تھا۔

رحیم خان نے تو اس خاندان سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ کچھ اس کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ بیٹی کی شادی اس نے کردی تھی۔ گاؤں میں کوئی بھی خاندان بارو کو اپنا داماد بنانے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ بارو نے ساتھ والے گاؤں کے نمبردار کے گھر سے شادی کرلی۔ کیونکہ وہ لوگ بھی اس جیسی ذہنیت کے مالک تھے۔

بارو میں سب سے بڑی خاصی یہ تھی کہ وہ بہت ہی ظالم تھا اور معمولی بات پر لوگوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اس نے مختلف قسم کے چرند پرند پال رکھے تھے۔ جن میں اچھی نسل کے کتے، اونٹ، بیل، بھینس، گائیں اور پرندوں میں ہر طرح کے کبوتر، تیتر، بٹیر وغیرہ تھے۔ جن کی رکھوالی اس کے ملازمین کرتے تھے۔ گاؤں سے باہر دو ایکڑ رقبہ پر اس نے چڑیا گھر اور مویشی خانہ بنا رکھا تھا۔ جہاں رات کو اس کے دوست یار آتے۔ گپ شپ لگاتے تھے۔ بارو دن کو اپنے چوبارے کی چھت پر کھڑا ہوجاتا اور اپنے گھوڑے اونٹ وغیرہ کھلے چھوڑ دیتا۔ اور ان کو دیکھتا رہتا۔ وہ جس کسی کی فصل میں چلے جاتے۔ اس کے مالک کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ انہیں روکے اور اپنے کھیت سے نکال دے۔ اگر شامتِ اعمال سے کسی نے جرأت کرکے مویشیوں کو اپنے کھیت سے بھگانے کی کوشش کی تو بارو نے بارست پر کھڑے کھڑے اس کو گندی گالیاں دیتا رہتا۔ مگر کوئی اس کے منہ لگنا پسند نہ کرتا تھا۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ گندا انسان ہے۔ وہ ایک بگڑا ہوا جاگیردار تھا۔ جس کے مقابلے پر کوئی بھی نہ آتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ گھر میں ہر طرح سے خوشحالی اور سکون تھا کہ قدرت کی طرف سے پُرسکون سطح پر اچانک ایک طلاطم پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ طوفان کی شکل اختیار کرگیا۔

☆......☆......☆

خانہ بدوش اس بار دو سال بعد اس کے گاؤں آئے تھے۔ حسبِ معمول ان کی عورتیں اور بچیاں دینی تعلیم کے سلسلے میں امام صاحب کے گھر آنے لگیں۔ ان میں 'داری' بھی تھی۔ جو امیر علی کی پڑپوتی تھی۔ وہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ قرآنی تعلیم اور دینی مسائل جاننے کے لیے زیادہ وقت امام صاحب کی بیوی کے پاس گزارنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل میں خدا اور رسول ﷺ کی محبت اور دین سے وابستگی اس قدر گھر کرگئی کہ وہ ایامِ جوانی میں ہی نماز روزے اور اسلام کی شیدائی ہوگئی تھی۔

ایک دن بارو اپنے چوبارے پر کھڑا تھا کہ اس کی نظر داری پر پڑگئی اور وہ اس کے حسین سراپے میں کھو کر رہ گیا۔ اور وہ سچ مچ کا اس پر دل و جان سے فدا ہوگیا۔ اور وہ اٹھتے بیٹھتے داری داری کرنے لگا۔ داری چونکہ نیک اور پارسا تھی۔ اس لیے اس پر بارو کے عاشقانہ جذبات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بارو نے ہر طریقہ آزما لیا مگر داری اس کے ہاتھ نہ آئی۔

حتیٰ کہ یہ خبر داری کی والدہ تک پہنچ گئی یا بارو نے خود کسی طریقہ سے اس کی والدہ تک پہنچادی۔ بارو نے اس سلسلے میں جلد بازی نہ دکھائی اور احتیاط سے کام لیا۔ سوائے اُس ایک آدھ عورت کے جو بارو کے پیغامات پہنچاتی تھی۔ اسی وجہ سے گاؤں میں کسی اور کو اس واقعہ کا علم نہ ہوسکا۔ بارو نے پیغام دینے والی عورت کو سختی سے تاکید کی تھی کہ خبردار! کسی اور کو اس معاملہ کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

جب داری کی ماں تک بات پہنچی تو وہ پریشان سی

ہوگئی اور پھر وہ خود ہی چوہدری بارو سے ملنے چلی آئی اور اس سے کہا۔

''میں نے جو بات سنی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور اس میں داری کا کیا کردار ہے؟ کیا وہ بھی تمہیں چاہتی ہے؟''

''نہیں اس میں داری کا کوئی کردار نہیں ہے۔ نہ اس کو کچھ معلوم ہے۔ میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں۔ وہ میرے دل کو بھا گئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' بارو نے اس کی ماں کو صاف صاف دل کی بات بتادی۔ داری کی ماں نے اُس سے بے دھڑک ہو کر کہا۔

''چوہدری بارو! اس وقت ہم فقیر اور خانہ بدوش کہلاتے ہیں۔ وقت اور معاشرے نے ہمیں اپنے اصل مقام سے گرا دیا ہے۔ مگر ہم بھیک نہیں مانگتے۔ کسی کا دیا نہیں کھاتے۔ میرے دو بیٹے جوان ہیں۔ وہ محنت مزدوری کر کے رزق حلال کماتے اور کھاتے ہیں اور پھر ہم بھی خاندانی پس منظر رکھتے ہیں۔ اگر تم ہمیں زیادہ تنگ کرو گے تو ہم یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں گے۔ خدا کی زمین بہت ہی وسیع ہے۔ ہم عرصہ سے یہاں آ کر رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں افسوس ضرور ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم داری کا خیال دل سے نکال دو۔ ہمارا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا اور ویسے بھی ہم اپنے خاندان اور قبیلے سے باہر لڑکی کا رشتہ نہیں کرتے۔ اگر تم جور و جبر اور زبردستی کرو گے۔ کیونکہ تم ظالم جابر اور بگڑے ہوئے انسان ہو..... تو یہ تمہاری خام خیالی ہوگی۔ میرے بیٹوں کے بازوؤں میں اتنی طاقت اور غیرت ہے کہ وہ اپنی بہن کی طرف اٹھنے والا ہاتھ روک دیں اور اپنی بہن کی عزت پر قربان ہو جائیں...... کیونکہ یہ ہماری عزت اور غیرت کا سوال ہے۔''

نہ جانے بارو نے کیسے اس کی باتیں تحمل سے سنیں اور جذباتی نہ ہوا۔ وہ پھر اپنے انداز میں بولا۔

''میں داری کی ہر وہ قیمت ادا کر سکتا ہوں۔ جو تم مانگو گے۔ اگر تم سیدھی طرح نہ مانے تو میں اسے زبردستی چھین لوں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں داری کو بیوی بنا کر اسے گھر کی مالکن کا درجہ دوں گا۔ میں تم لوگوں کو کسی بھی صورت میں نقل مکانی نہیں کرنے دوں گا۔ آج سے تم لوگوں کی خفیہ نگرانی کی جائے گی۔ کسی خون خرابے سے بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ افہام و تفہیم سے معاملات طے کر لو۔ اس طرح تم لوگوں کی بھی عزت رہ جائے گی۔ اور میری آرزو بھی پوری ہو جائے گی..... میں تمہیں بتا دوں کہ میں کسی صورت بھی داری سے دست بردار نہیں ہوں گا۔''

بارو کی باتیں اور ارادے جان کر داری کی ماں پریشان ہوگئی اور حویلی سے لوٹ آئی۔ جب بارو کی بیوی کو پتا چلا کہ وہ خانہ بدوشوں کی لڑکی داری سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو اس نے بارو سے جھگڑا کیا اور رونے لگی۔ مگر اس کے آنسوؤں کا بارو پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اس نے اپنی بیوی کو دھمکی دی کہ وہ اس معاملے میں خاموش رہے۔ اور اگر اس نے اجازت نہ دی اور کوئی پھڈا ڈالا تو وہ اسے طلاق دے دے گا۔ اس کی بیوی ڈر گئی اور اپنا اعتراض واپس لے لیا۔ کیونکہ اس اکھڑ آدمی سے کسی قسم کی بھی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے سسرال والے بھی اپنی بیٹی کا گھر بسانے کی وجہ سے اتنے مجبور ہوگئے کہ انہوں نے بارو کی راہ میں دیوار بننے کی کوشش ہی نہ کی۔ انہوں نے بارو کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو بارو کو اور بھی شہ مل گئی۔

داری کی ماں نے ابھی اپنے بیٹوں کو کچھ نہ بتایا تھا اور وہ گاؤں کے دو معزز آدمیوں کے پاس گئی اور ان کو اپنی داستان سنا کر ان سے التجا کی کہ وہ چوہدری جبار (بارو) کو سمجھا بجھا کر اپنے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ان لوگوں نے یہ حالات سنے تو بہت فکر مند ہوئے کہ بارو کو کیسے باز رکھا جائے۔ وہ اس کے اکھڑ پن سے واقف تھے۔ انہوں نے بارو سے بات کرنے کی بجائے داری کی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ جلد از جلد داری کی شادی اپنے قبیلے میں کر دے۔ یا وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ مگر داری کی ماں ایسا کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ کیونکہ بارو نے دھمکی دی کہ وہ ان کو نقل مکانی نہیں کرنے دے گا۔

داری کی ماں کے اصرار پر ان لوگوں نے بارو سے بات کر کے اس کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنا اور ان لوگوں کا معاشرتی فرق دیکھتے ہوئے داری سے شادی

کرنے کا خیال چھوڑ دے۔ مگر بارو نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔

داری کی ماں جب ہر طرف سے مایوس ہوگئی تو اس نے ہار ماننا ہی بہتر جانا، نہ جانے اس نے اپنے بیٹوں کو کیسے راضی کیا کہ وہ بھی خاموش ہوگئے۔ داری کی ماں نے بارو سے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ داری سے گاؤں کی مسجد میں نکاح کرے گا اور اسے پہلی بیوی کے برابر درجہ دے گا اور اس کی اولاد برادری کی وارث ہوگی۔ اس نے اپنی بیٹی کی یقین دہانی خود کرائی کہ داری ایک تابع اور باوقار بیوی بن کر اس کی خدمت کرے گی اور اس کی پہلی بیوی کا احترام کرے گی۔

دونوں طرف کی یقین دہانیوں کے بعد داری اور بارو کا نکاح سادگی سے ہوا اور وہ اسے بیوی بنا کر حویلی میں لے آیا۔

☆......☆......☆

چند دن باتیں اور چہ مگوئیاں ہوتی رہیں اور پھر کچھ دن بعد ہر کوئی خود بخود خاموش ہوگیا۔ بارو نے اپنا عہد نبھایا کہ حویلی کے ہر فرد کو تاکید کی کہ وہ داری کا احترام کریں۔ ادھر داری نے کوئی بھی اوچھی حرکت نہ کی اور بارو کی پہلی بیوی کا خلوص دل سے احترام کیا۔ اس کی عزت کی۔ اس نے اپنے آپ کو شوہر کی خدمت، محبت اور نماز و عبادت میں مصروف کرلیا۔ وہ ہر ایک سے پُرخلوص طریقے سے اور عزت کے ساتھ پیش آتی تھی۔ جس وجہ سے اس کا مقام خود بخود ہی بلند ہوتا گیا۔

داری نے ایک کام خاص طور پر یہ کیا کہ اس نے بارو کو مجبور کیا کہ وہ غریب لوگوں پر ظلم اور گالی گلوچ نہ کیا کرے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں سجدہ ریز ہوکر اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے۔ نماز اور روزہ کی پابندی کرے۔

مگر جو لوگ بگڑے ہوئے ہوں وہ کسی کی کہاں سنتے ہیں۔ بہرحال گاڑی چلتی رہی اور حویلی میں ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوگیا اور اس کا سارا کریڈٹ داری کو جاتا تھا۔ ورنہ بارو کی پہلی بیوی اپنی چودھراہٹ کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ مگر داری تو اپنے شوہر کی چہیتی تھی۔ اسے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنی حیثیت یاد تھی کہ وہ خانہ بدوش ہے۔ اصل چوہدرانی تو بارو کی پہلی بیوی ہے۔ اس کی ماں اور بھائی بہت ہی غیرت مند تھے۔ وہ کبھی بلاوجہ حویلی میں نہیں آتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی کوئی چیز یا رقم وغیرہ مانگی تھی۔ وہ اپنی زندگی اسی انداز میں گزار رہے تھے جو داری کی شادی سے پہلے گزارتے تھے۔ اور نہ ہی کبھی انہوں نے کسی پر یہ رعب ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ بارو کے سالے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا مقام لوگوں کی نظروں میں اور بڑھ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی انہیں اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔

داری اب بھی مولوی صاحب کی بیگم سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ اس کی اُس نے بارو سے باقاعدہ اجازت لی تھی۔

داری بارو کے خاندانی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ اور بارو کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتی اور ان کی عزت بھی کرتی اور کبھی کبھی حالات کے مطابق غریبوں اور ناداروں کی مدد بھی کرتی۔ وہ بارو کے بیٹے عمر کے ساتھ بہت پیار کرتی اور اس کی ماں سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتی۔ جس وجہ سے عمر اس سے کافی مانوس ہوگیا تھا۔ اور اس کا نتیجہ بھی اچھا برآمد ہو رہا تھا کہ بارو کے مزاج میں کسی حد تک نرمی آگئی تھی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ چوہدری بارو کی محبت اور چاہت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ وہ داری سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرنے لگا۔ وہ داری کی کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔ مگر وہ اللہ کی بندی مناسب حد تک ہی اس کے کاموں اور مزاج میں مداخلت کرتی تھی۔ وہ اپنے حال میں مست رہ کر نماز روزہ اور دیگر حقوق العباد کی ادائیگی میں سرشار ہوکر وقت گزارتی تھی۔ اور یہ اس پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا۔

☆......☆......☆

یوں ہی دو سال بیت گئے۔ مگر داری کی گود ہری نہ ہوئی۔ بارو نے اس کا علاج بھی کرایا۔ مگر شاید اوپر والے کی یہی مرضی تھی۔ بارو...... داری کے بارے میں کچھ زیادہ ہی فکرمند رہنے لگا تھا۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو مسلسل نظر انداز کرنے لگا۔ تو اس نے بارو کی اس بے رخی کے غم کو

سینے سے لگالیا اور زندگی سے ناتا توڑ گئی۔
داری اس روز بہت روئی تھی۔ مگر وہ تو تقدیر کا فیصلہ تھا۔ داری نے عمر کو سینے سے لگالیا۔ اور اسے ماں کا اتنا پیار دیا کہ وہ اپنی مرحومہ ماں کو بھول گیا۔ داری نے عمر کو اپنی سگی اولاد جانا اور اپنے آپ کو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔
بارو...... داری کی طرف سے مطمئن تھا کیونکہ اس نے اس کے دل میں بھی نرمی کا بیج بو دیا تھا۔ مگر کچھ رشتہ دار باتیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بارو کی پہلی بیوی کی موت کی وجہ داری ہی ہے۔ کئی تو داری کو منحوس کہنے لگے تھے۔ مگر داری نے اپنے عمل اور کردار سے سب کے منہ بند کر دیے۔ کیونکہ وہ ایک پرہیز گار اور مذہبی عورت بن گئی تھی۔
اب تو حویلی کا ماحول بھی مذہبی ہو گیا تھا۔ بارو نے گالی گلوچ کرنا بند کر دیا تھا۔ اب کسی سے لڑائی جھگڑا بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اور اب وہ کبھی کبھار نماز بھی پڑھنے لگا تھا۔ داری مطمئن اور مسرور تھی کہ بارو اب راہِ راست پر آ رہا ہے۔
بارو میں ایک اور برائی بھی تھی کہ وہ افیون بھی کھاتا تھا۔ داری نے لاکھ کہا کہ وہ افیون کھانی چھوڑ دے۔ مگر اس نے داری کی یہ بات نہ مانی اور کہنے لگا۔
''میں تمہاری ہر بات مان لیتا ہوں۔ مگر افیون نہیں چھوڑ سکتا۔''
داری خاموش ہو گئی۔ اب اس نے حویلی کا سارا انتظام سنبھال لیا اور اسے احسن طریقے سے چلانے لگی۔ اب وہ دل کھول کر غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنے لگی۔ اس نے اپنے حسنِ اخلاق سے گاؤں والوں کے دل جیت لیے تھے۔ یوں ہی کئی برس بیت گئے۔

☆......☆......☆

ان کا بیٹا چوہدری عمر اب جوان ہو گیا تھا۔ اس نے بھی خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ داری کو وہ ماں ہی سمجھتا تھا۔ داری بھی اس پر صدقے واری جاتی تھی۔
پھر داری نے عمر کی پسند سے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ اور اپنے سارے ارمان پورے کیے۔ چوہدری بارو نے داری اور اس کے قبیلے والوں پر یہ بڑا احسان کیا کہ ان کو اپنی زمین پر ہی مستقل رہائش رکھنے کی اجازت دے دی۔ تو انہوں نے وہاں اب گھر بھی بنا لیے۔ داری کی ماں اس عرصہ میں فوت ہو گئی اور اس کے بھائیوں کی شادی بھی ہو گئی۔

☆......☆......☆

داری اور بارو اب بڑھاپے کی طرف گامزن تھے۔ داری کی اب ایک ہی خواہش تھی۔ وہ حج کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مگر بارو کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اسے حج کے ثواب اور اجر کا علم تھا۔ اس لیے یہ خواہش داری کے من میں ہی رہی۔ مگر وہ ایک نیک اور عبادت گزار خاتون ضرور بن گئی۔ ان ہی دنوں بارو زندگی سے ناتا توڑ گیا۔ بیوہ ہو جانے کے بعد داری نے حویلی سے قدم باہر نہ نکالا۔ وہ حویلی کی ہو کر رہ گئی اور اس نے اپنے آپ کو اللہ کو یاد کرنے اور اس کی عبادت میں غرق کر دیا۔ گاؤں کے لوگ اب اسے مائی فقیرنی کہنے لگے۔ داری سے اب صرف عورتیں اور چھوٹے بچے مل سکتے تھے۔ مردوں کو زنان خانے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ داری چھوٹے بچوں کو بیماری کی صورت میں اللہ کا کلام پڑھ کر دم کرتی۔ تو ان کو شفا مل جاتی۔ اب تو عورتوں اور بچوں کا آنا جانا معمول بن گیا۔ اور داری فقیرنی کی دھوم مچ گئی۔ عورتیں بھی اپنے اپنے مسائل لے کر آنے لگیں اور داری ان کی مدد کرنے لگی۔ یوں ہی کچھ اور وقت گزر گیا۔ داری حویلی سے باہر نہ نکلی۔ اور جب وہ اس حویلی سے آخری بار باہر نکلی۔ تو سفرِ آخرت پر ہی نکلی۔ جس روز داری اس دنیا سے گئی۔ اس روز گاؤں کے ہر فرد کی آنکھ اشکبار تھی۔ داری کو جبار (بارو) کے پہلو میں دفن کیا گیا۔
برسوں بیت گئے ہیں۔ گاؤں کی نئی نسل تو نہیں جانتی کہ داری کون تھی۔ مگر بڑے بوڑھے اب بھی بارو اور داری کی کہانی یاد رکھے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں...... داری کی قبر پر محبت کے چراغ ضرور جلاتی ہیں اور اپنی محبت کی تکمیل کی دعائیں مانگتی ہیں۔ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور مائی فقیرنی کی قبر روشن ہو جاتی ہے۔

☆☆......☆☆



دیکھتی آنکھیں

اعجاز احمد نواب

لاہور سے، پیدائشی معذور، اُس دوشیزہ کی کتھا، جو وقت کی چکی میں پس گئی

روشنی دریائے کنہار کے کنارے کنڈ ریالہ گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔ اس کی کٹیا کئی جگہوں سے مسمار تھی۔ گاؤں کی ٹیڑھی ترچھی اور غیر ہموار پہاڑیوں پر بہت کم فاصلوں پر گھر تھے۔ بجلی، پانی، گیس، اسکول، ہسپتال، سڑک جیسی سہولیات دور دور تک موجود نہ تھیں۔ کچھ صاحب حیثیت زمینداروں نے دولت کی فراوانی ہونے کی بنا پر اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لیے پن بجلی اور جنریٹروں کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس کرہ ارض کے دوسرے پیدائشی معذور انسانوں کی طرح روشنی کا بھی قسمت پر اختیار نہیں تھا۔ وہ بھی حکمت خداوندی کے تحت اپنے لکھے ہوئے نصیب کے آگے بس تھی۔ اس کا گندمی چہرہ دلکش تھا مگر مقدر بدنصیب تھے۔ مسکرانے سے اس کے کالے مسوڑھے ظاہر ہو جاتے تھے جو اس کے دلکش چہرے کو بھدہ ظاہر کرتے تھے۔ لہٰذا، اس کا مسکرانا بے معنی حیثیت رکھتا تھا۔ چہرے پر پرکشش لمبی تراشیدہ آنکھیں تھیں۔ ناک پر چمکتا ہوا لونگ اور کانوں میں پرانی طرز کے جھمکے لٹکتے رہتے تھے۔ قد لمبوترا اور رنگ گولڈن تھا، وہ پیدائشی طور پر کان اور زبان جیسے دفاعی آلات سے محروم تھی مگر آنکھوں کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ بچپن میں یتیمی کی وجہ سے اس کی پرورش اس کی دادی ماں نے کی تھی۔

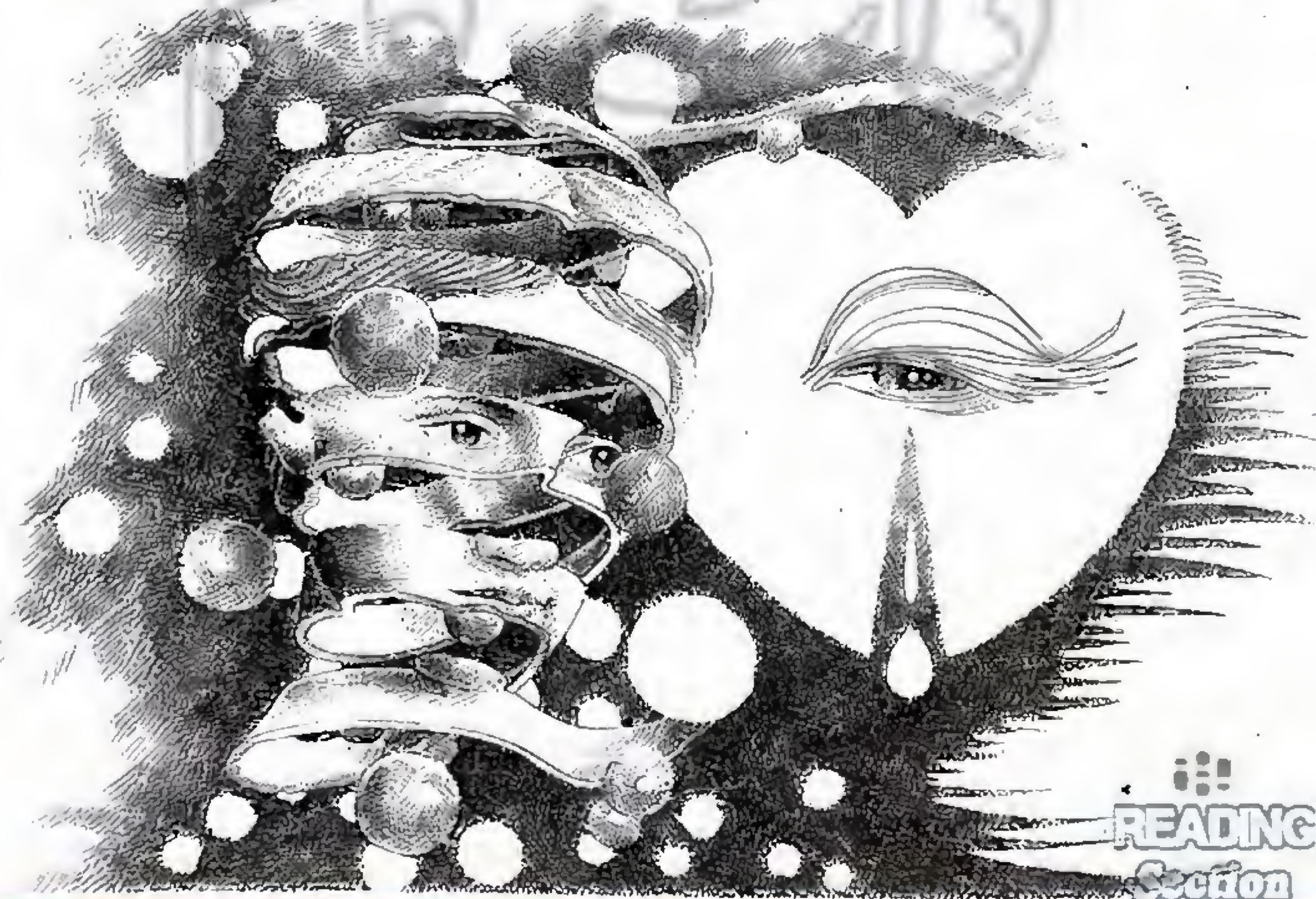
وہ اپنے آپ کو مشکی رنگ کے بڑے بالوں والے کتے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتی۔ کتا اتنا مخلص اور وفادار تھا جیسا کوئی مخلص اور پیارا دوست۔ کتے کے بارے میں وہ اشاروں سے کہتی،'' جب یہ میرے پاس ہوتا ہے، مجھے تنہائی کا کوئی خوف نہیں ہوتا نہ ہی مجھے ماحول کی کسی چیز سے خوف آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ آبنوس کی ایک چھڑی ہوتی۔ جو آگ اور دھوئیں سے مبرا تھی۔ وہ جب بھی چھڑی سے کھڑاک پیدا کرتی، کتا حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اچھل کود کرتا، دم ہلاتا، پیار سے غراتا ہوا اس کے پاس آکر چکر لگانے لگتا۔ کتا روشنی کے لیے زبان اور کانوں کے فرائض انجام دیتا۔

☆......☆......☆

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس کو اپنی خامی کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ ایک نامکمل عورت ہے اور کبھی بھی مکمل عورت کا روپ نہیں دھار سکتی۔ وہ زبان ہوتے ہوئے بھی قدرتی طور پر ہر جگہ ایسے خاموش رہتی جیسے مچھلی۔ اور زبان پر بت

جیسا سناٹا چھایا رہتا۔ غم سوچیں اجالتی دکھ، نا امیدی، فکریں، اندیشے وہمات، چہرے پر مستقل ڈیرے جمائے رکھتے۔ تنہائی میں قدرت کی دی ہوئی خامی پر دکھ بھرے آنسوؤں کے ساتھ روتی اور اپنے آپ کو کوستی کہ یہ بے زبانی میرے پیدا ہونے سے پہلے کس حادثے کی سزا ہے جو قبر کی دیواروں تک میرے ساتھ چلے گا۔ یہ خامی اس کے اندر نہ بجھنے والی سلگتی ہوئی آگ کی طرح روشن تھی۔ زبان کی نشو ونما کے بغیر نہ چغلی کھاتی، نہ بری بات سنتی، نہ برائی کی طرف جاتی، نہ اس کے اندر گناہ کرنے کی تحریک پیدا ہوتی بلکہ وہ ہر لمحہ خوفزدہ اور سہمی ہوئی رہتی کہ ابھی کچھ ایسا ہو جائے گا جس سے بہت بڑا نقصان ہوگا۔ وہ اپنے نقص کی وجہ سے کم سخن اور بے ضرر لڑکی تھی۔ دھیما مزاج رکھتی تھی۔ اس کے منہ میں باتوں کے لیے ترسنے والی زبان تھی اور آوازیں سننے کے لیے ترسنے والے کان تھے۔ دوسرے انسانوں اور اشیاء میں بے پناہ دلچسپی لیتی تھی۔ خاص طور پر ان اشیاء میں جو وہ پہلی بار دیکھتی۔ وہ اشاروں کی زبان میں اپنی دادی ماں سے ہر چیز پر عقلمندانہ اور اوٹ پٹانگ بحث کرتی۔ وہ سیکھتی تھی، سیکھ رہی تھی، سمجھتی تھی اور عقل میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے گونگے، بہرے پن نے اس کے دل میں انسانوں کے لیے ہمدردیاں اور انمول محبتیں پیدا کر دی تھیں، جس کو سمجھنے والے بہت کم تھے۔ اس کے تاثرات اس جیسے لوگ سمجھ سکتے تھے یا اس کے پاس احساس کمتری جیسی اداسی یا تادم مرگ صبر۔

اس کا سب سے بڑا مسئلہ نظر اندازی تھا۔ وہ سن نہیں سکتی تھی تو کسی چیز کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بول ہی نہیں سکتی تھی تو لوگ اس کے ساتھ کیا بات کرتے۔ اس کچھ سنائی ہی نہیں دیتا تھا تو اس کو کیا سناتے۔ اشاروں کی زبان ہر ایک کو آتی نہیں تھی تو لوگ اس کے اشاروں کی بات کو کیسے سمجھتے یا اس کے اشارے دیر سے سمجھتے یا کھوئے رہتے یا رحمدلانہ انداز سے نظر انداز کر دیتے۔ اگر ایک صحت مند آدمی اس کو کوئی بات سمجھانا چاہتا تو اس کو بہت گہرائی میں جانا



پڑتا۔
وہ کسی اسکول کی پڑھی ہوئی ہی نہیں تھی، اسے لکھ کر کیا سمجھاتے۔ وہ گاؤں میں کس کے پاس اشاروں کی عالمی زبان سیکھتی یا کون اس کو گونگوں بہروں کے عالمی نشانات سے آگاہ کرتا کیونکہ دور دور تک گونگوں بہروں کا کوئی اسکول نہ تھا۔ گاؤں میں اس جیسا کوئی نہ تھا نہ اس کو بولنا آیا نہ اس کی نوجوانی کی الہڑ عادات میں چنچل پن اور شوخیاں پیدا ہوئیں۔ وہ اکثر سوچتی ،اگر میں بول نہیں سکتی تو پھر بولنے کے لیے منہ کھولنا اور ہونٹوں کو حرکت دینا بیکار ہے۔ وہ اپنی خاموشی کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ لوگ اس کو دیکھ کر اور اس کے بارے میں جان کر رحم اور ہمدردی کرتے تھے کہ خدا نے ہمیں اس جیسا نہیں بنایا۔ کیونکہ لوگوں کو دوسروں کی معذوری دیکھ کر غور کرنے سے اپنے اعضاء کی قدر ہوتی ہے۔

وہ یہ جان چکی تھی آوازوں کو دیکھا نہیں جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور کیسے دنیا پر آوازوں کی حکومت ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی تمام چیونٹیوں کے پاؤں کے آہٹوں کی آوازوں سے ایک باشعور شخص کے کان پھٹ بھی سکتے ہیں اور آوازوں سے لطف اٹھانے والے کبھی کبھی خاموشی کو ترجیح دینے لگتے ہیں اور کبھی کبھی آوازوں سے تنگ آ کر گوشہ تنہائی کو ترجیح دیتے ہوئے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور جب بیوقوف بولتے ہیں ان کی عزت کم ہو جاتی ہے اور آوازیں ہی انسان کے لیے سب سے زیادہ آفتیں پیدا کرتی ہیں۔ خاموشی بیوقوف کے لیے سرمایہ بولنے والوں کے لیے ترپ کے کارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاموشی کب اختیار کرنا چاہیئے، یہ ایک شاطر شخص ہی جانتا ہے۔ مگر زبان کی گندگی سے نہ صرف جسم بلکہ پاکیزہ روح بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔

جب اشاروں کی زبان میں بات کرتی تب بعض اوقات ہونٹ اور آنکھیں بھی حرکت کرتے۔ اگر کبھی بولنے کی کوشش کرتی، خاموشی خود سے ٹکرا جاتی۔ قوت سماعت اور بے کلامی کے بغیر اس کی زندگی بے ذائقہ ہو کر رہ گئی تھی۔ دونوں اعضاء کی معذوری سے زندگی کا مزہ جاتا رہا تھا اور وہ خود کلامی کرتی رہتی تھی۔

وہ بچوں سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے کی کوشش کرتی کیونکہ بچے اس کی نقلیں اتارتے تھے اور اسے زمین پر بوجھ سمجھتے تھے۔ وہ گاؤں کے جاہلوں میں منحوس کے نام سے مشہور تھی۔ لہٰذا، جاہلوں اور کم ظرف لوگوں نے اس کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ کوئی لڑکا اس سے شادی نہ کرے ورنہ اس کو گونگا بہرہ بن کر اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے پاگل پن کے دورے پڑیں گے۔

اس کی باتیں اشاروں سے یا چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی دادی سمجھ لیتی تھی۔ وہ زیادہ کام اشاروں کنایوں یا آنکھوں کے تاثرات سے لینے کی کوشش کرتی مگر......

عام حالات میں اس کے چہرے کے تاثرات ایک جیسے ہی رہتے۔ نام لے کر اس کو کوئی نہ پکارتا۔ پہلے اس کو چھوا جاتا، پھر ٹوٹے پھوٹے اشاروں میں کوئی بات سمجھائی جاتی یا اس طرح ہاتھوں کے لمس سے دوسروں کو آگاہ کرتی یا لوگ کھلونا سمجھ کر دل بہلاتے۔ وہ بغیر کہے سنے اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی اور اپنے طریقے سے چیزوں کو استعمال کرتی کیونکہ اپنی مدد آپ میں خدائی مدد شامل ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

نہ بچپن بے فکری میں گزارا نہ جوانی آزاد رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جی بھر کر اپنی سہیلیوں سے باتیں کرے اور دل کے تمام حالات کہہ دے اور جوانی میں لڑکیوں کے دلوں میں اٹھنے والے راز جانے۔ لیکن قدرت نے اسے اس جیسا کوئی دوست عطا نہ کیا، سوائے کتے کے۔ وہ نہیں جانتی تھی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے تاثرات کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ باتونی عورتیں دیکھ کر وہ شش و پنج میں پڑ جاتی تھی کہ یہ کیسے ہر وقت ہونٹوں کو حرکت دیتی رہتی ہیں۔ شاید! یہ بھی اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ کسی عورت سے بھی اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ نوجوان لڑکیوں کی طرح اسے سب سہولیات میسر نہیں تھیں۔

اگرچہ وہ سننے اور بولنے جیسے حواس خمسہ سے معذور تھی مگر باقی حواس خمسہ کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتی تھی۔ اس کی چھٹی اور ساتویں حسیں اور دیگر غور و فکر کی حسیں عام انسانوں سے زیادہ کارآمد اور تیز تھیں۔ وہ حرکت عمل سے مہارت کا اظہار کرتی تھی۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ قوت سماعت اور علم زبان دانی کے بغیر اس کے دماغ کی بینائی اور قوت فیصلہ تیز ہوتی گئی۔ ماحول عجیب ہوتا گیا۔ لہٰذا، وہ ہر چیز میں گہری دلچسپی ظاہر کرنے لگی۔ وہ ماحول پر گہرا غور و فکر کرنے لگی۔ وہ سن کر جاننا چاہتی تھی۔ مرد، عورت، بوڑھے، بچے اور نوجوان کی آوازوں میں کیا فرق ہوتا ہے یا سب آوازیں ایک جیسی ہوتی ہیں یا عمر کے مختلف حصوں میں بدل بھی جاتی ہیں یا لوگوں کے ہونٹ ایسے ہی حرکت کرتے رہتے ہیں یا کچھ جاندار چیزیں آوازیں رکھتی ہیں اور تمام نہیں رکھتیں یا بے جان چیزیں بھی آوازیں رکھتی ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں کے چہروں کے تاثرات سے ان کے رویے پہچانتی یا سوچتی، لوگوں کے چہروں کے تاثرات کیا کہنا چاہتے ہیں یا عام حالات میں لوگوں کے چہروں پر محبت ہے یا غصہ منافقت ہے یا مکاری یا عجیب رویہ۔

لوگ نرم آواز میں کیسے بولتے ہیں۔ میٹھی آواز کیسی ہوتی ہے۔ کرخت لہجہ کیسا ہوتا ہے۔ آوازوں سے کیسے خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ کون سی آواز نقصان دہ ہے کون سی فائدہ مند۔ شور اور سریلی آواز میں کیا فرق ہے۔ خوشی اور غم کے موقعوں پر انسان کیسی آوازیں نکالتے ہیں۔ روتے ہوئے انسانوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ کیسی آوازیں نکلتی ہیں یا لوگوں کے حرکت کرتے ہونٹوں اور حرکات و سکنات سے وہ اندازہ کرتی کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا خاموش ہیں یا کیا باتیں کر رہے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کس موضوع پر باتیں کر رہے ہیں یا کیوں خاموش ہیں۔ آوازوں کے سر اور ساز کیا ہیں۔ کون سی آواز باریک ہے کون سی بھاری۔ خراش زدہ اور بھاری آواز میں کیا فرق ہے اور قہقہے کتنی اقسام کے ہیں۔

شیر کی دھاڑ بچے پر کیا اثر کرتی ہے اور بلکتے بچے کی آواز ماں پر کیا اثر کرتی ہے۔ اس طرح وہ آوازوں کے فرق کو جاننا چاہتی تھی کہ کون سی چیز کتنی آواز رکھتی ہے۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ درختوں کے پتے جب ہوا سے ہلتے ہیں، کیسی آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ پرندوں کے پھڑپھڑاتے ہوئے پر کون سی آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ لوگوں کے تالیاں بجانے سے کیسی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ بات بھی جاننا چاہتی تھی آوازیں محفوظ کیسے کی جاتی ہیں۔ ڈھول کی تھاپ کتنے فاصلے سے کیسا سُر پیدا کرتی ہے۔ اس کی زندگی آوازوں سے بیگانہ ہوتے ہوئے خطرناک تھی مگر وہ یہ حقیقت جانتی تھی قوت سماعت رکھنے والوں کی زندگی انھیں ماحول کے خطرات سے آگاہ رکھتی ہے۔

کئی بار اس کے سامنے حادثاتی آوازیں برآمد ہوئیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلنے والے پتھروں کی طرح بے خبر رہی۔ وہ آوازوں کے اتار چڑھاؤ کی خصوصیات کو جان کر وجہ تخلیق کائنات جاننا چاہتی تھی کیونکہ گونگے بہرے خدا کی تعریف سن اور دوسروں کے آگے بیان نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے یہ بات معمہ بنی ہوئی تھی، قوت سماعت اور گویائی والوں کی طمانیت قلب میں کیسے اضافہ ہوتا ہے۔

وہ الگ الگ آوازوں کے تاثرات کو سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ پہاڑوں، جھرنوں، آبشاروں اور دریائے کنہار میں بہنے والے پانی کی آوازیں سننا چاہتی تھی۔ مختلف پرندوں اور ان کے دلکش رنگوں کو دیکھ کر سوچتی اور اشاروں میں کہتی جو مخلوق دیکھنے میں اتنی خوبصورت ہے، ان کی آوازیں کتنی خوبصورت اور دل میں اترنے والی ہوں گی۔ کاش وہ سب کچھ سن اور بول کر سمجھ سکتی اور خالق کائنات کی تعریف دوسروں کو کے آگے بیان کرتی جس نے یہ کائنات تخلیق کی ہے۔

وہ صبح سویرے عبادت کرتے پرندوں کو دیکھ کر شکر ادا کرتی کہ کان اور زبان کے نہ ہوتے ہوئے وہ خدا کے کرشمے تو دیکھ سکتی ہے۔ اسے پرندوں کی چہچہاہٹ، ہرے ہرے طوطوں کی ٹائیں ٹائیں، کوؤں کی کائیں

کائیں، چکاوتروں کی کک کک، کبوتروں کی غٹرغوں، بازوں کی سیٹیاں، کتوں کا بھونکنا، فاختہ کی کوکو، میمنے کا بے بے، بھیڑیے کی غراہٹ اور سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں سننے کی بے پناہ خواہش تھی۔ مگر قوت سماعت کے نہ ہوتے ہوئے وہ صرف ان کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ فرحت محسوس کرتی۔

وہ چاہتی تھی اپنے جذبات بیان کرے۔ دوسروں کی باتوں سے لطف اٹھائے۔ کتابوں کو پڑھے، ریڈیو سنے، مشینوں کی آوازیں، شادی پر سازوں، گانوں اور دلکش آوازوں والے گلوکاروں کی مترنم اور خوبصورت آوازیں سنے اور سب آوازوں کی کیفیات کو جی بھر کر دل میں سمو کر محضوض ہوتی رہے۔ اس کی آنکھیں سمجھتی تھیں، دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر اس کی ادھوری صلاحیتیں اس کی زندگی کی رنگینیوں کو سرکے سے زیادہ ترش بنا رہی تھیں۔ وہ یہ جاننے کی کشمکش میں مبتلا تھی کہ آوازوں کے ذریعے زندگی گزارنے کے طور طریقے کیا ہیں۔ لوگوں کے میل جول کیا ہیں۔ رشتے داریاں کیا ہیں۔ وہ چاہتی تھی لوگ اس کے چہرے کو پڑھ کر اس کی ضروریات اور خواہشات کو سمجھیں، اس سے نفرت نہ کریں نہ رحم کریں بلکہ اس کو اپنے جیسے لوگوں کی طرح زندگی میں حصہ دیں۔ اس کو ہمیشہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ ناکارہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا کیونکہ اس کے اندر ایسی کوئی خوبی نہ تھی جس کی بنا پر اس کو اہمیت دی جاتی۔

☆......☆......☆

ایک بار وہ شادی کے لیے رد کیے جانے کی بنا پر دل برداشتہ ہوگئی اور اونچے پہاڑوں پر کھائیوں کے نزدیک خودکشی کرنے پہنچ گئی۔ اچانک دادی ماں اور کتا بھی اس کے پیچھے پہنچ گئے۔

دادی ماں نے اس کو روک کر اشاروں سے سمجھایا کہ ''تمہارے بغیر میرا کوئی نہیں۔ زندگی خدا کا انمول تحفہ ہے۔ اسے مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کرنا چاہیے۔ اسے ضائع مت کرو۔''

روشنی نے آنکھوں میں آنسو لا کر اشاروں سے ''تو پھر میری زندگی کس کام کی۔ میں ہر روز ایسے ہی گھٹ گھٹ کر مروں گی اور لوگ مجھ کو دھتکارتے رہیں گے، ترس کھاتے رہیں گے، نظر انداز کرتے رہیں گے۔''

دادی ماں نے اسے سینے سے لگا کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر اشاروں سے کہا، ''میں اپنی بچی کی شادی بھی کراؤں گی اور اس کو عظیم عورت بھی بنا دوں گی کیونکہ نہ زندگی پابند سلاسل ہے نہ پابہ زنجیر، ایک ان دیکھی قید ہے مگر شعور تو قید نہیں، جسم تو آزاد ہے، ان دونوں کو استعمال کر کے نئی زندگی مل سکتی ہے۔''

دادی ماں نے مرنے سے پہلے روشنی کو جڑی بوٹیاں اکٹھا کرنے کا خاندانی پیشہ سکھا دیا اور ساتھ ساتھ تازہ سانپوں کے ڈسے ہوئے انسانوں کو نئی زندگی دینے کے لیے تریاق بنانے کا فن سکھا کر زندگی کے قریب کر دیا۔

☆......☆......☆

دادی ماں کی وفات کے بعد وہ ذاتوں کو ڈرنے لگی اور خدا سے فریادیں کرنے لگی کہ خدا مجھے تنہائی کی زندگی سے بچالے۔ میں کانوں اور زبان کے نہ ہوتے ہوئے اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔ اب کتے کی دیکھ بھال کرنا اس کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا۔ شہر تو اس نے کوئی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی تمام دنیا کنڈریالہ ہی تھا یا اس کے ارد گرد کے جنگل اور ماحول۔ وہ کنڈریالہ سے باہر جانا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ روزانہ جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئی پہاڑیوں پر موجود گھنے جنگلوں اور ویرانوں میں جاتی۔ وہ بلند و بالا چوٹیوں، نالوں، پگڈنڈیوں کے کنارے بے انت راستوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی۔ ہری ہری گھاس نوکیلے پتھروں، رنگ برنگے پھولوں کے پاس سے گزرتی جہاں تتلیاں بھنورے اور پرندے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے منڈلاتے رہتے۔

وہ جڑی بوٹیاں اکھٹا کرنے کے لیے لمبے پیدل سفر کرتی۔ اس طرح خشک کلیوں، کونپلوں، زرد پتوں،

سوکھی ٹہنیوں، کانٹوں، خود رو جھاڑیوں اور مختلف بیجوں کو اکٹھا کرتی۔ کئی کو دیکھ، سونگھ اور چکھ کر تیار ہونے کے لیے چھوڑ دیتی، کئی کی زندگی کی مدت کا اندازہ کرتی، کئی کا جائزہ لیتی اور کئی کو سرو تے سے کاٹ کر مختلف تھیلوں میں بھر لیتی۔ وہ دواؤں میں استعمال ہونے والے قیمتی پتھروں کو بھی اکٹھا کرتی۔ جب کتا کسی خطرے کی نشاندہی کرتا، وہ واپس چلی جاتی۔ جڑی بوٹیوں کو گھر لا کر علیحدہ علیحدہ کر کے صاف کرتی۔ علاوہ ازیں وہ قیمتی مردہ جانوروں کی کھالیں بھی اکٹھا کر کے سکھاتی۔ شہر سے حکماء اور دوکاندار آتے، جڑی بوٹیوں سے بھرے تھیلے اور خشک کھالیں لے جاتے مگر اس کو بہت کم معاوضہ دیتے، جس سے اس کا اور کتے کا پیٹ بھرنا مشکل تھا۔

کبھی کبھی سانپوں کے تازہ ڈسے ہوئے لوگ بھی علاج ومعالجے کے لیے اس کے پاس آتے تو وہ ان کو نئی زندگی دے کر خوشی محسوس کرتی۔

سانپوں کے کاٹے کے علاج نے اسے دور دور تک مسیحا اور رانو کھی سنیاسن مشہور کر دیا اس طرح بھی اسے کچھ آمدن ہو جاتی تھی۔

برف باری اور جاڑے کے دنوں میں شام ہوتے ہی گاؤں میں سناٹا چھا جاتا۔ لہٰذا خوراک کے کم ہونے کی وجہ سے اسے کئی کئی دنوں تک بکریوں کے دودھ پر گزارہ کرنا پڑتا یا اس نے اپنے آپ کو فاقوں سے بچانے کے لیے پھلیاں، بھٹے، بیر، جنگلی خشک پھل، پیاز، تمر، مکئی کا آٹا، جلانے کے لیے لکڑی، پتھر کا کوئلہ، بکریوں کے لیے خشک چارہ اور پانی اسٹور کیا ہوتا۔

☆......☆......☆

آج وہ اور کتا جڑی بوٹیاں اکٹھا کر رہے تھے۔ جب وہ کام سے تھکی تو سستانے کے لیے ایک جھرنے کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے میٹھے پانی کے چھینٹے چہرے پر مار کر چہرے کو تروتازہ کیا کہ سامنے اچھلتی، کودتی، ناچتی ایک گلہری آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ منہ سے چک چک کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کبھی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو کر ہاتھوں سے منہ صاف کر کے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتی اور کبھی دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر روشنی کو غور سے دیکھنے لگتی۔ روشنی کو اس کی حرکات بہت بھلی معلوم ہوئیں۔ روشنی اسے دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ گلہری چوکنا تھی۔ اچانک روشنی کا کتا گلہری کی جانب بھاگا تو گلہری نے دم دبا کر دوڑ لگا دی اور دور جا کر کھڑی ہو کر حیرت سے کتے کو دیکھنے لگی۔ جیسے کسی بڑی طاقت نے کسی چھوٹی پُرامن مخلوق کا سکون تباہ کر دیا ہو۔

☆......☆......☆

باز خان ایک بڑے خان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ یہ بھی جوانی میں داخل ہوتے ہی لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑا ہوا رئیس بن چکا تھا۔ اتنا آزاد خیال تھا جتنی ہوا۔ دل ایسا کالا جیسا کوئلہ، آواز ایسی جیسے بجلی کی کڑک، خون اتنا سفید جتنی برف اور قول وفعل میں انتہا درجے کا تضاد رکھتا تھا۔ وہ صبح سے بندوق اور کارتوسوں کا تھیلا تھامے جھاڑیوں میں گھوم رہا تھا۔ ٹاہلی، کیکر، چیڑ، شیشم، صنوبر کے درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں چلتے ہوئے اسے کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ عیش پر وقت ضائع کرنے کی بجائے نظر بازی کو ترجیح دیتا تھا۔ روشنی کو اکیلا دیکھ کر اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس کی نفسانی وحشت روشنی کا رس چوسنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ پہلے تو اس نے سوچا یہ گونگی بہری ہے۔ پھر سوچنے لگا گونگے بہرے پن کو چھوڑ و اصل چیز تو کنوارہ جسم ہے جو دوسروں کے دل موہ لیتا ہے۔

باز خان نے مونچھ کے گرے ہوئے سرے کو اوپر تاؤ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ باز خان کی میلی نظریں روشنی کا پیچھا کرتی رہیں۔ ایک سنسان مقام پر گونگی بہری روشنی کسی مفت چیز سے کم نہ تھی۔ اس پر نفسانی خواہشات کا غلبہ چھانے لگا۔

سورج آہستہ آہستہ دھوپ سمیٹتا ہوا درختوں کے دوسری طرف پہاڑیوں کے پیچھے سرک رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی پھیل رہی تھی اور سکوت کا دور دورہ تیز ہو رہا تھا۔ پرندے درختوں پر اپنے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ روشنی جھرنے کے پاس اوڑھ والی جگہ پر نہانے لگی۔ کتا باہر ٹہل کر پہرہ دینے لگا۔ کتے نے باز خان کو دیکھ کر غرانے اور بھونکنے کی آواز پیدا

کی مگر بے سود۔ باز خان نے کتے کو فائر مار دیا۔ فائر کی آواز سے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے کمزور پرندے پھڑ پھڑائے۔ مگر فائر کی آواز روشنی کے لیے کوئی اہمیت پیدا نہ کرسکی۔ باز خان کو قریب آتا دیکھ کر روشنی نے کتے کو بلانے کے لیے چھڑی سے آواز پیدا کرنے کی کوشش کی مگر مزاحمت اور بے آواز چیخوں کا احتجاج بیکار رہا۔ سیکنڈوں میں اُس کی عزت خاک میں مل گئی۔ وہ کپڑے پہن کر بکھرے بالوں کے خوف میں ڈوبی ہوئی گھر کی طرف بھاگی۔ بھاگتے ہوئے وہ گری اور اس کا سر راستے میں پڑے ہوئے ایک نوکیلے پتھر سے ٹکرا گیا۔ خون کی ایک دھار بہہ نکلی، خون بہنے کے باوجود وہ بھاگتی رہی۔ گھر پہنچ کر اس نے کمزور دروازے کے پٹ زور سے بند کرکے لمبے لمبے سانس لیے۔ اُس کے اعصاب پر ابھی بھی کسی کے گھر آ جانے کا انجانا خوف سوار تھا۔ کچھ دیر بعد سانس بحال ہونے کے بعد اس نے مٹی کے گڑھے کے پانی سے پلو بھگو کر سر سے گردن تک بہتا ہوا خون صاف کیا۔ اس کے چہرے کا رنگ زعفران جیسا زرد ہو چکا تھا۔ نبض کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ گھبراہٹ میں آنکھوں کا رنگ سفیدی مائل ہوگیا۔ جسم میں کمزوری بڑھ گئی۔ اُسے اپنا چہرہ بھیانک محسوس ہونے لگا۔

بے خیالی میں اس نے اپنے سر کے خون میں تر بال نوچنا شروع کر دیے۔ وہ بے آواز چیخوں کے ساتھ زبان، کانوں اور بے درد حالات کو کوسنے لگی۔ جن کی معذوری کی بنا پر آج یہ منحوس وقت سامنے آیا تھا۔ وہ مصیبت میں خدا سے ہم کلام ہونے لگی۔ وہ یہ بات کس کو بتاتی۔

اسے اپنی آبروریزی کا بہت رنج تھا۔ ساتھ کتے کی موت کا بھی اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا۔ زندگی اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ اپنی معذوری کے حادثے کو آسانی سے سہل نہ کرسکی۔ بالآخر اپنے کتے کو کھو بیٹھی۔ جب تک کتا تھا اس کی زندگی آسان تھی اور وہ زندگی کی مشکلات کی گھڑیوں کو آسانی سے عبور کر رہی تھی۔ کتے کی موت سے اس کی رہی سہی قوت بھی ختم ہوگئی اس طرح اس کے سامنے نئے غم کا پہاڑ آ گیا۔

کتا اس کا محافظ اور روزی روٹی کا ذریعہ تھا۔ اُس کے بغیر وہ بہت زیادہ اپاہج ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ اب وہ سانپ کے کاٹے لوگوں کا علاج بھی نہیں کرسکتی تھی۔

کتے کی موت کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کو باز خان کی حرکت کا پتا چل گیا۔ اب اس نے جنگل میں جانا کم کر دیا۔ وہ تنہائی پسند ہوگئی۔ سارا دن اپنی کٹیا کا دروازہ بند کرکے سوچوں اور وسوسوں میں گم بیٹھی روتے ہوئے ایڑیاں رگڑتی رہتی۔ جیسے دنیا سے متنفر انسان سب کے ساتھ ایک جیسا رویہ اپنا لیتا ہے۔ باز خان کی حرکت علاقے میں بازگشت بن کر گونجتی رہی مگر گاؤں والوں نے روشنی کو معذور اور لاوارث سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب وہ کبھی کبھار پہاڑوں اور طویل القامت درختوں سے شکوہ کرنے جاتی اور غصے سے ان کو چھڑی سے ناکارہ سمجھ کر پیٹتی کہ تمھارے بلند اور طاقتور ہونے کا کیا فائدہ جو میری حفاظت نہ کرسکے۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد باز خان صبح سویرے اپنے چند دوستوں کے ساتھ جنگل میں تیتر، بیٹر، تلیر اور جنگلی کبوتروں کا شکار کر رہا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ ملک الموت کی نگاہیں اس کی زندگی جھپٹنے کے لیے اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ اچانک ایک پتھر کے نیچے سے ایک سانپ نے نکل کر اُسے بے دردی سے ڈس لیا۔ وہ تڑپنے لگا اور اس کے جسم کا رنگ خراب ہونے لگا۔ باز خان کے دوستوں نے اس کے والد کو موبائل فون پر آگاہ کیا۔ گاؤں میں اس وقت کوئی گاڑی نہیں تھی جس پر سوار کرا کے اس کو ہسپتال لے جایا جاتا۔ اسی وقت اس کو ایک پالتو گھوڑے پر الٹا ڈال کر روشنی کے پاس علاج معالجے کے لیے لایا گیا۔ گاؤں میں روشنی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص سانپ کے کاٹے کا علاج نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سے لوگ اس وقت روشنی کے پاس آئے اور اشاروں کنایوں میں اس کی منت سماجت کی کہ وہ باز خان کو معاف کر دے اور جڑی بوٹیاں کھلا کر اس کا زہر خارج کرا دے۔ اللہ اس کو

اجر دے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے اللہ اس کو نیکی کے بدلے قوت گویائی اور قوت سماعت عطا کردے۔

باز خان روشنی کے رحم وکرم پر آ گیا۔ جیسے زمانے سے لڑنے والے بالآخر زمانے کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں مگر روشنی نے ہاتھوں کے اشاروں سے سب کے سامنے صاف انکار کر دیا اور ہمدردانہ جذبات پیدا کرنے والی آوازوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے لوگوں کی حرکات وسکنات سے بے نیاز ایک طرف سمٹی بیٹھی رہی۔ باز خان تڑپ رہا تھا کچھ لوگوں نے آوازیں بلند کیں، ''روشنی کو گاؤں سے نکال دو۔''

روشنی تو بہری تھی اسے آوازیں کیسے سنائی دیتیں۔

باز خان کے والد نے اپنا اکلوتا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں الجھا ہوا دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے روشنی کے آگے سر سجدہ ریز کر دیا۔

روشنی کو بڑے خان کی منت سماجت پر رحم آ گیا اور وہ مان گئی۔

اس نے اشاروں سے کہا، ''میں دو شرائط پر اس کا علاج کروں گی، ایک تو یہ میرے ساتھ شادی کرے گا، دوسرے مجھے پڑھنا لکھنا سکھائے گا۔''

باز خان کی زندگی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا والد سب کچھ ماننے کے لیے تیار تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ باز خان نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ روشنی نیک لڑکی ہے، گونگا بہرہ ہونا کوئی عیب نہیں۔ یہ معذوری تو قدرت کی عطا کی ہوئی ہے اور باز خان کان اور زبان ہوتے ہوئے گاؤں میں کون سے اچھے کام کر رہا ہے۔ انسان میں پورے اعضاء ہونے کے علاوہ ایک خوبی ایسی ہونی چاہیے جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے اور ایسے تمام اعضاء کا کیا فائدہ جو دوسروں کے لیے درد سر بنے رہیں۔ اگر روشنی باز خان کو نئی زندگی دے دیتی ہے تو شادی کرنے میں کیا حرج ہے۔ بڑے خان نے سب کے سامنے خدا کو حاضر ناظر جان کر روشنی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

باز خان کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ روشنی کی شرائط اور باپ کی ضمانت سے بے نیاز سانپ کے ڈسنے کے درد سے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔

روشنی فوراً اپنی ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں گئی کہ شاید کچھ جڑی بوٹیاں مل جائیں مگر گھر میں ایسی کوئی جڑی بوٹی نہیں تھی جس سے اس کا علاج کیا جاتا۔ روشنی نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور لالٹین لے کر پہاڑیوں پر اندھیرے جنگل کی طرف چل دی۔ مطلوبہ جگہ سے اس نے ریت اور مٹی سے اٹی ہوئی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور باز خان کے پاس واپس آئی۔ ابھی اس کی کچھ سانسیں باقی تھیں۔ اس نے جڑی بوٹیوں میں کچھ اور چیزیں ملا کر باز خان کو نیم مردہ حالت سے اٹھا کر ہاتھ اور منہ کے اشاروں سے کہا۔

''ان جڑی بوٹیوں کو کھاؤ، یہ بے انتہا ترش ہیں اور اس وقت تک کھاتے رہو جب تک یہ میٹھی معلوم نہ ہوں۔''

باز خان جڑی بوٹیاں کھاتا رہا اس کو کچھ معلوم نہ تھا وہ کیا کھا رہا ہے اور کون کھلا رہا ہے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا اس کو جڑی بوٹیوں کا اثر میٹھا معلوم ہونے لگا۔

پھر روشنی نے اشارے سے کہا، ''اب رک جاؤ۔'' کچھ دیر بعد باز خان کو جلاب لگ گئے۔ زہر خارج ہونا شروع ہو گیا۔ آنے والے دنوں میں وہ آہستہ آہستہ مکمل طور پر صحتیاب ہو گیا۔

روشنی بہت خوش تھی کہ اب اس کی شادی باز خان سے ہو جائے گی اور اس کو زندگی کا تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے روشنی کو معذور سمجھ کر اس سے کیے گئے وعدوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا کہ ایک صحیح الدماغ شخص کو اس گونگی، بہری، لاوارث، غریب لڑکی سے شادی کر کے کیا حاصل ہوگا۔ روشنی آہستہ آہستہ ان کی بے رخیوں سے متنفر ہوتی گئی۔ آخر ایک دن وہ سب کے منافقانہ رویے سے دل برداشتہ ہو کر اس علاقے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

آج بھی روشنی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی مریض علاج نہ ہونے کے باعث تڑپتا اپنی جان دے دیتا ہے۔ مگر روشنی...... وہ زندگی کے اندھیروں میں کھو گئی ہے۔

ابا کی بختاور

محسن علی شاہی

بھکر سے، ایک معصوم دوشیزہ کی حسرتوں کا مآل

دھوپ سمٹ کر دیواروں پر آن ٹھہری تھی۔ بختاور چارپائی پر بیٹھی جامن کے پیڑ میں بسیرا کیے پرندوں کے گھونسلے دیکھ رہی تھی۔

''بختاور! ایسے کیوں بیٹھی ہے؟'' اماں نے چولہے میں آگ جلاتے ہوئے پوچھا تھا۔ دھواں اِدھر اُدھر اُڑتا بھر رہا تھا۔ دھوئیں میں اماں بمشکل نظر آ رہی تھی۔

''اماں جب ہنستی ہوں تو ٹوک دیتی ہو کہ اجنبی لوگ میری آواز نہ سنیں۔ جب روتی ہوں تو تب بھی آپ کو شکایت ہوتی ہے۔'' آواز میں کچھ تھا۔ اماں کے چہرے پر سفیدی بھر گئی۔

''نہیں، نہیں بختاور! وہ تو تیرے ابا گھر ہوتے ہیں تو انہیں اچھا نہیں لگتا یوں کنواری لڑکیوں کا ہنسنا۔'' وہ ہنسی تھی۔

''ابا کو تو تیرا ہنسنا بھی اچھا نہیں لگتا اماں۔'' سچ بات تھی وہ سٹپٹا گئیں۔

''نہیں بیٹا! وہ تو خود میرا دل ہی مُردہ ہو گیا ہے۔ بختاور جب جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہو ناں، تو ہونٹ ہنسی کا ذائقہ بھول جاتے ہیں۔ اللہ کرے تمہارے لیے کوئی اچھا رشتہ آ جائے تو تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔'' آنکھوں کے کناروں میں آنے والا پانی ہرگز بھی دھوئیں کی وجہ سے نہ تھا۔ بختاور نے آہ کھینچی۔ ایسا لگا برف وجود میں سرایت کر گئی ہو۔

''اماں آپ دس سالوں سے یہ بات دُہرا رہی ہیں۔ آپ کہتے ہوئے نہیں تھکیں مگر میں سنتے ہوئے تھکنے لگی ہوں۔ پینتیس سالہ لڑکیوں کے لیے شہزادے نہیں آیا کرتے۔ ماؤں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔'' ایسی اُداسی تھی کہ اماں کے دل کو کوئی نوکیلی زہر آلود برچھی چیر گئی تھی۔

''نہیں میری بیٹی! خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ خدا پر یقین رکھنا چاہیے۔'' وہ حرفِ تسلی تھا تو ناکافی تھا۔ زخم زخم وجود پر نمک ڈالا گیا تھا۔

''اماں خدا نے تو کئی شہزادے بھیجے مگر آپ نے اور ابا نے انہیں ٹھکرا دیا۔ خدا کے حقوق معاف ہو جاتے ہیں۔ بندو کے نہیں ہوتے۔'' مولوی کی بیوی تھیں وہ مگر بیٹی کی دلیلوں کے جواب اُن کے پاس نہیں تھے۔

''بختاور! تجھ سا کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسی نیک سیرت، صوم صلوٰۃ کی پابند لڑکیوں کی سارا زمانہ



تعریف کرتا ہے۔'' اتنی کمزور دلیل پر بختاور نے اُن کو غور سے دیکھا اور پھر اُن کے ہاتھ میں پکڑے چمٹے کو۔

'' اماں...... زمانہ صرف تعریف کرتا ہے اور جب باتیں گھر بسانے کی ہوتی ہیں ناں تو ایسی لڑکیوں کو گھر کی زینت کوئی نہیں بناتا۔ انہیں دقیانوسی اور جاہل کہا جاتا ہے۔ پھر ایسی لڑکیاں جن کو اُن کے گھر والے 'راہبہ' بنا دیتے ہیں۔ گھروں کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہتی ہیں۔ آنکھوں میں خواب لیے کسی شہزادے کی منتظر، جو اُن کے وجود سے سوئیاں نکال کر انہیں 'زندہ' کرے اور شہزادے نہیں آتے۔ وہ پتھر بنی انتظار کرتی رہتی ہیں اور جب بالوں میں چاندی آجاتی ہے تو وہ گھر کے صنم خانوں میں غیرت کے نام پر قید کر لی جاتی ہیں۔''

اماں کے ہاتھ سے چمٹا گر گیا۔ پاؤں پر آبلہ پڑ گیا۔ آنسو کسی مزار پر دعا مانگتے عاجز انسان کی طرح بختاور کی آنکھوں سے گرے تھے۔ اُس نے آنکھیں پونچھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اماں چارپائی پر اُس کے ساتھ آن بیٹھیں۔ وہ ننگے پاؤں تھیں۔ بختاور کا دل چاہا انہیں کہے کہ وہ جوتے پہن لیں۔ مائیں ننگے پاؤں اچھی لگتی ہیں اور نہ ہی ننگے 'سر' مگر خاموشی کی ساحرہ چپ سی بیٹھی رہی۔ خاموشی نے انہیں دیکھا اور چپ چاپ اُن کے درمیان پاؤں پسارے بیٹھ گئی۔

مائیں تو بیٹیوں کا سایا ہوتی ہیں۔ مگر زمانے کی دھوپ کبھی کبھی بڑی ہی اثر انگیز ہوتی ہے۔ اب وہ دھوپ بختاور پر اثر کرنے لگی تھی۔ انہیں بختاور پر ترس سا آیا۔ وہ کتنی صابر لڑکی تھی، انہوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

'' بختاور...... میری بیٹی جلد ہی تیری پھوپو آنے والی ہیں۔ میں اور تیرے ابا اُن سے بات کریں گے۔ اُن کا بیٹا ایم اے پاس ہے، اچھا لڑکا ہے۔'' بختاور نے اس بات پر غور سے اُن کو دیکھا۔ کیسی اُمید تھی اُن کے چہرے پر، وہ چپ رہی۔

☆......☆......☆

اور پھر جب پھوپو آئیں تو ابا اور اماں نے بات کی۔ اُن کی بات سنتے ہی پھوپو بھتّے سے اُکھڑ گئیں۔

'' بس کر نور محمد! میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے اور تیری بیٹی 'بڈھی' روح بنی جو بیں گھنٹے کفن سا سفید دوپٹا

ادڑھے پھرتی ہے۔ شادی کی عمر نکل گئی ہے اب اِس کی، میرے بیٹے پر نظر مت رکھو اب۔''

اور بختاور نے رات کی تاریکی میں بھی اماں اور ابا کے چہرے کو سفید پڑتا دیکھ لیا تھا۔

بختاور کو اُس دن بڑا ہی ترس آیا تھا اپنے والدین پر۔ کاش 'وقت' انسان کی دسترس میں ہوتا...... مگر یہ نہیں ہوتا۔

ابا نے اماں سے کہا تھا کہ سکینہ...... میری باکردار بیٹی کے بارے میں میری بہن کیا کہہ گئی ہے۔ میری بختاور اتنی سلجھی ہوئی اتنی نیک سیرت کیا کسی قابل بھی نہیں؟''

وہ دُکھی ہوکر بولے تھے۔ رات کی چادر آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی، تارے روپوش ہونے لگے تھے۔ اماں پھٹ پڑیں۔

''نور محمد...... ساری غلطی تمہاری ہے۔ تم نے میری بیٹی کی زندگی برباد کردی ہے۔ تم نے اُسے دین کا راستہ دکھا دیا مگر دنیا کا علم دینا بھول گئے۔ وہ کبھی گھر سے نہیں نکلی۔ وہ اگر اب باہر گئی بھی تو اتنا حوصلہ نہیں کہ خود پر پڑنے والی نظروں کے جواب دے سکے۔ پہلے زمانے میں بھی تو عورتیں تجارت کرتی تھیں۔ اسلام 'رہبانیت' نہیں سکھاتا۔

وہ تم جیسے 'مولوی' ہوتے ہیں جو ایسی جمع تفریق کرتے رہتے ہو۔ ساری زندگی اپنے غصے سے ہم ماں، بیٹی کو ڈراتے رہے۔ مگر یاد رکھنا، تمہارے ڈر سے 'خدا' کا ڈر بہت بڑا ہے۔ بہت سے رشتے آئے مگر تم نے ٹھکرا دیے۔ اتنے عالم بنے پھرتے ہو......

یہ تو جانتے ہو ناں کہ بیٹی کا فرض ادا نہ ہو تو حج بھی قبول نہیں ہوتا۔ تُو نے ہمیں رول دیا۔ میری بختاور کے بالوں میں چاندی اُتر آئی ہے۔'' وہ زمین پر بیٹھی تھیں۔ خاک پر ہاتھ رکھے رات کے آخری پہر کے اِس منظر نے دروازے کا پٹ تھامے کھڑی بختاور کو پتھر کردیا تھا۔ چادر کی بکل مارے وہ کوئی مردہ وجود کھڑا تھا۔

رات سرسراتی رہی، مولوی نور محمد باہر نکل گئے۔

ہوائیں بین ڈالتی رہیں۔ بختاور نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ وقت نے مولوی نور محمد کے گھر کے سناٹے کو حیرت سے دیکھا۔ پھوپو کی باتوں کی سرگوشیاں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ بہت بہادر تھی، اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو پونچھے رات کے آخری پہر پہلی کے چاند نے اُس اُداس خاموشی کی ساحرہ کو ترحم سے دیکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں آنگن میں چلتی سوچ رہی تھی۔

''شادی نہ ہوئی تو کیا ہوا۔ اچھی لڑکیاں ماں باپ کا بھرم رکھتی ہیں۔ وہ دل مردہ کرلیتی ہیں۔ والدین کے آگے منہ نہیں کھولتیں۔ میں بہت بہادر ہوں...... بہت۔''

جامن کے پیڑ نے حیرت سے اُس بہادر لڑکی کو دیکھا جس کے خیال میں وہ بہادر تھی۔ گھونسلوں میں بیٹھے پرندوں نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر منہ پھیرلیا۔ رات بھیگتی رہی۔

☆......☆......☆

فجر کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ فضا میں ہوا کی ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چنبیلی کے پھولوں کے پاس بیٹھی مدھم پڑتی تاریکی میں ہتھیلیاں پھیلائے راز کھوج رہی تھی۔

مولوی صاحب گھر آئے تو انہوں نے سکینہ کو بتایا کہ صوفی صاحب کی بیٹی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ سکینہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کسی نیک سیرت پر بہتان باندھنا کتنا بڑا گناہ ہے آپ کو یقیناً علم ہوگا۔ جو لوگ بیٹیوں کو حیوانوں کی طرح گھروں میں باندھ کر رکھتے ہیں ناں، تو بیٹیاں دہلیز پار کرجاتی ہیں۔'' وہ بڑے عالم فاضل نظر آنے لگے تھے۔ چہرے پر عقلمندی کی گہری چھاپ تھی۔

''بیچارے صوفی صاحب! بہت رو رہے تھے۔ لوگ کہتے ہیں اُن کی بیٹی کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی اور صوفی صاحب اِس پر رضامند نہ تھے۔''

''اسلام میں تو لڑکی کی پسندیدگی کے متعلق واضح حکم ہے ناں۔ آپ جانتے ہیں ناں کہ حضرت خدیجہؓ نے اللہ کے نبی ﷺ کو پہلے خود ہی نکاح کا پیغام بھیجا

تھا۔ اسلام کو 'جبر' کا دین نہیں سمجھنا چاہیے۔ خود کو، فاضل سمجھ کے کنواری لڑکیوں کو گھر بٹھا دینا کہاں کا انصاف ہے؟''

سکینہ نے بہت سمجھ کے جواب دیا تھا۔ نور محمد کے چہرے پر جانے کیا تھا۔ کچھ ایسا جو صرف محسوس کیا جاسکتا ہو۔ سکینہ نے بات جاری رکھی۔

''ہماری بختاور اُس تربیت کے تحت 'چپ' ہے جو ہم نے اُسے دی، ورنہ تو ہمارا یہ فرض تھا، کبھی غور سے دیکھیے گا، بختاور کی آنکھوں میں خالی پن ہے۔ قدم کہیں رکھتی ہے اور پڑتا کہیں ہے۔

وہ ظاہر 'کچھ' نہیں کرتی مگر لہجے کی تھکن صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔'' سکینہ جیسے انگاروں پر چل رہی تھی۔ نور محمد جو چپ چاپ تھے اچانک چونک اٹھے۔ بختاور آسمان پر اِدھر اُدھر سرکتے ستاروں کی روشنی میں اُن کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح۔

''صابر'' سی بختاور...... بختاور نے ہولے سے سر پر لیا ہوا دوپٹا سرکا دیا تھا۔ پورے چاند کی روشنی میں عکس بہت واضح تھا۔ نور محمد کو لگا جیسے جان نکل رہی ہو۔ ہر طرف خون کی کھٹی باس ہی پھیل گئی ہو۔ بختاور کے سر پر بال ایسے لگ رہے تھے جیسے سفید سفید روئی کے گالوں کی سی برف کے دھاگے ہوں۔ وہ بولی تو آواز میں ہجرت زدہ پنچھیوں کی سی کُرلاہٹ تھی۔ اذیت ناک سی۔

''ابا...... میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے آپ کی عزت، آپ کا بھرم بہت عزیز ہے۔ انسان کیا کرے، وقت نہیں بدل سکتا۔ 'بندے' ہی 'بندوں' کے حقوق معاف کرسکتے ہیں۔ میں نے اپنے حقوق آپ کو معاف کیے ابا۔ میرا خدا بھی آپ کو معاف کرے۔'' وہ جیسے آنکھوں میں کھارے پانیوں کا دریا لیے کھڑی تھی۔ نور محمد نے دیکھا۔ اُن آنکھوں میں تھکن تھی، بے بسی تھی۔ اور خون تھا کسی بالغ عالم شباب کو پہنچنے والی لڑکی کے ارمانوں کا۔

وہ واپس پلٹی۔ ڈھلکتی چادر کو سر پر یوں جمایا۔ جیسے پھندا لگا رہی ہو۔ اور اُس پھندے کی گرہ کا درد نور محمد اپنے گلے پر محسوس کر رہے تھے۔

''ساری زندگی اپنے اصول، قائدے بنا کر ان کی بھٹی میں جلتا سڑتا رہا، اور آج راکھ راکھ وجود لیے بیٹھا ہوں۔ خدا کو تو راضی کرلوں مگر انسانوں کو راضی کیسے کروں۔ وقت تو بجائی گئی تالی کی آواز ہے۔ جو نہ پلٹتی ہے اور نہ ہی پلٹے گی۔'' سناٹوں نے بے نیازی کا گہرا لبادہ اوڑھ لیا۔

☆......☆☆......☆

بختاور کو نیند میں چلنے کی بیماری ہے۔ ہر ماہ کی طاق راتوں میں وہ آنگن کی کچی زمین پر چلتی رہتی ہے۔ جب چاند آسمان کی چوکھٹ پر دارد ہوتا ہے تو وہ سمٹ سی جاتی ہے۔ اُسے خوف محسوس ہوتا ہے۔

عمریں ڈھل جاتی ہیں مگر 'کنوارپنے' کا وہ احساس کبھی ختم نہیں ہوتا۔ زرق برق جگنو اُس کے بالوں کی چاندی میں پناہ لینے کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ مگر وہ انہیں جھٹک دیتی ہے۔

تنہائی کے دیار میں وہ چلتی چلی جاتی ہے۔ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے مگر یہ 'انتظار' باقی رہتا ہے۔ ختم ہی نہیں ہوتا۔ پہلے 'جان' لیتا ہے اور پھر بعد میں 'روح'۔ بیٹیاں ماں باپ کے بھرم رکھتی ہیں۔ اُن کی مجبوری ہوتی ہے۔

بیٹیاں 'امانت' ہیں۔ مگر نور محمد جیسے لوگ یہ 'خیانت' اپنا حق سمجھ کر کرتے ہیں۔ وقت بدلتا جاتا ہے۔

ابا کی بختاور کی نظریں آج بھی دستکوں کی آواز پر ٹھٹک جاتی ہیں مگر وہ ایک بات بھول جاتی ہے کہ شہزادوں کے آنے کے بھی اوقات ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ اوقات گزر جائیں تو پھر فقط انتظار ہی رہ جاتے ہیں۔ لامتناہی...... غیر مختتم......''

لڑکیوں کی دینی و دنیاوی دونوں تعلیمات اہم ہیں۔ ہر وقت کی یہ ہی ضرورت ہے اور ضروری ہے کہ نور محمد جیسے لوگوں کی سوچ بدلی جائے۔

ورنہ ہر گھر میں ایک بختاور تنہائیوں کا لبادہ اوڑھے پھر رہی ہوگی۔ رات میں چلنے کی بیماری اُس کا بھی نصیب ٹھہرے گی۔

☆☆......☆☆☆

انصاف

فرزانہ نگہت

کسی کا سکھ اُجاڑ کر کوئی کیسے سکھ پا سکتا ہے' اسلام آباد سے ایک آہوں بھری کتھا

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم کوئٹہ میں رہا کرتے تھے۔ ابا جان مرحوم فوج کے محکمہء حسابات (آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس) میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ ہمیں چھاؤنی میں جس جگہ کوارٹر ملا ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع اور کھلی تقریباً ویران سی جگہ تھی۔ وہاں بہت سا کوارٹروں کی ایک لمبی سی لائن تھی۔ جس کے سامنے پتلی سی ویران سڑک کے پار کچھ فاصلے پر فوجی افسروں کے سرخ چھتوں والے بڑے بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ہمارا کوارٹر لائن میں سب سے آخر میں تھا۔ اس کے دائیں طرف سڑک پار کر کے جو بنگلہ تھا۔ وہ ایک میجر 'اشتاق' کا تھا۔

اس بنگلے کے ہرے بھرے پھولوں سے لدے وسیع وعریض لان میں اکثر دو بے حد پیارے پیارے سے چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ اُن بچوں کی عمریں بالترتیب ڈھائی سال اور چار سال ہوں گی۔ سرخ و سفید رنگت' بھورے سنہرے بالوں ' سنہری آنکھوں والے وہ گول مٹول سے بچے واقعی ایسے پیارے اور خوبصورت تھے کہ ہر کسی کا دل انہیں پیار کرنے کو بے تاب ہونے لگتا تھا۔ وہ بچے تو اکثر دکھائی دے جاتے تھے۔ میجر صاحب بھی اپنی گاڑی میں آتے جاتے اکثر نظر آ جاتے تھے۔ لیکن ان بچوں کی والدہ ہمیں کبھی دکھائی نہ دی تھیں۔ شاید وہ باہر نکلنا پسند نہ کرتی تھیں یا بے حد پردہ دار قسم کی تھیں۔ ہمیں ان کے بارے میں بے پناہ تجسس تھا۔ ہمارا خیال تھا اُن کے بچے اگر اتنے خوبصورت اور پیارے تھے تو وہ خود بھی جانے کتنی حسین وجمیل ہوں گی۔

میں نے والدہ سے اکثر اصرار کیا تھا کہ ہم جا کر اُن سے مل آتے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ وہ ہچکچا کر رہ گئیں۔

پھر ایک شام جب میں کالج سے گھر واپس آئی تو میں نے ایک نہایت حسین وجمیل خاتون کو والدہ کے پاس بیٹھے باتیں کرتے پایا۔ وہ خاتون بلاشبہ ایسی حسین و دلکش تھیں کہ میں مبہوت و مسحور سی ہو گئی۔ میں سلام کرنا بھی بھول گئی۔

''آؤ بیٹی...... یہ سامنے والے بنگلے والی ہیں۔ تمہیں اِن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا نا؟'' والدہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ میں سنبھلی۔ ادب سے اُن خاتون کو سلام کیا۔ وہ مسکرائیں انہوں نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا۔ اُن کی آواز بھی بے حد حسین تھی۔

میں وہاں بیٹھ گئی وہ مجھ سے میری تعلیم' مشاغل اور مصروفیات کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ اپنے بارے

میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بی اے بی ایڈ کر رکھا تھا۔ شادی سے پہلے وہ لاہور کے ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ میجر اشفاق اُن کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اُن کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ جبکہ خود اُن کا میکہ مظفر آباد میں تھا۔

اس ملاقات نے ہمارے درمیان آئندہ ملاقاتوں اور میل جول کا دروازہ کھول دیا۔ اُن کا نام عذرا تھا۔ ہم انہیں خالہ جان کہنے لگے۔

جب بے تکلفی بڑھی تو ہمیں انہیں اچھی طرح سے جاننے کا موقع ملا۔ وہ بے حد خوش اخلاق، حسین فطرت، عمدہ رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ جن کی باتیں شگفتگی کے ساتھ ہی شائستگی کا رنگ لیے ہوئے ہوتی تھیں۔ بڑے بارسوخ اور امیر کبیر گھرانے سے تعلق کے باوجود اُن میں غرور و تکبر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ کوارٹروں میں رہنے والی تمام خواتین سے بے تکلفانہ ملتی تھیں۔ سب کے بچوں کو پیار کرتیں۔ یوں کوارٹر والیاں بھی اُن کے گن گاتی پھرتیں۔

لیکن ان کے شوہر میجر اشفاق اور ہی طرح کے آدمی تھے۔ اپنے خول میں بند کسی سے میل ملاپ نہ رکھنے والے۔ ابا جان سے اُن کی کبھی کبھار علیک سلیک ہو جاتی تھی اور بس……

☆……☆……☆

کچھ عرصہ گزر گیا۔

ایک دن خالہ عذرا ہمارے گھر آئیں تو وہ کچھ پریشان اور متفکر سی لگ رہی تھیں۔ والدہ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کے ہمسائے میں ایک بیوہ لیڈی ڈاکٹر آ کر آباد ہوئی ہیں۔ اُن کی تین بیٹیاں ہیں جو کافی عمروں کی ہونے کے باوجود ابھی تک کنواری چلی آ رہی



ہیں کیونکہ انہیں اپنی پسند کے رشتے نہ مل رہے تھے۔ یہ تینوں لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ خوبصورت بھی تھیں اور فیشن ایبل اور آزادی پسند بھی۔ ان ماں بیٹیوں نے آتے ہی اُن سے دوستی کرلی تھی۔ اور فوراً ہی اُن سے گھل مل گئی تھیں۔ اور ان کے گھر آنا جانا شروع کردیا تھا۔ میجر صاحب سے بھی اُن کا بے تکلفانہ ہنسی مذاق ہونے لگا تھا۔ یہ بے تکلفانہ ہنسی مذاق اب قابلِ اعتراض حد تک ترقی کرگیا تھا۔

خالہ عذرا جو دل کی ہمیشہ صاف اور کسی کے بارے میں شک وشبہ اور بدگمانی کو گناہ سمجھتی تھیں۔ اب چونک اٹھی تھیں۔ انہیں ایک دم ہی یہ احساس ستانے لگا تھا کہ ان ماں بیٹیوں کی نیتیں اچھی نہیں ہیں۔ وہ ان کی ازدواجی زندگی کے لیے خطرہ بن رہی ہیں۔ اُن کی فطری نیکی اور شرافت نے انہیں ان ماں بیٹیوں کو کچھ کہنے کی اجازت نہ دی۔ البتہ انہوں نے دبی زبان میں میجر صاحب سے ضرور ان کے ساتھ اس بے تکلفی اور روزافزوں تعلقات پر اعتراض کیا۔ جس پر انہوں نے انہیں بڑی خوبی سے ٹال دیا۔ اس سے ظاہر تھا خالہ عذرا نے کہاں مطمئن ہونا تھا۔

ان ماں بیٹیوں کی ان کے ہاں بکثرت آمدورفت اور اس موقع پر میجر صاحب کا بھی گھر پر ہونا آس پاس کے بنگلوں میں باتوں کا دلچسپ موضوع بنتا جارہا تھا۔ خالہ عذرا کی ہمدرد ہمسائیاں انہیں اپنے خاوند پر کڑی نظر رکھنے اور ان ماں بیٹیوں پر اپنے گھر کے دروازے بند کردینے کے مشورے دینے لگی تھیں۔

ہمیں یہ سب کچھ سُن کر شدید ذہنی دھچکا سا لگا۔ بے حد صدمہ پہنچا۔ خالہ عذرا جیسی خاتون کیا اس قابل تھیں کہ ان کے شوہر اُن سے بے وفائی کے مرتکب ہوتے؟ ان جیسی پاکیزہ اطوار، وفاشعار، خدمت گزار بیوی کو چھوڑ کر ایسی بے لگام اور بے حیا عورتوں کے چنگل میں جا پھنسے۔

یہ ایسا معاملہ تھا جس نے ہمیں اُلجھا کر رکھ دیا۔

بعد میں جب ہم نے ان لیڈی ڈاکٹر اور ان کی بیٹیوں کو دیکھا تو ہمیں احساس ہوا کہ معاملہ واقعی سنگین تھا۔ ان لوگوں کے ارادے اچھے نہ دکھائی دے رہے تھے۔

یہ لیڈی ڈاکٹر جن کا نام رفعت تھا ایک مقامی اسپتال میں بڑے عہدے پر فائز تھیں۔ انہیں خوب سہولیات اور مراعات ملی ہوئی تھیں۔ کچھ مرحوم خاوند کی جائیداد بھی تھی اس لیے ان کا رہن سہن خوب امیرانہ تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کو پہنچنے کے باوجود خوب اسمارٹ پُروقار اور شاندار تھیں۔

اُن کا ایک بڑا بیٹا تھا جو امریکہ میں تھا۔ اس نے وہیں ایک امریکی لڑکی سے شادی رچا رکھی تھی۔ تین بیٹیاں تھیں جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب فیشن پرست، آزاد خیال اور کھیل کھلاڑی ٹائپ کی تھیں۔ یہ بے حد ہوشیار اور چالاک بھی تھیں۔

بھرپور جوانی کے دن، فلرٹیشن اور ایسی ہی مہمات میں گزارنے کے بعد جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی شادی کی عمریں نکلی جارہی تھیں تو انہیں اپنے گھر بسانے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے بڑی بہن ارم کے لیے رشتے کی تلاش ہوئی۔ جو اس وقت تک پینتیس سال کی ہو چکی تھی۔ اِدھر اُدھر سر مارنے کے باوجود انہیں جب حسبِ خواہش کوئی کنوارا رشتہ نہ ملا تو انہوں نے شادی شدہ مردوں کو تاڑنا شروع کیا۔ یوں ہوتے ہوتے اُن کی نظر میجر اشفاق پر آن ٹکی۔

دراز قد، وجیہہ وپُروقار میجر اشفاق ارم کو بری طرح سے بھاگئے۔ چنانچہ اپنے منصوبے کے تحت ان ماں بیٹیوں نے انہیں شیشے میں اتارنے کی کوششیں شروع کردیں۔ شریف فطرت خالہ عذرا ان کی چالوں کو نہ سمجھ سکیں۔ اور ان سے خلوص ومحبت برتتی رہیں۔ انہیں اپنے شوہر پر مکمل اعتماد تھا اس لیے ان کے ساتھ ان عورتوں کی بے تکلفی انہیں کسی شک میں نہ ڈالتی تھی۔ نہ خطرے کا احساس دلاتی تھی۔ اپنے ہمدردوں کی باتیں بھی اُن کے دل کو نہ لگتی تھیں۔ پھر یہ بات انہیں شک میں مبتلا کرنے لگی کہ ان ماں بیٹیوں کی ان کے گھر آمد اس وقت ہوتی تھی جب اُن کے شوہر گھر پر ہوتے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا بے تکلفانہ رویہ بھی انہیں کھٹکنے لگے۔

پھر میجر اشفاق کا رویہ ان کے ساتھ کچھ سرد مہر سا ہوتا جارہا تھا۔ وہ بہت کم اُن کے پاس بیٹھتے اور انہیں اور بچوں کو کہیں گھمانے پھرانے بھی نہ لے جاتے۔ اکثر وہ تنہا ہی ڈاکٹر رفعت کے گھر چلے جاتے۔ جہاں سے کافی دیر بعد اُن کی واپسی ہوتی۔ خالہ عذرا کی شکایت پر وہ اُن

سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتے۔

☆☆......☆☆......☆☆

ڈاکٹر رفعت اور ان کی بیٹیوں نے میجر اشفاق کو پوری طرح سے اپنے چنگل میں پھانسنے کے لیے اب انہیں تحفے تحائف دینے اور ان کی دعوتیں بھی کرنا شروع کردیں۔ جن میں خالہ عذرا بھی مدعو ہوتیں۔ لیکن اُن کی حیثیت ثانوی ہی ہوتی۔ توجہ کا مرکز میجر اشفاق ہوتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میجر اشفاق ان عورتوں کے چنگل میں پوری طرح پھنستے چلے گئے۔ خالہ عذرا سے ان کا سرد مہر رویہ اب باقاعدہ بیزاری بلکہ نفرت کا رنگ اختیار کرتا گیا۔ جن پیارے پیارے بچوں میں اُن کی جان ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی اب انہیں اجنبی لگنے لگے۔ وہ اُن پر کوئی توجہ نہ دیتے اور مکمل نظر انداز کیے رکھتے۔ خالہ عذرا تنہا تھیں۔ کوئٹہ جیسی انتہائی دور افتادہ اور اجنبی جگہ پر اُن کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ ہمدرد...... اپنے میکے والوں کی پریشانی اور فکر کے خیال سے وہ انہیں اپنے حالات سے آگاہ کرنے سے ڈرتی تھیں۔ جبکہ میری والدہ انہیں بارہا مشورہ دے چکی تھیں کہ وہ انہیں خط لکھیں اور اپنے تمام حالات سے آگاہ کریں۔ ان کی بداخلت اصلاحِ احوال کے لیے کارگر ثابت ہوگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پانی بھی سر سے اونچا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ سنا جانے لگا کہ میجر اشفاق ارم سے شادی کرنے والے ہیں۔ اس خبر نے سب کو حیران پریشان اور سراسیمہ کردیا۔ بے چاری خالہ عذرا کے دکھ اور غم کے احساس سے ہمیں شدید رنج اور صدمہ پہنچا۔ لیکن ہم اپنی جگہ مجبور تھے۔ کچھ نہ کرسکتے تھے۔ والدہ نے البتہ اس مرتبہ بڑی سختی سے خالہ عذرا کو ہدایت کی کہ وہ اپنے میکے والوں کو ضرور خط لکھیں اور تمام حالات لکھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ خط لکھتیں میجر اشفاق نے انہیں طلاق دے دی۔

☆☆......☆☆......☆☆

خالہ عذرا کی طلاق کی خبر ہم سب پر بم بن کر پھٹی۔ ہمیں گویا سکتہ سا ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رفعت نے میجر اشفاق کی ارم سے شادی کی یہ شرط رکھی تھی کہ وہ پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے چلتا کریں۔ پھر شادی کے بارے میں سوچیں۔

طلاق کے بعد بے چاری عذرا خالہ اپنے معصوم بچوں کے ساتھ اپنی بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی مظفر آباد چلی گئیں۔ یوں ارم کے لیے میجر اشفاق کا گھر خالی ہوگیا۔ اب دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

میجر اشفاق نے دفتر سے چند ہفتوں کی چھٹی لے لی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ شادی کے بعد ارم کے ساتھ ہنی مون منانے کراچی جائیں گے۔ لیکن جب شادی میں چند ہی دن باقی رہ گئے تو ایک ایسا واقعہ رونما ہوگیا جسے دیکھ کر یہ حکیمانہ قول کہ ''مظلوم کی آہ سے ڈرو! یہ عرشِ الٰہی کو ہلا دیتی ہے۔'' حرف بحرف سچ ہوتا دکھائی دیا۔

ہوا یہ تھا کہ اس شام میجر اشفاق اور ارم شہر سے باہر لانگ ڈرائیو کا لطف اٹھا رہے تھے کہ ایک خطرناک پہاڑی موڑ پر جہاں گزشتہ دنوں کی بارشوں کے سبب سڑک پر پھسلن ہورہی تھی۔ کار بے قابو ہوکر اُلٹ گئی اور قلابازیاں کھاتی ہوئی سیکڑوں فٹ نیچے جاگری۔

انجن کے پھٹنے کے دھماکے کے ساتھ اس میں آگ لگ گئی اور اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ میجر اشفاق اور ارم بھی اڑتے ہوئے دور جاگرے۔ وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کے لوگوں نے انہیں بمشکل تمام اسپتال پہنچایا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے اور کافی حد تک جھلس چکے تھے۔

کئی دنوں کے علاج کے بعد جب انہیں اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تو میجر اشفاق کی یہ حالت تھی کہ ان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک کاٹ دی گئی تھیں۔ اور ارم کا چہرہ اس حد تک جھلس چکا تھا کہ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہوچکی تھی۔

اب ظاہر تھا اُن کی کیا شادی ہونی تھی۔

میجر اشفاق کو فوج سے سبکدوش کردیا گیا۔ وہ چپ چپاتے اپنے آبائی شہر سرگودھا چلے گئے۔ ڈاکٹر رفعت اپنی بیٹیوں کے ساتھ جانے کہاں غائب ہوگئیں۔

اس موقع پر سب نے یہی کہا کہ ان ظالموں کو خالہ عذرا اور ان کے معصوم بچوں کی آہ لگ گئی جس نے عرشِ الٰہی کو ہلا دیا۔ ڈاکٹر رفعت نے اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے ایک عورت کا ہنستا بستا گھر اجاڑا تھا اب اس کی بیٹی عمر بھر کے لیے اپنا گھر بسانے سے معذور ہوگئی۔

☆☆......☆☆......☆☆

چھٹی سچ بیانی

نرالے یہ بھید ہیں



مجید احمد جائی

ایک ظالم کا غرور و تکبر خاک میں ملاتی داستان

''سا...... ن...... پ...... سانپ۔'' آنچل نے اپنے پاپا کی چارپائی کے نیچے کالے مشکی سانپ کو پھن پھیلائے رات کی چاندنی میں دیکھا تو زوردار چیخ ماری۔ ڈر اور خوف سے الفاظ جیسے اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ چاند اپنی رعایا کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ چاندنی، رات کے اندھیر نگری کو روشنی بخشنے میں مگن تھی۔ سارے گھر والے نیند کے مزے لے رہے تھے۔ آنچل اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے تھے کہ آنچل نے ہوم ورک ختم کیا اور کتابوں سے نظریں ہٹا کر اپنے سوئے خاندان کو اک نظر دیکھا تھا۔ اسی لمحے نظریں اپنے پاپا گل زمان کی چارپائی کے نیچے پھن پھیلائے سانپ پر جا ٹھہری اور آنچل ڈر گئی۔ ڈر اور خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ گل زمان ساتھ پڑی دوسری چارپائی پر گہری نیند سو رہا تھا۔ آنچل کی خوف ناک چیخ کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا، کیا ہوا آنچل؟''

''پاپا...... آپ کی چارپائی کے نیچے سا...... ن...... سانپ ہے۔''

الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''پاپا وہ دیکھیں سانپ۔'' سانپ ابھی بھی اپنی جگہ پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ آنچل نے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے پاپا کو مخاطب کیا۔ گل زمان نے آنچل کے اشارے پر چارپائی سے نیچے دیکھا ہی تھا کہ سانپ غائب ہو گیا۔ ایسے جیسے ابھی تھا ہی نہیں۔

آنچل بھی حیران ہو گئی۔ ''ابھی تو یہیں تھا۔ کہاں چلا گیا۔'' دونوں باپ بیٹی حیران تھے۔

شور سن کر ایمان بھی جاگ گئی تھی۔ ایمان گل زمان کی دوسری بیوی تھی۔ کئی دنوں سے یہ سانپ گل زمان کا پیچھا کر رہا تھا۔ جیسے جنم جنم کا ویری ہو۔

گل زمان اپنے علاقے کا بڑا جاگیردار تھا۔ اس کا دبدبا چلتا تھا۔ اردگرد کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ روپے پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت، سے نواز رکھا تھا۔ انسان تو ناشکرا ٹھہرا ہے۔ اس کو جتنا نواز دیا جائے کم ہے۔ اس کی ہوس، بھوک نہیں ختم ہوتی۔ جب انسان کو اس کی اوقات سے زیادہ نواز دیا جائے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ یہی حال گل زمان کا تھا۔ اُسے رب رحمان نے بے پناہ عطا کیا

تھا۔ لیکن وہ بے رحم وارد ہوا تھا۔

گل زمان کی کئی ایکڑ اراضی تھی۔ ان کی دیکھ بھال خود کرتا تھا۔ اسے سبزیاں اُگانے کا بے حد شوق تھا۔ اپنی زمینوں کے درمیان، ایک ایکڑ پر اس کی حویلی تھی۔ لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ سب کچھ ہونے کے باوجود حویلی کچی تھی۔ اس کے در و دیوار کچے تھے۔ کمرے بھی کچے تھے۔ پکی اینٹوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ شاید گل زمان دولت پر مرتا تھا اور اسے خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بڑی حویلی تھی لیکن دل چھوٹا تھا۔ کمروں کے سامنے صحن کے درمیان ٹاہلی کے درخت باہنیں پھیلائے کھڑے تھے۔ کمروں کے پیچھے جانوروں کا باڑہ بنا رکھا تھا۔ جس میں اعلیٰ نسل کی گائے، بھینسیں، بھیڑ بکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ حویلی کے بیرونی گیٹ کے ساتھ کتے کی رہائش گاہ بنائی ہوئی تھی۔ گل زمان کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ وقتاً فوقتاً کتوں کی لڑائی کے مقابلے کرواتا تھا۔ اگر اس کا کتا لڑائی ہار جاتا تو اسی وقت گولی سے اڑا دیتا تھا۔ ہار اسے پسند نہیں تھی۔ وہ صرف اور صرف جیتنا پسند کرتا تھا۔

ایمان، گل زمان کی دوسری بیوی تھی۔ اس سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بڑی بیٹی آنچل جو سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ صائمہ ابھی چھوٹی تھی۔ گل شیر آنچل سے چھوٹا تھا۔ اس میں بھی گل زمان جیسا گھمنڈ تھا۔ پڑھنا اس کو پسند نہیں تھا۔ اس کی کمپنی ہمیشہ آوارہ لڑکوں کی ہوتی۔

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے جب مکان کچے اور لوگ سچے ہوا کرتے تھے۔ گل زمان اس زمانے میں غرور و تکبر سے سینہ تان کر چلا کرتا تھا۔ اس کی حویلی کچی تھی، صحن کچا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں آزادانہ کچن تھا۔ کھلے آسمان تلے چولہا جلا کرتا تھا، تندور آگ کے



شعلے آسمان کی طرف اڑاتا رہتا کیتلی میں چائے گرم ہو رہی ہوتی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر دں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گل زمان کی حویلی کے ساتھ مسجد تھی، مسجد کے ساتھ ہی کنواں تھا۔ بیلوں کی جوڑی سے پانی نکالا جاتا، یہ کنواں ٹیوب ویل کا کام کرتا۔ گل زمان اپنی فصلوں، کھیتوں کو سیراب کرتا، پڑوس کی عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

☆......☆......☆

کنول، گل زمان کی پہلی بیوی تھی۔ بااخلاق، خوبصورت، اچھی سیرت، نمازی، عبادت گزار تھی۔ شادی کے چند سال خوبصورت گزرے تھے۔ لیکن گل زمان بدلتا چلا گیا۔ کنول پر تشدد کرتا۔ آئے روز لڑائی جھگڑے طول پکڑتے چلے گئے۔ کنول سے گل زمان کے دو بیٹے، ارسلان، مشتاق پیدا ہوئے۔ دونوں ہی خوبصورت، حسن کے پیکر تھے۔

وقت بہترین گزر رہا تھا۔ پھر نا جانے گل زمان کو کیا ہوگیا۔ وہ شہر کی امیر زادی ایمان کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ ایمان والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ نک چڑھی، غرور سے لپٹی، اکڑ اکڑ کر چلنے والی۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ ادھر گل زمان بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ دونوں کی آنکھیں لڑیں اور بات شادی تک جا پہنچی۔ پھر وہ وقت آگیا جب کنول کی بربادی تھی اور ایمان جشن منا رہی تھی۔ ایمان، گل زمان کی شہزادی بن کر آنگن میں جلوہ گر ہوئی اور کنول کو بد چلنی کا الزام لگا کر، حویلی سے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔ کنول دونوں ننھے بیٹوں کو لیے والدین کے گھر چلی گئی۔ گل زمان نے اُسے جانوروں کی طرح مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ سفید چمکتے بدن پر نیل پڑ گئے تھے۔ گل زمان کی حویلی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ روانہ ہوئی اور رب رحمان سے انصاف کی فریاد کرتی اپنی ماں کے پاس جا پہنچی تھی۔

☆......☆......☆

کچھ عرصے سے کالا مشکی ناگ گل زمان کا پیچھا کر رہا تھا۔ کہتے ہیں کالے ناگ کا ویر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ جب تک انتقام نہ لے لے پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ دشمن کو کبھی بھی معاف نہیں کرتا۔ یہی کالا ناگ گل زمان کا دُشمن تھا۔ لیکن کیوں؟ کس لیے، یہ سوالات تھے جن کا جواب کوئی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا جواب گل زمان یا اس کی پہلی بیوی کے پاس تھا۔ پہلی بیوی..... جو گل زمان کے ظلم کا شکار رہی تھی۔

☆......☆......☆

انسان پر جنات سب سے زیادہ عاشق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح جنات بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کئی مومن، عابد، پرہیز گار، امن پسند دوسروں کا بھلا کرنے والے اور کئی انتہائی کمینے، بدمعاش، لوفر، شر پھیلانے والے، کافر، شیطان، فساد کرنے اور کروانے والے۔ بدمعاش، کمینے جنات اور ان کی اولادیں اشرف المخلوقات کو تنگ کرتی رہتی ہیں اور نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔ انسانوں سے جنم جنم کا ویر ہے۔ اسی طرح نیک صالح جنات انسان دوست ہوتے ہیں۔ لحہ لحہ انسانوں کے کام آتے رہتے ہیں۔

گل زمان کی پہلی بیوی کنول کے نام بہت سی زمینیں تھیں۔ جو گل زمان نے شادی کے وقت اس کے نام چڑھوا دی تھیں۔ اب اسے وہ زمینیں کھٹکتی تھیں۔ ان پہ قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کنول کسی طور پر یہ زمینیں دینا نہیں چاہتی تھیں۔ کنول کی زمینیں بہترین فصلیں اُگاتی تھیں اور اس رقبے سے پکی سڑک بھی گزرتی تھی۔ جس سے آس پاس کی زمین کی قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ندی بہتی تھی۔ ندی کنارے گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ دن کو یہاں سے گزرتے ہوئے خوف آتا تھا۔ بعض لوگ کہتے کہ یہاں جنات کا بسیرا ہے۔ ایک دو واقعے ایسے گزرے تھے کہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلتا چلا گیا۔ اس جھنڈ سے کوئی شخص چھوٹی سی ٹہنی توڑ لیتا، یا بکریوں کے لیے لے جاتا تو بکریاں اس ٹہنی کے پتے کھاتے ہی مر جاتی تھیں۔ البتہ مسواک کے لیے ٹہنی توڑی جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

گزرتے وقت کے ساتھ کنول دُنیا داری سے کٹ کر رہ گئی۔ جب دیکھو مصلے پہ بیٹھی ہے۔ راتوں کو عبادتیں ہو رہی ہیں۔ پھر ایک رات سب نے دیکھا کہ کنول اپنے کمرے میں نہیں ہے۔

گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ نہ وہ الہڑ میار تھی، کسی سے عشق لڑاتی اور گھر سے فرار ہو جاتی۔ اس کے کردار پر بھی کسی کو شک نہیں تھا۔ والدین، رشتے دار بھی اسے جانتے تھے۔ صرف گل زمان کو اس سے نفرت تھی۔ سبھی حیران تھے، کنول جا کہاں سکتی ہے۔ صبح کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، کنول گھر نہیں لوٹی تھی۔

آخر اس کی بوڑھی ماں نے ڈھونڈ ہی لیا۔ کنول بے سدھ اسی درختوں کے جھنڈ کے درمیان سو رہی تھی۔ پھر روز کا معمول بن گیا۔ کنول رات کی تاریکی میں سبھی کو سوتا چھوڑ کر اسی جھنڈ کی طرف چلی جاتی۔ وہاں گھنٹوں بیت جاتے۔

کنول نے ہر جمعرات کو وہاں چراغ جلانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے جب جمعرات کو یہاں دیے جلتے دیکھے تو وہ بھی دیے جلانے لگے۔ یہ سلسلہ چل نکلا۔ پہلے پہل محلے کی عورتوں نے آغاز کیا۔ پھر تو جنگل میں آگ کی طرح خبر دوسرے شہروں میں پھیلتی چلی گئی۔

جو بھی یہاں مراد لے کر آتا، پوری ہو جاتی۔ لوگ سبز کپڑے درختوں سے باندھ کر منتیں مان جاتے، جو بھی آتا اس کی مراد پوری ہوتی۔ بے اولاد جوڑے آتے، تو ان کی گود ہری ہو جاتی۔

کیکر والی بی بی کے نام سے اس جھنڈ کو منسوب کر دیا گیا۔ ہر جمعرات کو یہاں میلہ سا لگ جاتا۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ عورتوں کا ہجوم ہوتا، لنگر پکائے جاتے، تقسیم ہوتے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف کنول ہی جانتی تھی۔ کیونکہ پہلے پہل وہی تو اسی طرف آئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ کنول اس دُنیا سے اُس جہاں لوٹ گئی۔ اس کی موت اسی جھنڈ پر ہوئی تھی۔ ایک رات ادھر آئی اور ادھر کی ہو کر رہ گئی۔ اس کی وصیت کے مطابق اسے درختوں کے جھنڈ کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

گل زمان اپنے ہتھکنڈے آزمانے لگا۔ یہی موقع تھا کہ کنول کے جاتے ہی وہ اس کی زمینوں پر قابض ہو جانا چاہتا تھا۔ پیروں، فقیروں سے اسے بہت نفرت تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس جھنڈ کو ختم کرنے کی ٹھان لی۔ ایک رات اپنی فصلوں کو پانی لگاتے ہوئے اس نے جھنڈ کا رُخ کیا۔ کلہاڑی اس کے پاس تھی۔ اس نے جھنڈ کے ایک درخت کو کاٹ دیا۔ اس کا ایک دستہ کندھوں پر اٹھا کر گھر لے آیا۔ گل زمان لکڑی کا دستہ کندھوں پہ رکھے روانہ ہوا ہی تھا کہ کالا مشکی ناگ اس کے پیچھے ہو لیا۔ سانپ نجانے کہاں سے نکلا تھا۔ گل زمان جہاں سے گزرتا جا رہا تھا، سانپ بھی پیچھے پیچھے تھا۔ گل زمان نے لکڑی اپنی حویلی میں رکھ دی، اس کا پلان تھا کہ صبح کسی کو بلا کر یہ جھنڈ ختم کروا دوں گا۔ گل زمان بے فکری کی نیند سو گیا اور سانپ اس لکڑی کے دستے پہ بیٹھ گیا۔ آنچل اپنا ہوم ورک ختم کر کے سونے لگی تو اس کی نظر گل زمان کی چارپائی کے نیچے پڑی۔ اس نے چاندنی رات میں کالے مشکی ناگ کو دیکھ کر زوردار چیخ ماری تھی۔ اس کی چیخ کے ساتھ ہی سانپ غائب ہو گیا۔ صبح ہونے میں چند ساعتیں تھیں کہ زور کی آندھی چلنے لگی۔ کالی آندھی کسی طوفان سے کم نہیں تھی۔

صبح ہو چکی تو دوسرے لوگوں کی طرح گل زمان بھی اپنی فصلیں دیکھنے کی غرض سے چل پڑا۔ گل زمان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی فصلیں تو تباہ ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جنگلی جانوروں نے رات بھر دنگا

میری ماں کی دعا ہے!

ہر دشت تمنا کا ساحل میری ماں کی دعا ہے!
جو عزت مجھے حاصل میری ماں کی دعا ہے!
یہ ناممکن کہ میرا نصیب عرش عروج کو نہ پہنچے
مکہ کی فضا میں شامل میری ماں کی دعا ہے!
میری ذات کچھ بھی نہیں ذرہ خاک کے سوا
بخت رسا ہوں حاصل میری ماں کی دعا ہے!
کاش میں دیکھ پاتی وہ کعبے کی پہلی نظر کا منظر
پوشیدہ؟ چشم تر، چھاگل، میری ماں کی دعا ہے!
ابتدا سے انتہا تک دعائے عشق ہے! ماں ثمینہ
لابدی میری عفو کی سائل میری ماں کی دعا ہے!
شاعرہ: ثمینہ فیاض

فساد کیا ہو۔ حیران کن امر یہ تھا کہ گل زمان کی فصلوں کے ساتھ دوسرے لوگوں کی فصلیں ٹھیک ٹھاک کھڑی لہلہا رہی تھیں۔ صرف گل زمان کے کھیت اجڑ گئے تھے۔ لوگ حیران تھے۔ سبھی گل زمان کو جھنڈ سے لکڑی کاٹنے کی سزا بتا رہے تھے۔ گل زمان ضدی آدمی تھا اس نے کہاں ماننا تھا۔

ابھی یہ معاملہ حل نہیں ہوا تھا کہ شام ہو گئی۔ گل شیر اسکول سے واپس نہ آیا۔ گل شیر کو لوگوں نے دوپہر کو جھنڈ کے پاس بیٹھا تو دیکھا تھا، مگر کہاں گیا کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی کہتا کہ اسے پریاں اٹھا لے گئی ہیں۔ کوئی کہتا جنات نے مار دیا ہے۔ ہر کوئی چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ گل شیر کہیں نہ ملا۔ گل زمان پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ گل شیر کو ڈھونڈتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

☆......☆......☆

گل زمان کے صحن میں لکڑی کا دستہ پڑا خشک ہو رہا تھا۔ کالا سانپ دن کو غائب ہو جاتا۔ جونہی رات ہوتی سانپ لکڑی پر آ کر بیٹھ جاتا۔ لوگوں نے اسے مارنا چاہا مگر پل بھر میں غائب ہو جاتا۔ سانپ کے روپ میں جن تھا۔ جو گل زمان کو تنگ کر رہا تھا۔ اسے سزا دینا چاہتا تھا یا پھر موت۔

مسلسل بارہ دن یہ تماشا لگا رہا۔ یونہی لکڑی کو اٹھانے لگتے سانپ ظاہر ہو جاتا۔ لوگ پریشان تھے۔ گل زمان نے عاملوں سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بھی منتر پھونک مارے تھے مگر نہ سانپ غائب ہوا، نہ مرا۔ عاملوں نے سرتوڑ کوشش کر لی تھی مگر سانپ پھن پھیلائے موجود رہا۔ محلے کے عقیدت مندوں نے مشورہ دیا کہ لکڑی واپس جہاں سے کاٹی تھی وہی چھوڑ آؤ۔ گل زمان مرتا کیا کرتا۔ اسے سزا مل چکی تھی۔ عامل نہیں مان رہے تھے۔ لیکن لوگوں نے کہا شغل کے طور پر ایسا کر کے دیکھو تو سہی۔ ہو سکتا ہے اسی طرح مشکی ناگ پیچھا چھوڑ جائے۔ عاملوں نے پہلے تو نہیں مانا مگر جب بات نہ بنی تو حامی بھر لی۔ لکڑی کے دستے کو گل زمان نے اٹھایا اور واپس اسی جگہ رکھ آیا جہاں سے کاٹی تھی۔ شام ہو گئی سانپ کو آنا تھا نہ آیا۔

پھر دُنیا نے دیکھا، محلے میں منادی ہو گئی۔ سبھی توبہ کرنے لگے، جو نہیں مانتے تھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہ سلسلہ سالوں چلتا رہا۔ لوگوں کو فوائد ملنے لگے۔ لیکن گل زمان آرام سے نہیں بیٹھا تھا۔ عاملوں نے بھی ہار نہیں مانی تھی۔

عامل دوسرے شہر سے اپنے استاد کو لے آئے۔ استاد تو استاد ہوتا ہے۔ اُسے اپنے عمل پر فخر تھا۔ اُس نے گل زمان کو ساتھ لیا اور اپنے منتر، چلّے کر کے اس جھنڈ پر قابض ہونا چاہا۔ غرور اُس کے انگ انگ سے ٹپک رہا تھا۔ سیانے کہتے ہیں غرور رب رحمان کو پسند نہیں ہے۔

گل زمان اپنی آگ میں جل رہا تھا۔ عاملوں کو اپنا غصہ تھا کہ لوگوں کے سامنے رسوائی ہوئی تھی۔ ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ تو اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے۔ اپنا رعب جھاڑنا چاہتے تھے۔ لوگوں کو اپنا بنانا چاہتے تھے۔

عامل نے اپنے منتر شنتر شروع کر دیے۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ منہ میں گندی گھاس لے کر گردن گھماتا رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس نے مزدوروں کو جھنڈ کاٹنے پر لگا دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جھنڈ آدھے سے زیادہ کٹ گیا۔ عقیدت مند، رو رہے تھے۔ کئی خوش ہو رہے تھے۔ اور پیر کی قابلیت پر رشک کر رہے تھے۔ پیر صاحب بھی خوش تھے۔ اس کے عمل کامیاب ہو رہے تھے۔ لوگ پیر کو چومنے لگے۔ کوئی ہاتھوں کو چوس لینے کے انداز میں چوم رہا ہے۔ کوئی اس کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔ کوئی قربان ہو رہا تھا تو کوئی نذرانے پیش کرنے کے لئے بے تاب کھڑا ہے۔

دن بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور لکڑیاں لوڈ کرنے کا مرحلہ آیا۔ جو کٹ گئی تھیں وہ اٹھوانے کا حکم ملا۔ ٹریکٹر ٹرالی منگائی گئی۔ جو جھنڈ کٹنے سے بچ گیا اسے صبح کے پلان میں چھوڑ دیا گیا۔ پیر صاحب ستانے لگا۔ لیکن ابھی خطرے کے

بادل منڈلا رہے تھے۔ یونہی مزدور لکڑیاں اٹھانے کے لیے آگے بڑھے۔ کالے مشکی سانپوں کی فوج امڈ آئی۔ پھر لوگوں نے تماشا دیکھا۔ اتنے سانپ نا جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ ہر ٹہنی، ہر دستے پر ایک سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ پیر صاحب کی بولتی بند ہو گئی۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی، اپنے سارے منتر پڑھ لئے مگر کچھ بنا نہ سکا۔ پیر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ غصے میں اٹھا اور خود لکڑیاں اٹھانے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی لکڑی کو ہاتھ لگایا۔ سانپوں نے حملہ کر دیا۔ پھر اس کا جو حشر ہوا دُنیا نے دیکھا۔ سانپوں نے اسے مار دیا تھا۔ اس کے جسم کے ہر حصے کو ایسے نوچا جیسے آوارہ کتے کسی مرے ہوئے جانور کو کھاتے، پھاڑتے ہیں۔ پیر کو قبر بھی نصیب نہ ہوئی۔ گل زمان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ پاگلوں کی طرح بالوں کو نوچ رہا تھا۔

جو نہیں مانتے تھے وہ بھی گرویدہ ہو گئے تھے۔ جھنڈ کی کئی لکڑیاں آج بھی موجود ہیں۔ عقیدت مندوں کا رش لگا ہے۔ لوگ جمعرات کے جمعرات لنگر پکاتے ہیں۔ چراغ جلائے جاتے ہیں۔ دن ہو رات رونق ہی لگی رہتی ہے۔ نہیں رہا تو گل زمان کا غرور، تکبر اور خود گل زمان بھی چل بسا۔

دس سال کا عرصہ پل بھر میں گزر گیا۔ گل زمان پاگلوں کی زندگی جیتے جیتے آخر موت کے فرشتے کی بانہوں میں چلا گیا۔

ایمان بدل چکی ہے۔ اس نے توبہ کر لی اور اپنی زندگی دین کے اصولوں کے مطابق گزارنے پر عمل پیرا ہے۔ اس کی دونوں بیٹیاں پیا گھر سدھار گئی ہیں۔ کنول کے بیٹے گل زمان کی ساری زمینیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ جھنڈ کے اردگرد دیوار بنا کر عقیدت مندوں کے آسانی کر دی گئی ہے۔ مسافر خانہ بنایا گیا ہے۔ لنگر صبح و شام تقسیم ہو رہے ہیں اور اس کی نگرانی کنول کے بیٹے کر رہے ہیں۔

سب کچھ ویسا کا ویسا ہے لیکن نہ رہا تو گل زمان اور اس کا غرور نہیں رہا۔ کنول کی قبر پھولوں سے لدی رہتی ہے۔ بیٹے قرآن خوانی کرواتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ اور یہ صدقہ جاریہ جاری ہے۔

☆☆......☆☆

روگ عمر بھر کا ہے



نبیل جاوید

رشتوں کے فریب' زندگی کو بنجر کر دیتے ہیں' ایک ماں کا بیٹی سے عجب انتقام

''امی آج پھر انگلش پڑھانے والی ٹیچر چھٹی پر تھی۔ پلیز امی امتحان سر پر ہیں۔ اور ہماری ٹیچر روز چھٹی پر ہوتی ہے۔ آٹھویں جماعت کا بورڈ کا امتحان ہوتا ہے۔ امی پلیز میری ٹیوشن کا کچھ کریں۔'' میں نے اسکول سے واپس آتے ہی آج پھر شور مچا دیا۔ امی نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹی! آج تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔''

شام کو ابو گھر آئے تو امی نے کہا کہ سمیرا آج پھر ٹیوشن کا کہہ رہی تھی۔ اس کی ٹیوشن کا کچھ کریں۔''

ابو نے کچھ سوچا اور بولے۔ ''میں صبح ہی اپنی بہن کے گھر جاؤں گا۔ اور اپنے بھانجے سے بات کروں گا۔''

حسب معمول ابو صبح اٹھے۔ گھر کی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر امی جان سے کہنے لگے کہ آج سمیرا کی اسکول سے چھٹی کروا لو۔ میں سمیرا کی پھوپی کی طرف جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کتنی دیر لگے گی۔ تم سمیرا کے ساتھ مل کر جانوروں کے لیے چارہ کاٹ لینا۔'' یہ کہہ کر ابو چلے گئے۔

دن ڈھلے ابو واپس آئے تو امی کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ حسیب سے بات کر لی ہے وہ کل سے سمیرا کو ٹیوشن پڑھانے آئے گا۔''

''میں اُس وقت کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ برتن دھو کر واپس آئی تو امی نے بتایا کہ تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ کل سے حسیب آئے گا تمہیں پڑھانے کے لیے۔''

یہ خبر سن کر میں دل ہی دل میں خوش ہو گئی۔ کیونکہ میرا کزن حسیب انگلش کا گرو تھا۔ اور ہمارے خاندان میں اس کی قابلیت کی دھاک بیٹھی تھی۔ حسیب میں ویسے تو سب کچھ پرفیکٹ تھا مگر ایک کمی تھی کہ اُسے غصہ بہت زیادہ آتا تھا۔ ہم کزن لڑکیوں سے تو وہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ بہرحال مجھے تو خوشی اس بات کی تھی کہ میرا بورڈ کا امتحان اب انشاء اللہ بہت اچھا ہونے والا تھا۔ آخر ٹیوشن حسیب نے جو پڑھانا تھی۔ اور بے شک مجھے حسیب کی قابلیت پر فخر تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن میں خوشی خوشی اسکول گئی اور تمام دوستوں کو بتایا کہ آج میرا کزن حسیب آ رہا ہے مجھے انگلش گرائمر پڑھانے۔'' میری بات سن کر میری کلاس فیلوز بہت خوش ہوئیں۔

اسکول سے چھٹی ہوئی تو گھر واپس پہنچ کر امی نے کہا کہ جلدی سے کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ چار بجے حسیب نے آنا ہے۔ تم اس کے آنے سے پہلے تیار



رہنا۔''

''امی آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گی۔''

چار بجنے میں دس منٹ تھے کہ حسیب آ گیا۔

ابو نے مجھے کہا کہ پُتر باہر آؤ۔ حسیب آ گیا ہے۔ اور اپنی چھوٹی بہن سے کہو کہ وہ جلدی سے چائے بنا کر لائے۔''

حسیب اُن کی بات سُن کر بولا کہ نہیں ماموں جی، میں ابھی چائے پی کر آیا ہوں۔'' میں کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تو حسیب نے کہا کہ میرا ایک عدد رف رجسٹر لے کر آ جاؤ۔''

میں رف رجسٹر لے کر گئی تو حسیب ابو سے کہہ رہا تھا کہ ماموں جی آپ کو میری طبیعت کا تو پتا ہی ہے۔ پڑھائی کے دوران تھوڑی بہت مار پیٹ تو ہوتی رہتی ہے۔ کل کو آپ لوگ یہ نہ کہنا کہ ہماری بیٹی کو مار کیوں رہے ہو۔ اور باقی انشاء اللہ اگر اس نے دل لگا کر پڑھا تو کامیابی کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔''

''حسیب پُتر تم اپنی مرضی سے پڑھاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں تم پر بھروسا ہے پتر!''

پہلے دن حسیب نے مجھ سے انگریزی کے چند فقرے پوچھے تو میں ایک بھی ٹھیک طریقے سے نہیں بنا سکی۔ حسیب خفا ہو کر بولا۔

''سارا سال اسکول میں کیا کرتی رہی ہو۔''

میں نے کہا کہ میں اسکول تو جاتی تھی مگر ہماری میڈم نے ہمیں انگلش گرائمر کروائی ہی نہیں۔''

''تم پریشان نہ ہونا۔ بس تم کو دل لگا کر پڑھنا ہے اور جو میں لکھ کر دوں یا پڑھاؤں، تم دھیان سے پڑھنا اور

یاد کرنا۔ مجھے امید ہے کہ اللہ سب بہتر کرے گا، انشاء اللہ......"

پہلے دن اتنی ہی باتیں ہوئی اور وہ گھر واپس چلا گیا۔

آپ کو یہ بات بتاتی چلوں کہ ہم لوگ ڈیرے پر رہتے تھے اور حسیب گاؤں کے اندر رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں امی، ابو، ایک بڑا بھائی، میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن ام ہانی تھی۔

میں آٹھویں میں، چھوٹی بہن چوتھی میں اور بڑا بھائی نوکری کرتا تھا۔ ابو سارا دن کھیتی باڑی کرتے تھے۔ امی اور میں مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈالتی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن حسیب پورے چار بجے ہمارے گھر آ گیا۔ وہ باہر صحن میں ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے بڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ امی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ابو اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے۔ حسیب نے مجھے انگریزی کے چند اصول بتائے۔ اور وہ بولتا جاتا اور مجھے کہتا کہ "لکھتی جاؤ۔" اس طرح میری پڑھائی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

ایک دن وہ سبق دے جاتا تو دوسرے دن اس کا باقاعدہ ٹیسٹ لیتا۔ میں بھی دل جمعی سے پڑھ رہی تھی۔

تقریباً 2 ماہ باقاعدگی سے میں نے حسیب سے دل لگا کر خوب لگن سے پڑھا۔ اب مجھے انگریزی پر کافی عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اگر کلاس میں کوئی چھوٹا موٹا ٹیسٹ ہوتا تو میرے مارکس اچھے آتے تھے۔

آٹھویں کے امتحانات ہونے تک حسیب مسلسل مجھے پڑھاتا رہا۔ تقریباً ہر مضمون میں ہی اُس نے میری بھرپور مدد کی تھی۔

امتحانات سے فارغ ہوئی تو حسیب کو اللہ نے جاب دے دی۔ اور وہ لاہور چلا گیا۔ جاتے ہوئے ہمیں ملنے آیا تو مجھ سے میرا رول نمبر لے گیا۔

میں اس کے لاہور جانے سے پریشان ہو گئی تھی کہ اب میری پڑھائی کا کیا ہو گا۔ وہ میری پریشان صورت دیکھ کر بولا۔

"سمیرا تم پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ تم کامیاب ہو گی۔ اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گی۔"

میں دن رات رزلٹ کا انتظار کرنے لگی۔ جب ہمارا رزلٹ آیا۔ تو میں نے ابو سے کہا کہ ابو آپ جائیں اور حسیب کے گھر سے پتا کر کے آئیں میرے رزلٹ کا کیا ہوا ہے۔"

اس دور میں ہمارے پاس موبائل نہیں تھا۔ اور حسیب کے گھر موبائل فون تھا۔ حسیب نے فون کر کے بتایا کہ ماموں کے گھر اطلاع دے دیں کہ سمیرا نے 850 میں سے 680 نمبر حاصل کیے ہیں۔"

میری اس کامیابی کی خبر سن کر ابو خوشی خوشی گھر واپس آئے اور آتے ہی مجھے آواز دی۔

"سمیرا پتر تو کہاں ہے؟ جلدی میرے پاس آ۔"

میں دوڑ کر آئی تو ابو نے بتایا کہ پتر تو پاس ہو گئی ہے اور تو نے 680 نمبر حاصل کیے ہیں۔" اتنی بھرپور کامیابی تو میرے گمان میں بھی نہ تھی تو بھلا مجھے یقین کیونکر آنا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح میں اپنے اسکول گئی۔ تو تمام کلاس فیلوز نے مجھے مبارکباد دی۔ انگریزی کے مضمون میں، میں نے 150 سے 134 نمبر حاصل کیے تھے۔ میں بہت خوش تھی۔ اور دل ہی دل میں حسیب کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اگر وہ اُس وقت محنت اور دل جمعی سے مجھے نہ پڑھاتے تو شاید آج میرا رزلٹ اس سے مختلف ہوتا۔

☆......☆......☆

دو ماہ بعد حسیب گھر چھٹی پر آیا تو دوسرے ہی دن ہم سے ملنے کے لیے آیا۔ اب حسیب وہ پہلے والا نہیں لگ رہا تھا۔ پہلے سے بالکل مختلف، صحت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ اور چہرے کا رنگ بھی کافی صاف لگ رہا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب حسیب کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

وہ تقریباً دو گھنٹے ہمارے گھر رہا۔ میں تو ایسی مدہوش ہوئی کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ حسیب ابو کے پاس بیٹھ کر زمینوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اور میں اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ جاتے جاتے حسیب نے پھر جلدی آنے کا کہا اور چلا گیا۔

وہ تو چلا گیا پر جاتے جاتے میرے دل کا قرار، سکون اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ میری سوچ تھی۔ ورنہ حسیب کو پیار محبت سے نفرت تھی۔ شاید اُس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہی نہ ہو۔

میں دن بدن اُس کی محبت میں گرفتار ہوتی

گئی۔ رات کو سونے لیٹتی تو اچانک پہلو میں حسیب آ جاتا۔ میں اُس کی محبت کے سحر میں ایسا گرفتار ہوئی کہ ہر طرف حسیب ہی حسیب ہو گیا۔

کچی عمر کی محبت تو ویسے بھی ایک طلسماتی دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔

جب کبھی بھی میں حسیب کے گھر جاتی تو اس کی تصویر سے ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ میری پھوپی مجھ سے پوچھتیں کہ سمیرا اندر کمرے میں کس سے باتیں کر رہی تھیں۔'' تو میں کہتی پھوپو جی کسی سے بھی نہیں آپ کو وہم ہوا ہے۔''

کچھ دن خاموشی سے گزرے تو پتا نہیں امی کو کیا ہوا کہ انہوں نے میری شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔

میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میری امی ہمارے خاندان سے نہیں تھیں۔ وہ دوسری برادری سے تھیں۔ وہ اکثر اپنی برادری کے لڑکوں کا ذکر میرے سامنے کرتی رہتی تھیں۔ میں ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی۔ کیونکہ میرے دل و دماغ پر تو صرف حسیب ہی چھایا ہوا تھا۔ جب امی زیادہ زور دینے لگیں تو میں نے ابو کو صاف صاف بتا دیا کہ ابو میں نے شادی کرنی ہے تو صرف حسیب سے۔ ابو امی مجھے اپنی برادری کے لڑکوں سے شادی کا کہتی ہیں۔'' میری بات سن کر ابو نے امی کی خوب بے عزتی کی۔ کیونکہ ابو، امی کے خاندان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

اس دن کے بعد سے امی کا رویہ مجھ سے بہت زیادہ اچھا رہنے لگا۔ بات بات پر میری تعریف کرنے لگیں۔ مجھے اُن کی باتیں سن کر بڑا عجیب سا ہوتا تھا۔ بہر حال میں نے ابو کو مجبور کیا کہ آپ حسیب کے گھر جا کر میرے رشتے کی بات کریں بلکہ پھوپو سے کہیں کہ سمیرا کا رشتہ ہم نے آپ کے گھر ہی کرنا ہے۔''

ابو شام کو امی اور بھائی کو ساتھ لے کر گئے اور وہاں جا کر کہا کہ ہم سمیرا کے رشتے کے لیے آئے ہیں حسیب کے لیے۔

یہ سن کر میری پھوپی حیران و پریشان رہ گئیں اور ابو کو ایک سائیڈ پر بلا کر کہا کہ بھائی اتنی جلدی کیا تھی رشتہ کرنے کی۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔''

پھوپو بہن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی تھیں۔ اس لیے اُن کے دل کو وا ہمے ستائے تو ماں جائے سے بنا تکلف پوچھنے لگی تھیں۔

ابو نے کہا کہ میری بہن سب ٹھیک ہے۔ ہم تو دل سے آپ کو رشتہ دینے آئے ہیں۔''

پھوپو نے اسی وقت حسیب کو فون کر کے بتایا کہ تمہارے ماموں سمیرا کے ساتھ تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔''

حسیب نے کہا کہ امی آپ لوگ بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں مجھے قبول ہے۔'' یوں میری نسبت حسیب سے طے پا گئی۔

پھوپو نے بہت جلد منگنی کا وعدہ بھی کر لیا۔

☆......☆......☆

کچھ ہی دنوں کے بعد دھوم دھام سے میری منگنی حسیب سے کر دی گئی۔ اُس دن میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ چند جوڑے کپڑے اور ایک سونے کی انگوٹھی ہمیں دے گئے۔ چھ سال ہماری منگنی رہی۔ چھ سال میں میری پھوپی یعنی حسیب کی امی کی وفات ہو گئی۔ میرا بھائی نوکری چھوڑ کر گھر واپس آ گیا۔

ہماری منگنی کو چھ سال گزرے تھے اب حسیب کے بڑے بھائی نے ابو سے میری شادی کا مطالبہ کر دیا۔ ابو نے تو فوراً ہاں کر دی۔ پر امی کہنے لگیں۔

''ابھی ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اگر ان لوگوں کو اتنی ہی جلدی ہے تو آپ اُن سے کہو کہ آپ لوگ فرنیچر بنوا لو۔ باقی جہیز کا سامان ہم بنا لیں گے۔'' انہوں نے امی کی بات پر عمل کرتے ہوئے فرنیچر بنوا کر ہمارے گھر بھیج دیا اور میری شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگی۔

اِدھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اُدھر میری امی نے میرے کان بھرنے شروع کر دیے۔ کبھی کہتی کہ دیکھو کیسا فرنیچر دیا ہے اُن لوگوں نے۔ اس کی پالش ٹھیک نہیں۔ یہ پرانا پالش کر کے دے دیا ہے۔''

غرض یہ کہ ہر وقت ہمارے گھر میں ایسی ہی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران ہم نے موبائل بھی لے لیا۔ اور میں کبھی کبھار حسیب سے بات کر لیتی تھی۔ لیکن اُس کا رویہ بڑا ہی عجیب ہوتا۔ جب بھی کال کرتی تو وہ پوچھتا کہ کیوں کال کی۔ اور اُس کا رویہ سخت سے سخت ہوتا۔ مجھے بڑا عجیب لگتا کہ اب تو ہماری شادی بھی قریب ہے۔ پھر حسیب کا رویہ مجھ سے ایسا کیوں ہے۔ اوپر سے امی کی باتیں مجھے دن بدن پریشان کر رہی تھیں۔ کہتے ہیں جب قسمت میں

بُرا لکھا ہو تو انسان سے غلط فیصلے خود بخود ہو جاتے ہیں۔

امی کی باتوں کا اثر ہم سب پر ہونے لگا اور ایک دن ابو نے ٹرالی منگوا کر حسیب لوگوں کو فرنیچر واپس بھیج دیا۔ اور اُن سے کہا کہ ہم نے آپ کو رشتہ نہیں دینا۔ آپ لوگ حسیب کا رشتہ کہیں اور کر دیں۔''

حسیب لوگوں نے صلح کرنے کی کافی کوششیں کی مگر ہم لوگ نہیں مانے۔

امی نے ابو کو کہا کہ ایک اچھا رشتہ آیا ہے سمیرا کے لیے۔ آپ چاہیں تو دیکھ لیں۔ امی نے میری اس لڑکے اکرم سے فون پر بات بھی کروائی۔ غرض یہ کہ میں امی کے اشاروں پر چلنے لگی تھی۔

اکرم نے ابو کو بتایا کہ 120 ایکڑ زمین اس کے نام ہے اور چند مویشی بھی اُس کے اپنے ہیں۔''

پھر کیا تھا ابو نے جلدی سے میری شادی اس سے کر دی۔ شادی والے دن پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں نے حسیب کا نمبر ڈائل کیا۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز سے ہیلو کہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج میری شادی ہے۔

تو اس نے کہا کہ یہ تمہاری امی کا سارا کھیل ہے۔ یاد رکھنا ایک دن تم بہت پچھتاؤ گی۔''

اُس وقت تو مجھے کافی غصہ آیا اور میں نے حسیب کو کافی کھری کھری سنائیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور آخر میں صرف اتنا کہا کہ یہ تمہیں آنے والا وقت ہی بتائے گا۔''

مجھ پر امی کی باتوں کا نشہ تھا۔ اس لیے اُس کی باتوں کا خاص خیال نہیں کیا۔

شام کو رخصت ہو کر میں اکرم کی دلہن بن کر اُس کے گھر آ گئی۔

☆......☆......☆

شادی کے دو ماہ بعد ہی مجھ پر اکرم کا اصلی چہرہ ظاہر ہونے لگا۔ زمانے کی ہر برائی اُس میں تھی۔ روزانہ شراب پینا، چرس پینا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ گھر جب بھی آتے ایک نئی ہی بات کرتے۔ کبھی کہتے تم نے گھر کے کام نہیں کیے۔ کبھی کہتے میرے کپڑے استری کیوں نہیں کیے۔

ان روز روز کی باتوں سے ٹینشن لے لے کر میں ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ بن گئی۔ رو دھو کر دو سال گزر گئے اور میں ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ بیٹی پیدا ہوتے ہی میری جو تھوڑی بہت عزت تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

اکرم مجھ پر ہر طرح کے ظلم کرتے اور میں خاموشی سے برداشت کرتی رہتی۔ اس دوران ایک دن اچانک میری طبیعت خراب ہوئی۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس گئی۔ تو ڈاکٹر نے بتایا کہ تم اب کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ تمہارا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور تم کسی بھی قسم کی ٹینشن نہ لیا کرو۔''

امی کو کال کر کے بتایا کہ ڈاکٹر یہ کہہ رہا ہے کہ اب تم ماں نہیں بن سکتیں۔ امی بھی پریشان ہو گئیں۔

اکرم کو بتایا تو آپے سے باہر ہو گئے اور کہا کہ اب میرے گھر میں تمہارا کوئی کام نہیں۔ جاؤ اپنے گھر۔'' اور اس طرح اکرم مجھے میرے ابو کے گھر چھوڑ گئے۔ میری تڑپتی سسکتی زندگی باپ کی دہلیز پر آ گئی۔

☆......☆......☆

آج مجھے ابو کے گھر آئے چار سال ہو گئے ہیں۔ اکرم نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔ دو سال پہلے حسیب کی شادی ہو گئی تھی اور ماشاء اللہ اب اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ میں نے واپس آ کر بہت کوشش کی کہ حسیب سے بات کروں لیکن وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔

آج میں اپنے دامن میں کانٹے اور تلخ حقیقتیں لیے اپنے ماں باپ کے اوپر بوجھ بنی بیٹھی ہوں۔ کاش کہ اُس وقت میں نے اپنی ماں کی بات نہ مانی ہوتی۔ اور ابو کو حسیب کے لیے انکار نہ کیا ہوتا۔

آج ہمارے گھر میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بھائی نشئی بن گیا ہے اور ابو سے زمین کا حصہ مانگتا ہے۔ چھوٹی بہن بھی ماں کی باتوں میں آ گئی ہے۔ ابو کی حیثیت اُس نوکر کی سی ہو گئی ہے جو بنا بیگار کے دن رات مالک کی غلامی کرتا ہے۔

پورے گھر کا کنٹرول امی کے ہاتھ میں ہے۔ میں مجبور ہو کر امی ابو کے گھر بیٹھی ہوں۔ ایک ایک روپے کو ترس رہی ہوں۔ اور آج میری ماں! میرے سامنے ہے۔ اِک ذرا سے حق کو استعمال کرنا میرے لیے زندگی بھر کا روگ بن گیا۔ کیا کبھی رشتے اس طرح بھی فریب دے سکتے ہیں! ہاں...... لوگو! خدا سے بس یہ دعا کیا کرو کہ مولا سب کو اپنے رشتوں کے فریب سے بچائے (آمین)۔

☆☆......☆☆

کینسر!

ثمین عزالہ نیہاں


ناموں کے فرق سے جنم لینے والی غلط فہمی، اُس دوشیزہ کو راہِ راست پر لے آئی تھی

بہت دنوں سے میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ کچھ عجب کیفیت تھی۔ کبھی اُداسی کا دورہ پڑتا، کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کبھی دل چاہتا خوب زور زور سے روؤں...... کبھی جسم کے مختلف حصوں میں شدید درد ہوتا۔ بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی، وزن بھی کم ہو رہا تھا۔ نزلہ تو جیسے جان سے چمٹ گیا تھا۔ گلا خراب، چھینکیں شروع ہوتیں تو لگاتار آتی ہی رہتیں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اور کیا ہو رہا تھا۔ اب تو دوسرے لوگ بھی ٹوکنے لگے تھے۔ جو دیکھتا یہی کہتا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟''

''فریش نظر نہیں آ رہی ہو؟''

''کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' جب صبر کی حد ختم ہو گئی تو ایک دن میں نے اپنے میاں سے کہا۔

''سارا زمانہ مجھے کہہ رہا ہے کہ تم ٹھیک نظر نہیں آ رہی ہو۔ مجھے خود بھی اپنی طبیعت صحیح نہیں لگ رہی ہے۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا؟''

''تو جاؤ ڈاکٹر کے پاس۔ جا کر چیک اپ کروالو۔'' فطری بے نیازی سے جواب ملا۔

''میں خود سے تو نہیں جاؤں گی۔ آپ جائیں گے تو جاؤں گی۔''

''سارے زمانے میں اکیلی گھومتی ہو۔ ڈاکٹر کے پاس جانے میں کیا ہے۔'' طنزیہ لہجے میں جواب ملا۔

''جب آپ کہیں جاتے ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ اکیلے جانا ہی پڑتا ہے۔'' میں نے حقیقت جتلائی۔

''ڈاکٹر کے پاس بھی اکیلی چلی جاؤ۔'' اب کی بار حکمیہ لہجہ تھا۔

''جی نہیں! وہاں اکیلی نہیں جاؤں گی۔'' میں بھی ہٹ دھرمی سے بولی۔

میرا اسٹار بھی وہی تھا جو ان کا تھا۔ اس لیے میری عادات بھی اُن کی طرح تھیں۔ وہ ضدی تھے تو میں ان سے زیادہ ضد کرتی تھی۔

پھر دوسرے دن خود ہی کہنے لگے کہ چلو تیار ہو جاؤ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

سچ بات تو یہ تھی کہ میں ڈاکٹر اور دواؤں سے دور دور ہی رہتی تھی۔ دوائی مجھ سے کھائی ہی نہیں جاتی تھی۔ طبیعت کی خرابی میں ڈاکٹر کے پاس مجبوراً جاتی بھی تھی تو صرف مشورے کی حد تک۔ دواؤں کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ مگر اس دفعہ بات کچھ سیریس لگ رہی تھی، کوئی نہ کوئی انفیکشن ضرور تھا۔ میری حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ سر کے بال اتنی تیزی سے جھڑ رہے تھے کہ میں گنجی ہونے کو تھی۔ اب تو چکر بھی آنے لگتے تھے۔ مجبوراً ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی طرح میری کیفیت کو نوٹ کیا اور ڈھیروں ٹیسٹ لکھ کر دے دیے۔ جس کو لازماً کروانے کی تاکید بھی کی گئی۔ بلڈ ٹیسٹ، شوگر، ای سی جی، بلڈ پریشر اور یورین کے ٹیسٹ لیے گئے۔ معدہ کا الٹرا ساؤنڈ بھی ہوا۔ الغرض کہ ہر امکانی بات کا خیال رکھ کر ضروری ٹیسٹ کروائے گئے۔ دو دن کے بعد رپورٹ ملنی تھی اور رپورٹ دکھانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس دوبارہ جانا ضروری تھا۔ کیونکہ رپورٹ دیکھ کر ہی دوائی تجویز کی جاتی۔

جس دن رپورٹ لینا تھا اس دن صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ میرے میاں تو بارش میں بھی جانے کو تیار تھے۔ میں نے ہی سختی سے منع کر دیا۔

شام تک بارش رُک گئی۔ اس وقت گھر میں مہمان آ گئے۔ میری بھانجی اور اس کا شوہر...... چائے کے دوران میرے میاں نے رپورٹ لانے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ تو بھانجی کا شوہر جو رشتے میں میرا داماد تھا۔ فوراً کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

''چلیے خالو جان ابھی رپورٹ لے آتے ہیں۔ اس کے پاس بائیک تھی۔ میرے میاں بھی فوراً تیار ہو گئے۔ کیونکہ وہ گاڑی لے کر جانے سے بچ گئے تھے۔

میں نے منع بھی کیا کہ موسم خراب ہے۔ مگر وہ دونوں میری بات سنے بغیر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میری بھانجی بھی اپنی دوست کے گھر ملنے چلی

گئی اور میں کچن میں مصروف ہوگئی۔

☆......☆......☆

وہ دونوں رپورٹس لے کر فوراً ہی واپس آ گئے۔ میں کچن ہی میں تھی۔ جب مجھے اپنے داماد کی آواز سنائی دی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ خالہ کو دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ یہ بیماری ان کو ہے۔''

''اس بیماری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تک جڑ نہ پکڑ لے ظاہر نہیں ہوتی۔''

یہ میرے میاں کا جواب تھا۔ میں ان کی آوازیں سن کر کچن سے نکل آئی۔

''یہ کس کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تو رپورٹس لینے گئے تھے۔ کس بیماری کی بات کر رہے ہیں۔'' میں یہ سوچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی، جہاں وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو مجھے ایسا لگا۔ میرے بھانجی داماد نے تیزی سے کوئی چیز اپنی رانوں کے نیچے چھپائی ہو۔

''کیا ہوا رپورٹ لے آئے۔'' میں نے اس کی حرکت نظر انداز کر کے پوچھا۔

''نہیں آج نہیں ملی۔'' انہوں نے جواب دیا مگر نجانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ غلط بول رہے ہوں اور مجھ سے رپورٹ چھپا رہے ہوں۔ یقیناً وہ رپورٹ ہی کا لفافہ ہوگا جو بھانجی داماد نے پھرتی سے چھپایا تھا۔

'مجھے کوئی خطرناک بیماری تو نہیں ہوگئی۔' میں نے دل میں سوچا۔ 'شاید اسی لیے مجھ سے رپورٹ چھپا رہے ہیں۔'

اچانک مجھے ان کی بات یاد آئی جو ابھی کہہ رہے تھے۔

''یہ بیماری جب تک جڑ نہیں پکڑ لے ظاہر نہیں ہوتی۔''

''کینسر......'' ہاں کینسر ہی ایسی بیماری ہے جو بہت دیر سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب تک جسم میں پنجہ گاڑ چکی ہوتی ہے۔

انسان کتنا ہی مضبوط اعصاب کا ہو...... خطرناک بیماری کا سن کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ میری بھی وہی کیفیت تھی۔

''کہیں ...... مجھے بھی......!'' اس سے آگے سوچنے کی میری ہمت نہیں تھی۔ کسی بھی خطرناک بیماری کا انجام موت ہوتا ہے اور موت ایک زندہ حقیقت ہونے کے باوجود کوئی خوشی سے قبول نہیں کرسکتا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''سچ بتایئے میری رپورٹ ملی ہے یا نہیں؟''

''مل جائے گی تمہیں اتنی جلدی کیوں ہونے لگی۔ جب میں لانے کو کہہ رہا تھا تو تم ٹال رہی تھیں۔ اب کیا ہوا۔'' انہوں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ اگر رپورٹ میں میری کسی خطرناک بیماری کی اطلاع ہے تو آپ مجھ سے چھپائیں نہیں، مجھے بتا دیں۔ میرا حوصلہ بہت بڑا ہے۔''

میں نے اپنی زبان سے تو یہ سب کہہ دیا۔ مگر اندر سے کانپ رہی تھی۔ مجھے خود اپنا لہجہ ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

''تم خواہ مخواہ ہی وہم کر رہی ہو۔ تم شکی مزاج تو نہیں تھیں۔ کیا ہوگیا تمہیں...... اگر بیماری ہو بھی تو اس کا علاج بھی ہے۔ آج کل میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ اب لاعلاج بیماری کا علاج بھی ڈھونڈ لیا گیا ہے۔''

میرے شوہر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ بھی میری ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھ کر پریشان ہیں۔

شاید مجھے بھی ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں تاکہ میں اپنی کسی بڑی بیماری کا سن کر شاکڈ نہ ہو جاؤں۔ اور حقیقت قبول کرلوں۔

حقیقت سے فرار تو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ میں بھی یہ ہی چاہ رہی تھی کہ مجھے اصل حقیقت معلوم ہو جائے چاہے جتنی بھی تلخ ہو۔

اب میں اپنی کیفیت بھول کر اس کھوج میں تھی کہ مجھے رپورٹ کے بارے میں پتا چل جائے۔ انسان کے اندر تجسس کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور پھر مجھے جلدی ہی پتا چل گیا کہ مجھے کیا بیماری لاحق ہوگئی ہے۔

میرے شوہر مجھ سے چھپ کر اپنے کسی ڈاکٹر دوست کو میری کیفیت بتا رہے تھے اور میری رپورٹ بھی بتاتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر احسان اللہ لیبارٹری کی رپورٹ میں تو کینسر ہی تشخیص ہوا ہے۔''

میں اس وقت باتھ روم میں تھی اور وہ کمرے میں، مجھے نہ پا کر اپنے دوست سے میری رپورٹ پر ڈسکس کر رہے تھے۔ وہ کھڑکی میں کھڑے فون پر بات کر رہے تھے۔ میں باتھ روم سے نکلی تو مجھے وہ نہیں دیکھ سکے اور یوں میں نے ان کی تمام گفتگو سن لی۔

''گویا میرا خدشہ صحیح تھا۔'' میں خاموشی سے کمرے سے باہر آگئی۔ مجھے واقعی شاک لگا تھا۔ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں اُمید اور نا امیدی کی کیفیت کے درمیان تھی۔ خواہش تھی کہ خدا کرے یہ رپورٹ غلط ہو مگر یہ ایک مستند لیبارٹری کی رپورٹ تھی۔

مجھے وہ سب علامات یاد آنے لگی تھیں جو کینسر کے مریض میں ہوتی ہیں اور وہ سب مجھ میں تھیں۔ میرا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میرے بال گر رہے تھے اور سستی بھی بہت ہوگئی تھی۔ بھوک بھی ختم ہوگئی تھی۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔

مجھ جیسی خوش مزاج اور بے فکر عورت کو یہ بیماری...... مجھے اپنے اوپر ترس آنے لگا۔

''میرے بچے ابھی تو بہت چھوٹے تھے۔ میری عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟'' پھر بیماری سے زیادہ اس بیماری کی تکلیف مجھے خوفزدہ کر رہی تھی۔ نجانے کیا ہوگا۔

☆......☆......☆

اسی دن رات کو عشاء کی نماز کے بعد دیر تک اپنے گناہوں کی معافی اللہ سے مانگتی رہی۔ اپنی صحت کے لیے بھی دعا کرتی رہی، پھر جب میں بستر پر گئی تو میں نے اپنا احتساب کیا۔

نجانے میری کسی نادانستہ یا دانستہ بات سے کسی کا دل دکھا ہو۔ کسی کی غیبت کی ہو۔ کبھی میں نے کسی سے حسد کیا ہو۔ کوئی ناشکری مجھ سے ہوئی ہو...... شاید اسی کی سزا میں مجھ پر یہ بیماری آئی ہے۔

سب سے پہلے مجھے اپنے شوہر کا خیال آیا۔ میں نے ہمیشہ اُن کی ناشکری کی، شکایتیں کی، بدزبانی اور نافرمانی بھی بہت کی۔

اکثر مردوں کا مزاج تیز ہوتا ہے وہ بلاوجہ بھی غصہ کر جاتے ہیں۔ مگر اُن کے غصے کے جواب میں، میں نے اُن سے زیادہ غصہ کیا۔ اُن کی مرضی کے خلاف بہت سے کام کیے۔

میں نے والدین کا حق بھی صحیح ادا نہیں کیا۔ نہ اپنے والدین کا، نہ اپنے شوہر کے والدین کا۔ انہیں کبھی جھڑک بھی دیا، نافرمانی بھی کی۔

بچوں کا فرض بھی ٹھیک سے ادا نہیں کیا۔ اُن کو بوجھ سمجھا، اپنی نیندیں خراب ہونے کا شکوہ کیا۔

حقوق العباد کا بھی خیال نہیں رکھا۔ پڑوسیوں کے حقوق بھی پورے نہیں کیے۔ حتیٰ کہ اپنے گھر کے کاموں کو بھی کبھی خوشی سے نہیں کیا۔ ہمیشہ اُن کو بے دلی سے کیا۔

یہ سب سوچ کے میں بہت روئی، اللہ نے مجھ پر کتنی عنایتیں کیں۔ کتنی نعمتیں دیں اور میں نے ناقدری کی۔

گھر، شوہر، بچے اور شوہر کے گھر والے...... ان سب کی ذمہ داری مجھ پر اللہ نے عائد کی اور میں نے اپنے فرائض کو بوجھ سمجھا۔ کبھی اللہ کا حکم سمجھ کر نہیں ادا کیا۔ اپنی جوانی اور صحت کے نشے میں رہی۔ مجھے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اگر یہ نعمت مجھ سے چھن جائے تو کیا ہوگا۔ میں نے کبھی نعمتوں کا شکر ادا کیا نہ نعمتوں کے چھن جانے سے پناہ مانگی۔ اب اگر اللہ میری آزمائش کر رہا ہے تو میں پریشان کیوں ہو رہی ہوں؟

بیماری اور شفا سب منجانب اللہ ہے۔ مجھے اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔ پھر میں یہ نیت کر کے سوگئی کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی غلطیوں کی اصلاح کروں گی۔ اپنے فرائض کو دیانتداری سے ادا کروں گی اور جو نعمتیں اللہ نے بخشی ہیں۔ اُن کا دل سے شکر ادا کروں گی۔ شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کروں گی۔ اور بزرگوں کی خدمت کروں گی۔ میں اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو کر جتنی بھی زندگی ہے اس کو اللہ اور رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق گزار دوں گی۔

☆......☆......☆

اور پھر صبح اٹھ کر نہ میں نے بچوں پر غصہ کیا نہ میاں کی چیزوں کو پھیلانے والی عادت سے نالاں ہوئی، نہ ساس سسر کو ناشتا دیتے وقت یہ سوچا کہ صبح صبح مجھے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ بچوں کو اسکول کی تیاری میں مدد کی۔

میاں کو خوش مزاجی سے آفس بھیجا اور امی ابا کو دھیان سے ان کی مرضی کا ناشتا بنا کے دیا۔ اور پھر سب کاموں سے فارغ ہو کر، میں نے رپورٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ہاں آج مجھے صبح اٹھنے میں نہ سستی ہوئی، نہ کام کاج میں کاہلی محسوس ہوئی بلکہ طبیعت جو گری گری سی رہتی تھی۔ وہ کیفیت نہیں تھی۔ آج میں فریش تھی اور اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کر رہی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مجھے وہ رپورٹ بھی مل گئی۔ جو مجھ سے چھپائی گئی تھی۔ وہ میرے بیڈ پر تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ شاید میرے شوہر یہ رپورٹ کسی ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہے تھے اور غلطی سے بھول کر چلے گئے۔

میں نے لفافہ اٹھایا اور اس کو کھولنے سے پہلے جب میری نظر لفافے پر لکھے ہوئے نام پر پڑی تو میں حیران ہوگئی۔

اس پر کسی فرحت خان صاحب کا نام لکھا ہوا تھا اور جن کی عمر 74 سال تھی۔ جبکہ میرا نام فرحت جہاں اور میری عمر چوبیس سال ہے۔ اندر سے رپورٹ نکالی تو اس میں واضح الفاظوں میں کینسر لکھا ہوا تھا۔ اور یقیناً میری رپورٹ نہیں تھی۔

میرا دل چاہا میں زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ میرے دل پر سے بوجھ اُتر گیا۔ میں ہلکی پھلکی ہوگئی، پھر میں اسی وقت شکرانے کے نفل پڑھنے کھڑی ہوئی۔ مجھے پتا چل گیا کہ زندگی بہت بڑی نعمت ہے مگر اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے۔

اب میں سوچ رہی ہوں۔ میرا اللہ کتنا مہربان ہے۔ میں اپنے گناہوں سے تائب ہوئی اور اس نے مجھے صحت اور زندگی کی نوید بخش دی۔

ورنہ یہ رپورٹ میری بھی ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت دینا چاہے تو کسی طرح بھی دے دے۔ بشرطیکہ بندہ خود بھی اپنی ہدایت کا طلب گار رہے۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ اس کی رحمت بخشش کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔

شاید میری کسی نیکی سے خوش ہو کر اس نے مجھے یہ نورِ ہدایت بخشا...... میری آزمائش کی...... میں اس کی دل سے شکر گزار تھی۔

اس کے ساتھ مجھے ان دو قابل ترین اشخاص پر بھی ہنسی آئی جن کی ذرا سی لاپروائی سے ان سمیت مجھے بھی پریشانی ہوئی۔

میرے شوہر ایک مالیاتی ادارے میں آڈٹ آفیسر ہیں اور بھانجی داماد فارما سوٹیکل کمپنی میں سیلز آفیسر، دونوں ہی حساس شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو ہر کام بہت احتیاط اور سوچ سمجھ کر کرنا ہوتا ہے۔ مگر......

ایک نقطے نے محرم سے مجرم کر دیا کے مصداق...... ذرا سے نام کے فرق سے خود بھی پریشان ہوئے اور مجھے بھی ٹینشن میں ڈال دیا۔ مگر بظاہر معمولی سی بات نے میرے اندر بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔

دوسرے دن شام کو جب میری اپنی رپورٹ آئی تو اس میں سوائے خون کی کمی کے کوئی بیماری نہیں تھی۔ اور میں پھر ایک بار سجدہ شکر ادا کرنے لگی۔

☆☆......☆☆

پامسٹ

ملک محمد اکرم آہیر

ایک دست شناس کا دلخراش قصہ، جو گردشِ ایام کا شکار ہو گیا' میانوالی سے

پروفیسر انور اقبال جو کہ ایک دست شناس تھا۔ وہ لوگوں کے ہاتھ دیکھ کر اُن کی پوری زندگی کا احاطہ کر لیتا۔ اس کی پیش گوئیاں اکثر سچ ثابت ہوتی تھیں۔ جو کہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر وہ خود اپنا، اپنے بیوی بچوں کا کبھی ہاتھ نہیں دیکھتا تھا۔ پروفیسر انور جب بھی کھانا کھانے لگتا تو منہ میں نوالہ لے جانے سے پہلے اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ جب کبھی وہ نماز پڑھتا تو اپنے ہاتھ خدا کے آگے پھیلانے سے پہلے اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا تا کہ وہ ہاتھ پر لکھی ہوئی تقدیر کو نہ پڑھ لے۔

جب بھی کوئی ایسا موقع آتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اپنی تقدیر چھپا لیتا۔ جب بھی اس کا بیٹا اپنا ہاتھ دکھانے کی فرمائش کرتا تو وہ بیٹے سے مختلف حیلے بنا کر اس کو ٹال دیتا۔ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود خود سے بیگانہ نظر آتا۔ مگر یہ اس پر قدرت کی ایک راز دانی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے دل و دماغ پر اللہ تعالیٰ نے ایک پردہ ڈال دیا تھا۔

وقت گزرتا گیا تو پروفیسر انور اقبال کی شہرت بھی آہستہ آہستہ عروج پر پہنچ گئی اور کئی اس کے مرید بن گئے اور اکثر لوگوں کی جو اس نے پیش گوئیاں کی تھیں، وہ سچ ثابت ہو چکی تھیں۔ اُس کی شہرت کے ستارے نے زمانے کے افق پر چمکنا شروع کر دیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے دن بھی پھرنے لگ گئے، تو پروفیسر انور اقبال مشہور ہو گیا۔

☆☆......☆☆☆

اس کے شہرت کی خبر اس کے علاقے کے کونسلر جمال خان تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اس نے قومی الیکشن لڑنا تھا۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے آنے والے حالات کی آگاہی کے لیے بڑا بے قرار رہتا ہے مگر وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ اس کی تقدیر اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور انسان قدرت کے فیصلوں سے واقف نہیں ہوتا مگر اس کے اندر حرص نے اس کو پروفیسر انور کی دہلیز پر جانے پر مجبور کر دیا۔

جمال ایک چالباز انسان تھا جو لالچ کی رو میں بہہ کر انسانی زندگیوں سے اکثر کھیلتا تھا۔ وہ پروفیسر انور کے گھر پہنچ گیا۔

پروفیسر انور اقبال نے اس کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا اور مختلف واقعات سے اس کو روشناس کرایا۔ پہلے اس کے ماضی کو کھنگال دیا پھر حال پر نظر دوڑائی اور پھر اس کے مستقبل کی پیش گوئی بھی کر دی۔

پروفیسر انور نے جمال خان سے کہا کہ تمہارے ہاتھوں میں ایم این اے کی لکیر دیکھ رہا ہوں۔ تم اس بار سیاست میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔
مگر ساتھ ہی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں کامیابی تو ملے گی مگر وہ دیرپا نہیں ہوگی۔''
جس پر کونسلر جمال نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔
پروفیسر انور نے کہا کہ ایسا ہو کر رہے گا، تمہیں ایک طرف تو کامیابی ملے گی مگر دو سال بعد یہی کامیابی تمہارا زوال بن جائے گی۔''
''کوئی بات نہیں وقت آنے پر پتا چل جائے گا کہ کیسی شہرت اور کیسی زوال پذیری ہوگی۔''
جمال خان پروفیسر کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا تو اس نے کہا کہ میں تمہیں اپنے پاس بطور سیکریٹری رکھنا چاہتا ہوں اور تمہیں تنخواہ بھی تمہاری سوچ سے زیادہ دوں گا۔ پورے پچاس ہزار روپے۔''
پچاس ہزار کا نام سنتے ہی پروفیسر کی تو قسمت جاگ گئی۔ اور وہ یہ خوشخبری سن کر پھولے نہ سمایا۔
جمال خان نے اجازت مانگتے ہوئے کہا کہ تم نے حامی بھری تو میں تمہیں ایڈوانس تنخواہ ادا کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے آمادگی کا اظہار کیا تو جمال خان نے ایک شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔
پروفیسر کے ہاتھ کانپنے لگ گئے شاپر لینے سے پہلے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ رقم لیتے وقت اس کی نظر اس کے اپنے ہاتھ پر نہ پڑھ جائے۔
جمال نے کہا کہ کل صبح میری کوٹھی پر آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔''
جمال خان جب جانے لگا تو اس کے چہرے پر خوشی واضح نظر آ رہی تھی۔ جیسے اس نے پروفیسر انور کو پا کر کوئی قارون کا خزانہ حاصل کرلیا ہو کیونکہ اس کے



اندر کا لالچی شیطان انگڑائیاں لے رہا تھا اور جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب میں لوگوں کی قسمت کا حال پروفیسر کی مدد سے جان کر اُن کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے گا اور اُس کے بعد میں اور بھی طاقتور بن جاؤں گا۔''

مگر وہ یہ بات بھول رہا تھا کہ جب دولت شہرت اور طاقت تینوں چیزیں انسان کے اندر اکٹھی ہوجائیں تو وہ انسان کو حیوان بنادیتی ہیں۔ اس کے بعد خدا کی بے آواز لاٹھی اُس پر برسنی شروع ہوجاتی ہے۔ وہ گناہوں کی دلدل میں اس طرح دھنسنا شروع ہوجاتا ہے کہ پھر کبھی اس دلدل سے باہر نہیں نکل سکتا۔

پروفیسر بے حد خوش تھا اندر جاکر بیوی کو بتایا تو وہ بھی بے حد خوش ہوئی کہ اب ہمارے دن پھر جائیں گے مگر پھر کچھ سوچ کر اس کے چہرے کے رنگ اُڑ گئے تو پروفیسر نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کھلتا ہوا چہرہ اچانک مرجھا سا کیوں گیا؟''

اس کی بیوی نے کہا کہ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ یہ دولت ہمارے گلے کی ہڈی بن کر اٹک نہ جائے۔''

پروفیسر نے اس کو سمجھایا اور جمال خان کی کوٹھی پر جانے کے لیے اپنا سامان پیک کرنے لگ گیا۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی وہ گھر سے رخصت ہوکر جمال خان کی کوٹھی پر جا پہنچا تو اس کے کوٹھی پر کھڑے سکیورٹی گارڈ نے کہا کہ جمال خان الیکشن مہم پر گئے ہوئے ہیں' وہ ذرا دیر سے واپس آئیں گے اور مجھے تمہارے متعلق بتا گئے تھے۔ آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ جہاں آپ کو رہنا ہوگا۔''

سکیورٹی گارڈ اس کو لے کر کوٹھی میں آ گیا۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر اسے اس کا کمرہ دکھایا۔ پروفیسر نے سکون حاصل کیا۔ اور وہ بے حد خوش تھا کہ اب میں بھی بہت جلد اس کے دن بھی پھر جائیں گے۔''

وہ بھول رہا تھا کہ وقت ایک ایسی تیز دھار کی مانند ہے جو کہ اپنے راستے میں آئے پانی کی طرح ہر ایک چیز کو بہا کر لے جاتا ہے اس کا دل چاہا کہ اپنا ہاتھ دیکھے مگر پھر خاموش ہوگیا۔

☆......☆......☆

''وقت گزرتا گیا جمال خان نے ایم این اے کا الیکشن جیت لیا اور اس نے اس خوشی میں بہت بڑی پارٹی کی اور شہر کے نامور سرمایہ دار اور جاگیرداروں کو بھی دعوت دی تو اس پارٹی میں ایک بہت بڑی بزنس مین ماریا بھی آئی تھی۔ جمال خان نے تمام لوگوں کے سامنے پروفیسر کو اپنا سیکریٹری بنانے کا کہا اور ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ پروفیسر صاحب بہت بڑے پامسٹ بھی ہیں۔''

یہ سننا تھا کہ تمام لوگ پروفیسر کے گرد جمع ہوگئے اور اپنا ہاتھ دکھانے کی درخواست کرنے لگے۔ جمال خان نے موقع کی مناسبت سے اعلان کیا کہ آپ احباب جتنے بھی یہاں موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً آپ سب لوگوں کے ہاتھ دکھاؤں گا مگر فی الحال آپ میری پارٹی کو انجوائے کریں۔''

پارٹی ختم ہونے کے بعد تمام لوگ گھروں کو چلے گئے مگر جمال خان نے ماریا کو روک لیا کیونکہ وہ ماریا سے شادی کا خواہشمند تھا مگر ماریا اس فیصلے سے ابھی آگاہ نہیں تھی۔

جمال خان نے کہا کہ آؤ اندر ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

ابھی وہ دو قدم چلے تھے کہ جمال خان نے ماریا سے کہا کہ آپ اندر جاکر بیٹھیے' ہم دونوں ابھی آتے ہیں۔'' ماریا اندر چلی گئی تو جمال خان نے پروفیسر سے کہا۔

''یہ میری ایک اچھی دوست ہے اور میں اس دوستی کو اب ایک نیا رُخ دینا چاہتا ہوں۔ یعنی اس سے شادی کا خواہشمند ہوں۔ تمہیں اس کا ہاتھ دیکھ کر مجھے بتانا ہے کہ اس کے ساتھ ہماری شادی کامیاب ہوگی کہ نہیں۔ دیگر باتیں بھی اُن کے بارے میں بتانا۔'' یہ کہہ کر جمال خان مزید گویا ہوا۔

''میں فریش ہوکر ابھی آتا ہوں تم اتنی دیر میں اس کا ہاتھ دیکھ لینا۔'' پروفیسر جیسے ہی اندر گیا تو ماریا

پہلے سے اس سے ملنے کے لیے بے قرار تھی۔
اس نے پروفیسر سے کہا کہ مجھ سے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا تب جاکے آپ کو ہاتھ دکھاؤں گی۔''
پروفیسر نے وعدہ کرلیا تو ماریا نے کہا کہ جمال خان مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ جب آپ نے ہاتھ دیکھا تھا۔''
پروفیسر نے کہا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا مگر بتانے سے پہلے آپ کو اپنا ہاتھ دکھانا ہوگا۔''
ماریا نے کہا میں ہاتھ ضرور دکھاؤں گی مگر میرا دل جمال خان سے شادی کا خواہشمند نہیں کیونکہ......''
ماریا نے ایک گڈی نوٹوں کی بطور نذرانہ پروفیسر کے ہاتھ پر رکھ دی۔ تو پروفیسر نوٹ دیکھ کر لالچ میں آ گیا۔ اس نے ماریا سے وعدہ کرلیا کہ وہ سب کچھ سچ سچ جمال خان کے بارے میں بتائے گا۔'' پروفیسر نے اپنے بیگ میں رقم رکھتے ہوئے کہا کہ پہلے تم اپنا ہاتھ دکھاؤ۔''
جب پروفیسر نے ماریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا تو اس کے اندر کا شیطان جاگ گیا کیونکہ ماریا دولت کے ساتھ ساتھ حسن کی دولت سے بھی مالا مال تھی، دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ میری زندگی میں آجائے تو میری تو زندگی ہی بدل جائے گی۔'' ماریا ایک خودمختار اور روشن خیال ذہن کی مالک تھی۔
پروفیسر نے ماریا کو شیشے میں اتارنا شروع کردیا۔ ماریا بھی اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ پروفیسر نے زبان کی مٹھاس سے ماریا پر ایسا جادو کیا کہ وہ دل ہی دل میں پروفیسر کو سراہنی لگی کہ پروفیسر ایک خوش اخلاق اور شریف النفس انسان ہے جبکہ جمال خان ایک مفاد پرست اور خاندانی رسومات کا پابند آدمی تھا۔
اس کا ذہن ایک جاگیردارانہ سوچ کا مالک تھا۔ وہ خاندانی اصولوں پر اپنی زندگی گزارنے پر کاربند تھا۔ جو عورتوں کو اپنی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے تھے۔
پروفیسر نے جمال خان کے بارے میں ساری تفصیلات سے ماریا کو آگاہ کردیا اور کہا کہ تم کبھی بھی اس شخص کے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی کیونکہ وہ عورتوں کو غلام بنانے کی پالیسی پر گامزن ہے اور وہ قبائلی نظام کا قائل ہے۔
''ماریا نے کہا کہ تم مجھ سے شادی کرو گے؟'' یہ سننا تھا کہ پروفیسر کا رنگ اُڑ گیا مگر دل میں خوش بھی تھا کہ ماریا اس کے پورے وجود سے پیار کرنے لگ گئی ہے۔
وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ اس نے سوچا پروفیسر کو وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر نچا سکتی ہے جبکہ جمال خان کو کبھی بھی وہ اپنے بس میں نہیں کرسکتی۔''
ماریا نے کہا کہ میں اسے شادی سے انکار کردوں گی۔ تم اس کو چھوڑ کر میری کوٹھی میں آ جانا۔'' ابھی باتیں جاری تھیں کہ جمال خان بھی آ گیا۔ اب وہ ایم این اے بن چکا تھا۔ ماریا نے اجازت چاہی تو جمال خان نے کہا کہ میں صبح تمہارے گھر آؤں گا۔ اب میں تم سے شادی کرنے کا خواہشمند بھی ہوں۔''
''مجھے کچھ وقت چاہیے، اس بات کو سوچنے کے لیے۔''
''ٹھیک ہے ایک دو دن بعد تم مجھے اپنی فیصلے سے آگاہ کردینا۔'' یہ کہہ کر ماریا چلی گئی تو جمال خان نے پروفیسر سے اس کے متعلق پوچھنا شروع کردیا تو پروفیسر نے ماریا کے حوالے سے غلط باتیں بتانی شروع کردیں اور کہا کہ ماریا کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا نقطہ جو کہ شہادت کی انگلی کے نیچے واقع ہے جو یہ نشاندہی کررہا ہے کہ جو شخص بھی اس سے شادی کرے گا۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن فوت ہوجائے گا۔'' یہ بات سنی تھی کہ جمال خان چکرا کر رہ گیا۔ اس نے کہا۔
''آخر اس کا کوئی حل تو ضرور ہوگا۔''
پروفیسر نے کہا کہ ماریا کا یہ نشان جو کہ اس کے اندر زہر کی موجودگی کا پتا دیتا ہے۔ اس کی میعاد تین سال ہے۔ یہ تین سال میں تین شادیاں کرے گی مگر تینوں سال اس کے شوہر فوت ہوجائیں گے کیونکہ چوتھے سال جو شخص بھی اس کے ساتھ شادی کرے گا

وہ زندگی بھر اس کا شریکِ حیات بن جائے گا۔ اور اس کی تمام دولت کا بھی وارث بن جائے گا۔ کیونکہ اس کی اولاد نہیں ہوگی اور وہ خود ایک حادثے میں فوت ہو جائے گی۔''

یہ باتیں سنی تھیں کہ جمال خان شادی کا ارادہ تبدیل کرنے لگا مگر اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا، کیونکہ وہ ایک شاطر آدمی تھا۔ جب تک ان باتوں کی تہہ میں نہ پہنچتا اس وقت تک آرام سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔

پروفیسر نے جمال خان سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ دراصل وہ جمال خان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا چاہتا تھا۔ جمال خان نے کہا یہ میرا پستول ہے۔'' جس کو اس نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر سے کہا کہ اب میں ایک سیاستدان بن چکا ہوں تم میرے سیکریٹری ہو اس لیے تمہیں اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھنا ہوگا کیونکہ بعض اوقات، بعض جگہوں پر صرف میں اور تم جاسکتے ہیں اس لیے تمہیں میری حفاظت کے لیے رکھنا ہوگا۔''

تو پروفیسر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور گھر جانے کی اجازت لے لی۔ پروفیسر موقع جانتے ہی وہاں سے نکل پڑا مگر ابھی تک جمال خان کے دل و دماغ پر صرف اور صرف ایک سوچ نے قبضہ جمایا ہوا تھا کہ وہ ان باتوں کو تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔

پروفیسر جیسے جمال خان کی کوٹھی سے نکلا تو جمال خان حقیقت کو جاننے کے لیے اپنے تمام کمروں میں موجود خفیہ کیمروں کو چیک کرنے چل دیا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور کمپیوٹر پر کیمروں کی ریکارڈنگ ویڈیو چیک کرنے لگا۔ تو اس نے سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں لگے ویڈیو کیمرے کی فلم دیکھنے لگا تو حیرت کے مارے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی کیونکہ وہ دونوں کے درمیان میں ہونے والی حقیقت سے آشنا ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے پروفیسر اور ماریا نے اتنا بڑا دھوکہ دیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس حد تک جاسکتے ہیں۔ جمال خان پر خود غرضی حاوی ہونے لگی اور انتظام کی آگ مزید اس کے دل میں بھڑکنے شروع ہوگئی۔ جمال خان نے اپنے خاص بندوں کو فون کرنا شروع کر دیا اور انہیں سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆......☆☆

ابھی پروفیسر گھر میں نہیں پہنچا تھا، کچھ فاصلے پر تھا کہ جمال خان کے غنڈوں نے پروفیسر کے گھر کا گھیراؤ کر لیا اور وہ چھپ کر بیٹھ گئے۔

پروفیسر نے جیسے ہی گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی بیگم نے اس کے آگے دروازہ کھولا۔ ابھی تک پروفیسر کا بیٹا گھر نہیں آیا تھا، جیسے ہی دروازہ کھلا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تو جمال خان کے غنڈوں دروازے کو دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اس کی بیوی پر گولیاں برسا دیں تو پروفیسر نے پستول نکالتے ہوئے اُن پر فائر کھولنا چاہا مگر وہ بھاگ گئے۔ پروفیسر ہاتھ میں پستول لیے جیسے ہی باہر نکلا تو دوسری طرف اس کا بیٹا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے باپ کے ہاتھ میں پستول دیکھا اور بھاگا جا رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔

پروفیسر کا بیٹا جیسے ہی اندر داخل ہوا تو ماں کو خون میں لت پت دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا۔ ان کے گھر میں اس کے والد اور والدہ کا جھگڑا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ مگر اتنا شدید نہیں مگر آج والدہ کا خون دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس کے دل میں غلط فہمی پیدا ہوئی کہ والد نے میری والدہ کو قتل کیا ہے۔ وہ ماں سے لپٹ کر رو رہا تھا مگر ابھی تک پروفیسر واپس نہیں آیا تو اس کے بیٹے کا شک یقین میں بدلنے لگا۔

اُدھر جمال خان کے آدمی جو کہ کسی دوسری جگہ چھپے بیٹھے تھے۔ پیچھے سے پروفیسر پر وار کیا تھا اور میں اتنی شدت تھی کہ پروفیسر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جمال خان کے آدمیوں نے اسے اغواء کر کے گاڑی میں ڈال کر جمال خان کی کوٹھی میں لے گئے۔ کافی دیر سونے کے بعد پروفیسر کے بیٹے کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بھڑکنے لگی اور وہ انتقام کی

آگ میں جلنے لگا۔
جوان خون تھا۔ دل میں بدلے کی آگ نے اس کا وجود جلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے باپ سے بدلہ لینے کا تہیہ کرلیا۔
جمال خان نے پروفیسر کو اپنی قید میں ڈال دیا، صبح ہوئی پروفیسر کا بیٹا جمال خان کی کوٹھی پر پہنچا۔ کل رات کا واقعہ بیان کیا تو جمال خان نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔
''تمہارا باپ ایک آوارہ اور بدچلن لڑکی کے چکر میں آگیا۔ اس نے شادی کرنے کو کہا مگر وہ تمہاری ماں سے اجازت مانگنے آیا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنا پستول دے دو، ہوسکتا ہے وہ تمہاری ماں سے اجازت طلب کرنے گیا ہو۔ اس نے اجازت نہ دی ہو اور اس نے طیش میں آکر تمہاری ماں پر گولیاں چلادی ہوں۔''
یہ سن کر پروفیسر کا بیٹا غصے میں لال پیلا ہوگیا تو جمال خان نے لوہے کو گرم دیکھتے ہوئے مزید اس پر زبان کے ہتھوڑے سے ضرب لگادی اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پولیس سے کہہ کر بھی اسے پکڑواؤں گا ضرور۔ اور یہ لو میری طرف سے موبائل اور اسلحہ تاکہ اس ظالم شخص کو سبق سکھایا جاسکے۔
پروفیسر کا بیٹا بے حد جذباتی تھا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ جمال خان اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھا کہ اب سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی نہ ٹوٹے گی۔
پروفیسر کے بیٹے نے ماریا کے متعلق بھی پوچھا تو جمال خان نے کہا کہ میں اسے خود تلاش کرکے، تمہیں موبائل پر آگاہ کردوں گا۔ میں اپنے آدمی ماریا اور تمہارے باپ کی تلاش میں متحرک رکھوں گا۔ جیسے کوئی گرین سگنل ملے گا تمہیں لال جھنڈی دکھادوں گا۔''
جمال خان کو ایک مہرہ اور مل گیا تھا اور وہ اس مہرے سے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا اب وہ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔
''اب تم گھر جاؤ جیسے ہی مجھے کہیں سے ان دونوں کی اطلاع ملے گی تمہیں ضرور کال کروں گا اور تم بھی اپنے والد کی تلاش جاری رکھو۔''
پروفیسر کے بیٹے نے جمال خان سے اجازت لے کر شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔
☆......☆......☆
جمال خان اقتدار کے نشے میں ہر غلط کام کو درست سمجھتا جارہا تھا بلکہ حکومت میں رہ کر کرپشن کے نئے نئے ریکارڈ قائم کررہا تھا۔ اِدھر ماریا بھی خود کو بچانے کے لیے مختلف لوگوں سے جمال خان کے بارے میں معلومات لیے پھررہی تھی۔ اس کو پتا تھا کہ جمال خان ایک زہریلا ناگ ہے موقع ملتے ہی وہ مجھے بھی ڈس لے گا۔ وہ سب سے پہلے اپنے راستے کا یہ کانٹا ہٹانا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ جمال خان کے ہوتے ہوئے اس کے تمام خواب ادھورے رہ جائیں گے اور وہ ایک آستین کا سانپ ہے، جتنا دودھ پلاؤ گے موقع ملتے ہی وہ اپنا کام دکھا جائے گا۔
ماریا تک بھی پروفیسر کی بیوی قتل ہونے کی خبر پہنچ چکی تھی اور وہ خوب جانتی تھی کہ اس قتل میں جمال خان کا ہاتھ ہے۔ مگر ابھی تک اس کو پروفیسر نہیں ملا تھا۔ وہ جلد از جلد پروفیسر سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر ابھی تک پروفیسر کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں اس نے اپنے آدمی بھی لگا رکھے تھے۔
جمال خان بھی ماریا کے ارادوں کو جانچ چکا تھا اور وہ جلد از جلد اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ جمال خان کو ماریا کی ساری رپورٹیں مل رہی تھیں۔ اور وہ اب دونوں کا خون دیکھنا چاہتا تھا۔
اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے پروفیسر کو ماریا کے گھر کے آگے پھینک دیا۔ ماریا ابھی جمال خان کے خلاف تمام ثبوت نیب والوں کو دے آئی تھی اور سپریم کورٹ میں اس کے خلاف درخواست بھی دے دی تھی۔ اس کے خلاف متعلقہ تھانے میں رپورٹ بھی لکھوادی تھی۔ وہ جیسے واپس آئی اپنی کوٹھی کے سامنے پروفیسر کو بے ہوش پایا تو اس کو اٹھوا کر اپنے لوگوں سے اندر لے گئی۔ جب پروفیسر کو ہوش آیا تو اس نے ماریا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کردیا کہ

میری بیوی کو جمال خان نے قتل کروادیا اور میرے اور میرے بیٹے کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے میرے بیٹے کو میرے خلاف کردیا اور اس نے مجھے اغواء کر کے اپنی کوٹھی میں قید کرلیا تھا۔

ہم دونوں کی تلاش میں جمال خان کے آدمی اور میرا بیٹا ہمیں مارنے ضرور آئے گا۔''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار وہ اپنے ہاتھ کا مطالعہ کرے تاکہ آنے والے حالات سے آگاہی حاصل ہوسکے مگر دل اور اس کا ذہن مطالعہ کے حق میں نہیں تھا مگر ماریا کے ہاتھ پر حادثاتی لکیر ضرور دیکھ لی تھی۔

جمال خان کے مخبروں نے تمام معلومات آ کر بتادی کہ کسی وقت نیب کرپشن کے حوالے سے آپ تک پہنچ سکتی ہے۔''

جمال خان جلد از جلد دونوں کو ٹھکانے لگا کر بیرون ملک بھاگنا چاہتا تھا کہ بیرون ملک جا کر سیاسی پناہ حاصل کرسکے۔ اس نے پروفیسر کے بیٹے کو فون پر بتادیا کہ تمہارا والد اس وقت ماریا کے پاس موجود ہے۔''

بیٹے نے سننا تھا کہ اس کی آنکھوں اتر آیا اور وہ ماریا کی کوٹھی کی جانب رواں ہوا ادھر ماریا اور پروفیسر گپوں میں مصروف تھے کہ ماریا کے ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ہمارے مخبر نے ایک اطلاع دی ہے کہ جمال خان کسی بھی وقت یہ ملک چھوڑ کر بیرون ملک جاسکتا ہے۔ یہ سن کر ماریا نے پروفیسر سے کہا۔

''تم یہیں لان میں بیٹھو میں ابھی فون کر کے آتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی تو پروفیسر نے سوچا کہ ایک بار اپنے ہاتھوں پر نظر دوڑالوں مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ پروفیسر کا بیٹا اپنے باپ کے سر پر پہنچ گیا اور بغیر للکارے باپ پر فائر کھول دیے۔ ادھر جمال خان نے پولیس کو بھی آگاہ کردیا اور خود ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہونے لگا۔ پروفیسر کے بیٹے نے فائر مارتے ہی اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر اس وقت ماریا اور اس کے ساتھ اس کے سکیورٹی گارڈ نے فائر کھول دیا۔

پروفیسر کے بیٹے کی قسمت اچھی تھی کہ جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور ماریا کو جان سے مارنے کا بھی کہہ دیا مگر وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلا تو پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑلیا۔

ماریا نے پروفیسر کی جان بچانے کے لیے اسے گاڑی میں ڈالا اور اسے اسپتال کی طرف دوڑا دیا مگر ابھی تیزی سے نکلی تھی کہ سامنے آتے ہوئے ایک ٹرالر سے اس کی گاڑی جا ٹکرائی۔ حادثہ بہت شدید تھا کہ ماریا کی پوری گاڑی کی چھت اُڑ گئی اور پروفیسر ماریا اور اس کے گارڈ چاروں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

گاڑی بالکل تباہ ہوگئی۔ پولیس نے موقع پر ان کی لاشیں اُٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کردی تھیں۔ باقی کاغذی کارروائی کر کے رپورٹ تیار کرلی۔

جمال خان جیسے ہی ایئرپورٹ پہنچا تو اس کو اینٹی کرپشن والوں نے گرفتار کرلیا اور پولیس کو ماریا پہلے ہی پروفیسر کی بیوی کے قتل کے متعلق ساری معلومات اور ثبوت فراہم کرچکی تھی۔ کیونکہ ماریا کے کچھ مخبر جمال خان کے سکیورٹی گارڈ میں شامل تھے۔ سو اس نے آسانی سے تمام ثبوت اکٹھے کر کے دے دیے۔ قتل کرنے والوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

پروفیسر کا بیٹا باپ کو قتل کرنے پر بے حد شرمندہ ہوا تو اس کے وکیل نے غلط فہمی کی بنا پر قتل کرنے کے ارادے کو عدالت میں پیش کیا تو عدالت نے اس کی سزائے موت کی بجائے اس کی سزا عمر قید میں بدل دی۔

اس طرح سے دوسروں کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر تقدیر سے آگاہ کرنے والا خود تقدیر کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ گیا۔ اور وہ گردشِ ایام میں اس طرح پھنسا کہ آخر کار موت کی وادی میں چلا گیا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ دیکھ کر کچھ جان سکتا۔ مگر قدرت کے فیصلوں سے وہ بالکل آگاہ نہ تھا اور خود ہی تقدیر کی گردشِ ایام کی بھینٹ چڑھ گیا۔ کیوں قدرت ہی انسان کی موت، رزق کی عملدار ہے۔

☆☆......☆☆

تحسین کو خراجِ تحسین

میجر عبدالقدوس

گڈی آپا کے نام سے سچی کہانیاں کے قارئین کے دلوں میں
آباد مصنفہ کے لیے، اُن کے ہم سفر کی جانب سے نذرانۂ عقیدت

جن لوگوں نے گڈی آپا کو دیکھا، سنا یا پڑھا اُن کے لیے یہ سمجھنا قدرے آسان ہے کہ انہیں لفظوں میں سمیٹا نہیں جاسکتا۔ سیرت اور صورت کا حسن اگر یکجا ہو جائے تو گڈی آپا کی شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے جس ماں کی گود میں آنکھ کھولی وہ گھنٹوں سوچ کر بھی ان کی کوئی برائی ڈھونڈنے سے قاصر رہی۔ باپ کے لیے ادب اور محبت مثالی تھی۔ پیدا ہوئیں تو ان کے سسر نے اپنی بیٹی بنانے کا خواب دیکھا۔ وطن کی محبت سے سرشار تندہی سے گرل گائیڈ کی ٹریننگ کی۔ شادی بھی وطن کے سرفروش سپاہی سے کی۔ میجر عبدالقدوس اس وقت لیفٹیننٹ تھے۔ اپنی شریک حیات سے مخاطب ہوئے۔

''میری زندگی کی قیمت یہ آدھے انچ کی گولی ہے جس دن یہ جیت گئی میں زندگی ہار جاؤں گا اور اس دن تمہیں لوگوں کی طرف نہیں دیکھنا۔''



مرحومہ گڈی آپا (تحسین اختر) کی ایک یادگار تصویر

وطن کے ادنیٰ سپاہی کیپٹن عبدالقدوس نے گڈی آپا سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بچوں کے نام ان کے نام سے منسوب کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ فوجی کی شریک حیات تھیں۔ ہر محاذ پر دلیری اور دلجمعی سے ڈٹی رہیں۔ گلگت اور لنڈی کوتل جیسے پُرخطر اور سرحدی علاقوں میں شوہر کی عدم موجودگی میں بچوں کی حفاظت کرتی رہیں۔ چھ بچوں کی ماں نے شادی کے بعد تعلیم سے تسلسل دوبارہ جوڑا اور اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ قدرتی نظاروں کے حسن کو مزید نکھارنے کے لیے فلوریکلچر اور لینڈ اسکیپنگ کے کورسز کیے۔ گاہے بگاہے درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو کر اپنے علم کی روشنی کو اگلی نسلوں میں منتقل کرتی رہیں۔

سیکڑوں تحریروں کی ہردلعزیز مصنفہ اور شاعرہ اردو

اور پنجابی پر یکساں عبور رکھتی تھیں۔ صوفیانہ کلام لکھتیں تو عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ میں ایسی رنگ جاتیں کہ دنیا کی ہوش نہ رہتی۔ نماز پڑھتیں تو ان کو دیکھنے سے روح کانپ اٹھتی۔ جس قدر توجہ اور عاجزی سے وہ اللہ کو پکارتیں وہ ان ہی کا خاصا تھا۔ جواں عمری میں حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ خلق خدا اور خاص طور پر بچوں سے اتنا پیار کرتیں کہ چھوٹے بڑے کا فرق نہ رہتا۔ سب بچے انہیں امی کہتے۔ بچوں کی تربیت عبادت کی طرح آخری دن تک کرتی رہیں۔ کہا کرتی تھیں۔ ''ماں کا تو نام ہی دعا ہونا چاہیے۔''

ان کے ہاتھ کے لگے بے شمار پودے آج تناور درخت بن کر خلق خدا کو پھل، پھول اور سایہ فراہم

میں قدرت کے حسین نظارے دیکھنے کی سعادت نصیب فرمائی۔ جن میں سعودی عرب، یو ایس اے اور آئرلینڈ شامل ہیں۔ حال ہی میں فیس بک پر اپنا Page بنایا جہاں ان کے ہزاروں Fans ان کی تحریروں کو پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ ان کے Facebook Page کا لنک یہ ہے۔

'' Meyri Kahaniya Must Read

Suchee Kahaniya ''

ہم سب کی گڈی آپا (تحسین اختر) مورخہ 28 جولائی 2015 دن کے 1:30 بجے یہ کہتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں!

''یا اللہ میرے بچے۔''

'انا للہ وانا الیہ راجعون'



مرحومہ گڈی آپا (تحسین اختر) کی اپنے شریک سفر میجر عبدالقدوس کے ساتھ خوشگوار یادیں

کر رہے ہیں۔ روف ٹاپ گارڈن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے پودوں اور پھولوں سے مزین کیا۔ منی زو میں اٹالین اور آسٹریلین طوطے، تیتر، بٹیر، مور، مرغیاں، چکور، کبوتر، قمریاں، خرگوش سب ان کے بچوں کی طرح انہیں پہچانتے تھے۔ دانہ ڈالتی تھیں تو پرندے اڑے چلے آتے تھے۔ ان کو ٹچ کرتے اور ان کی ایک ٹانگ والی بلبل ان سے ذرا خوفزدہ نہ تھی۔

''ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو''

(علامہ اقبال)

فطرت کے حسن کی متلاشی گڈی آپا کو اس کے خالق حقیقی نے نہ صرف وطن عزیز بلکہ دنیا کے مختلف ممالک

ان کے درجات کی بلندی کے لیے سربسجود

وہ میں جسے میں اپنی میں سمجھتا تھا

وہ میں مجھ سے آج بچھڑ گئی

میں اکیلا رہ گیا

فضاؤں میں وہ بکھر گئی

میجر عبدالقدوس (ہمسفر)

ان کی محبت کی وسعت میں مجھے اپنے وجود کے کھو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

عثمان قدوس (بیٹا)

سلام اس ذات کو جس ذات سے میری ذات وابستہ ہے۔

میں خود سے کیسے کہوں تو میری پہنچ میں نہیں۔

میں جو ہوں جہاں ہوں تیری وجہ سے ہوں۔
جو تُو نہیں تو میری ذات، میری ذات نہیں۔
عمر قدوس (بیٹا)

انہوں نے میرے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری لے کر مجھے اس فکر سے بھی آزاد کر دیا۔
نادیہ تحسین پلواشا (بیٹی)

میری ماں میرے دل کے سب فسانے جانتی ہے
میرے ہر خوف کے، دکھ کے زمانے جانتی ہے
میری حیات کے سب شاخسانے جانتی ہے
ساری دنیا سے انوکھی ہے مصور کیوں کہ
وہ پرائے کے کبوتر بنانے جانتی ہے
جہاں پہ مسکراہٹیں بھی ہوئی ہوں ناپید
وہیں پہ قہقہوں کے کارخانے جانتی ہے
عاصمہ تحسین (بٹی)

بٹی کو اللہ کی راہ میں دینے والی میری ماں تجھے آخری آرام گاہ میں شہیدوں کی ہمسائیگی اور وطن کے


مرحومہ گڈی آپا (تحسین اختر) کی اپنے شریک سفر میجر عبدالقدوس کے ساتھ بیرون ملک کی یادگار تصاویر

چار سو، چھا رہی آزردگی کے موسم میں
خوشی کو ڈھونڈنے کے سب بہانے جانتی ہے
ریت سے، دشت سے گلزار بنالیتی ہے
مسرت کے، خوشی کے سب بہانے جانتی ہے
کڑکتی دھوپ میں سایہ تلاش لیتی ہے
صبا سے، موسموں سے رنگ چرانے جانتی ہے
وہ میری آنکھ سے پڑھتی ہے حالِ دل اکثر
میری سوچوں کے سارے آشیانے جانتی ہے
کہ میری خاموشی سنتی ہے وہ توجہ سے
مرے بچپن کے بھی سارے ترانے جانتی ہے
میرے سپنوں کا رفو گر رہی لحہ لحہ
میری گڑیا کے بھی گیسو بنانے جانتی ہے
مجھے تلاشتی ہے اپنے دل کی لہروں سے
میرے چھپنے کے سارے ہی ٹھکانے جانتی ہے
میں چاہ کر بھی چھپا کچھ نہیں سکتی اس سے

جھنڈے مبارک ہوں۔
ڈاکٹر صائمہ تحسین (بٹی)

پیاری امی جان کے نام......!
میری زندگی کے حاصل تجھے کیسے میں بتاؤں؟
تُو مرا ہے عشقِ اول تجھے کیسے میں بھلاؤں؟
میری زندگی میں غلطاں رہے بیقرار لمحے!
تُو ہی ان سے آشنا تھی تجھے کیسے میں سناؤں؟
میرا روم روم پرنم مقروض ہے تمہارا!
مری زندگی کی جنت! تجھے کیسے ڈھونڈ لاؤں؟
میری ہر خوشی، غمی کی رہی تجھ سے ہی رفاقت!
کہو کیسے مسکرادوں؟ کہو کیسے خود رلاؤں؟
میری زندگی کے مالک! تُو ہی ابتدا و آخر!
تیرے ہر حکم کے آگے خودی سر کو میں جھکاؤں!
سعدیہ تحسین (بٹی)

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 13

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پرمبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی



کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا ایں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

بڑی صاف ستھری اور عمدہ گفتگو کی تھی اور شاہ زیب کو یہ بات پسند آئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے اکیلے واپسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کے انداز میں بڑی اپنائیت جھلکتی ہے اور نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کا ساتھ دوں۔ مجھے بھی دوسرے لوگوں کی مانند میری ذمہ داریاں سمجھا دی جائیں۔ میں یہاں عام لوگوں کی طرح تمام کام کروں گا اور جہاں تک اس لڑکی کا تعلق ہے تو میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تو خود بھی اس سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا ایسی خوفناک لڑکی کے ساتھ بھلا انسان کس طرح رہ سکتا ہے۔؟''

''تو پھر ہم آپ کو اپنے اس گروہ میں خوش آمدید کہتے ہیں مسٹر شاہ زیب! جہاں تک آپ کے مشغلے کا تعلق ہے تو ابھی چند روز آپ مہمان کی حیثیت سے گزاریں۔ اس کے بعد کوئی ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی جائے گی۔ ویسے یہاں کوئی شخص کسی ذمہ داری کے اپنے سپرد ہونے کا انتظار نہیں کرتا کیونکہ ہم کسی کو کسی کی مرضی کے خلاف احکامات نہیں دیتے، ہاں مشورے کے طور پر ہر طرح کی گفتگو کی جا سکتی ہے، یعنی کوئی ایسا کام جو آپ کی پسند کے مطابق نہ ہو لیکن ہم یہ محسوس کریں کہ آپ سے وہ کام لینا ضروری ہے تو آپ کو اس سلسلے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد وہ ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی جائے گی۔''

''بہت بہت شکریہ، آپ لوگوں نے جس طرح یہ گفتگو کی ہے۔ اس نے میرے اندر نہ صرف اعتماد بلکہ دوستی کا تصور بھی پیدا کر دیا ہے اور مسٹر اسٹون برادرز میں اس دوستی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور جو کام دل سے کیے جاتے ہیں ان میں پھر اپنے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔''

''یہاں کا ماحول انتہائی دوستانہ ہے اور ہر شخص آپ کا دوست ہے، ہر طرح کی آزادی آپ کو حاصل ہے خواہ آپ کے دوست مرد ہوں یا خواتین، آپ پر کسی قسم کا اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، یہاں ایک اطلاع آپ کو ضرور دی جائے گی وہ یہ کہ آپ کے بیان کے مطابق ہم نے ان کھنڈرات یا پہاڑی چٹانوں میں وہ نقشہ تلاش کرانے کی کوشش کی تھی جو لڑکی نے پتھر کے ٹکڑے سے ترتیب دیا تھا۔ وہاں ایسے نقوش بنائے گئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نقشہ بنایا گیا تھا لیکن جس طرح لڑکی نے اُسے مٹا دیا اس سے ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا، چند افراد کو وہاں بھیجا گیا تھا۔ وہ اس جگہ کی تصویریں بنا کر لائے ہیں لیکن بے سود ان سے ہمیں کوئی کارآمد بات نہیں معلوم ہو سکی۔''

شاہ زیب نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی اور ان کا شکریہ ادا کر کے واپس اپنی میز پر جا بیٹھا۔ موسیقی کی دھنیں تبدیل ہوتی رہیں اور لوگ اس ماحول کو بالکل اس انداز میں اُنجوائے کر رہے تھے جیسے کسی اعلیٰ درجے کے اوپن ایئر ہوٹل میں تفریحات میں مشغول ہوں۔

شاہ زیب اب پہلے سے زیادہ اطمینان محسوس کر رہا تھا کیونکہ ذہن سے بہت سے خیالات مٹ چکے تھے اور اس

نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لیا تھا کہ اسٹون برادرز کے ساتھ بھی تقدیر کے لکھے ہوئے لمحات پورے کیے جائیں جو اس کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ پھر اس کی نگاہ ایک میز کی جانب اٹھ گئی اس میز پر شاہ زیب نے اس برفانی بوڑھے کو دیکھا۔

برفانی بوڑھا اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی برف کی طرح سفید تھا لیکن اس کو دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا تھا جیسے یہ سفیدی مصنوعی ہو، بوڑھے کے ساتھ وہی لڑکی موجود تھی جس کے چہرے پر زندگی ذرا کم ہی نظر آتی تھی، سوکھا سوکھا سا انداز.. حالانکہ وہ اتنی دبلی پتلی بھی نہیں تھی بس متناسب تھی، نقوش میں ایک سپاٹ کیفیت جیسے وہ ہر تاثر سے بے نیاز ہو، مجموعی طور پر اس کی صورت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اگر اپنے آپ کو سنوار لے تو بلاشبہ حسین کہلائے۔ لیکن اس کا لٹا پٹا انداز اور خاموشی کی کیفیت اس کی جاذبیت اس سے چھین لیتی تھی۔

بوڑھے کا اس لڑکی سے کیا رشتہ ہے، شاہ زیب نے سوچا۔ پھر دفعتہً ہی شاہ زیب کی میز پر شراب کے برتنوں کی ایک چھوٹی سی ٹرے آگئی اور ساتھ ہی ایک کرسی گھسیٹ کر ایک خوبصورت سی لڑکی اس کے سامنے آ بیٹھی۔ اس سارے ماحول میں اب تک اگر کوئی اجنبی بات تھی تو وہ یہی تھی کہ کوئی لڑکی شاہ زیب تک نہیں پہنچی تھی۔ بہرحال شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی اور پھر لڑکی کی دلکش آواز ابھری۔

''اس بے تکلفی کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن اگر کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ ہی لیے دیے رکھیں تو کہاں تک ان کے ساتھ رعایت برتی جا سکتی ہے۔؟''

''شاید...'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ایرا ہے۔'' اس نے کہا۔

اسی وقت عقب سے ایک آواز ابھری ''ہیلو ایرا'' ایک دراز قامت آدمی اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''ہیلو'' اس نے پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارے ساتھ رقص کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ رقص کرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے اسی شخص کے سے انداز میں جواب دیا اور وہ جھینپ سا گیا۔

''مم.. میرا مطلب ہے...''

''مطلبی لوگوں سے مجھے سخت چڑ ہے، پلیز میں باتیں کر رہی ہوں اور اپنی گفتگو میں تمہاری مداخلت کو میں نے ناپسند کیا ہے۔'' وہ شخص اپنا سا منہ لیے وہاں سے واپس چلا گیا تھا۔ لڑکی کی تیز طرار گفتگو نے شاہ زیب کے دل میں اس کے لیے دلچسپی پیدا کر دی وہ پھر شاہ زیب کی طرف دیکھنے لگی پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

''اگر کوئی اپنے نئے دوست کے لیے کسی پرانے دوست شناسا کو مسترد کر دے تو نئے دوست پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی پذیرائی کرے، میں نے تمہارے لیے اسے مسترد کر کے اپنی طرف سے پہل کا ثبوت دیا ہے، کیا تم اب بھی خاموشی اختیار کرو گے؟''

وہ اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی کہ شاہ زیب کو اس کا گمان نہیں تھا، تاہم اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے میں تمہاری پذیرائی کرتا ہوں ایرا۔''

''اور میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں۔؟''

''شاہ زیب...'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''دیکھو میری یہاں آمد بلا مقصد نہیں ہے۔ میں کل بھی تمہیں دیکھتی رہی تھی، لیکن کل تمہارا پہلا دن تھا اور تمہیں غالباً کہیں اور جگہ سے پکڑ کر لایا گیا تھا چنانچہ میں ہمت نہ کر سکی، لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد یہ تصور ضرور میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اگر موقع ملا تو تم سے شناسائی ضرور کروں گی۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں میں یہی چاہتی تھی کہ تم وجہ پوچھو۔''
''تو میں یہ پوچھ رہا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔
''ایک بات جہاں تک میرے علم میں ہے شاہ زیب جیسے نام ایشیائی لوگوں کے ہوتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟''
''ہاں سو فیصد۔''
''تو پھر میرے بارے میں سنو... میں بھی نصف ایشیائی ہوں۔''
''کس طرح؟''
''میری ماں یورپین تھی اور میرا باپ ایشیا کا باشندہ تھا، اس کا نام احمد تھا، میرا پورا نام ایرا احمد ہے، اس لحاظ سے میرے بدن میں ایشیائی خون دوڑ رہا ہے اور مجھے ایشیائیوں سے خاص محبت اور رغبت ہے اب جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم اب ہمارے ساتھی ہو تو میں نے تم سے دوستی کا فیصلہ کر لیا گو یہ دوستی ابھی زبردستی ہے، یعنی میں تمہارے پاس آئی ہوں لیکن ظاہر ہے مجھے ہی تمہارے پاس آنا چاہیے تھا۔''
''تھینک یو ایرا میں بھی تم سے متاثر ہوں اس لیے کہ تم آدھی ایشیائی ہو۔''
''یقیناً... ہماری دوستی کافی پائیدار ہونی چاہیے۔''
''یہ آنے والے وقت پر منحصر ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔
''میرے ساتھ رقص کرو گے؟''
''کیونکہ تم ایشیائی ہو میرا مطلب ہے نصف ایشیائی چنانچہ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ٹھیک ہے۔''
''اوہ... بے حد شکریہ، مجھے ضدی لوگ پسند نہیں آتے کیونکہ میں خود ضدی نہیں ہوں، اگر تم کبھی مجھ سے کوئی بات منوانا چاہو گے تو میں ذرا بھی ضد نہیں کروں گی۔'' اس نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا اور شاہ زیب نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ''محترمہ ایرا! آپ جو کچھ فرما رہی ہیں اس کا مفہوم میں سمجھ رہا ہوں۔'' پھر وہ دونوں رقص کرنے والوں کی بھیڑ میں آشامل ہوئے اور اس کے بعد دیر تک رقص کرتے رہے۔ کسی نے ان کی جانب توجہ نہیں دی تھی، لیکن تیسرے راؤنڈ میں جب شاہ زیب اور ایرا رقص کے لیے اٹھنے والے تھے کہ ایک کیم شحیم آدمی ایرا کے قریب پہنچ گیا۔
''ہیلو ایرا! آؤ رقص کریں۔''
ایرا نے منہ ٹیڑھا کر کے اس شخص کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔
''نو سوری ڈیئر ہالک... میں اپنے پارٹنر کے ساتھ ہوں۔''
''کیا لائف پارٹنر کے ساتھ؟''
''اگر چہ تم نے یہ جملہ بدتمیزی کے انداز میں کہا ہے تب بھی میں نے اس کا برا نہیں مانا کیا سمجھے؟'' ایرا نے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور ہالک ہنسنے لگا۔
شاہ زیب اس کا جائزہ لے رہا تھا، بے حد قوی ہیکل اور پہلوان ٹائپ کا آدمی تھا۔ شانے چوڑے کمر پتلی ویٹ لفٹر سا لگتا تھا شاہ زیب نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ حضرات کہیں اس کے رقیب نہ بن جائیں۔ ہڈی پسلی توڑنے میں مہارت رکھتے ہوں گے، یہ بلاوجہ کا عشق کہیں مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ وہ کیم شحیم آدمی ہونٹ چباتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ایرا نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔
''خود کو کچھ سمجھنے والے مجھے ہمیشہ سے ناپسند ہیں۔''
رقص کے بعد ایرا نے کھانا بھی شاہ زیب کے ساتھ ہی کھایا اور پھر جب تمام لوگ وہاں سے اٹھے تو وہ شاہ زیب کے ساتھ ہی اس کے خیمے میں آ گئی، شاہ زیب کے انداز میں اب کچھ بوکھلاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی، ایرا ایک سمت بیٹھ گئی اور پھر اس نے شاہ زیب کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''نیند آرہی ہے تو میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی، لیکن ہماری دوستی کا آغاز ہوگیا ہے اور ہمارے درمیان ایشیا کا رشتہ ہے کیا سمجھے؟''

''یقیناً۔'' شاہ زیب نے احمقانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو میں جاؤں۔'' ایرا نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔ تم نے مجھے بہترین کمپنی دی ہے۔'' شاہ زیب نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے کہا اور ایرا ایک پراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ باہر نکل گی۔

اس کے جانے کے بعد شاہ زیب نے گہری سانسیں لی تھیں کیونکہ اسے وہ قوی ہیکل ہالک یاد آرہا تھا، اگر اسٹون برادراز کے گروہ میں ایک بھی دشمن پیدا ہوگیا تو بہر طور شاہ زیب کے لیے یہ سود مند نہیں تھا، لیکن میڈم ایرا ضرورت سے زیادہ آگے کی چیز معلوم ہوتی تھیں۔

☆......☆......☆

دوسری صبح حسب معمول شاہ زیب کو ناشتا خیمے ہی میں پہنچا دیا گیا اور وہ ناشتا کر کے فارغ ہوا تھا کہ میڈم ایرا اندر آ گئی، اسے دیکھ کر شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی۔ ایرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاہ زیب آؤ باہر چلیں، تم تو خیمے میں ہی قید رہتے ہو۔''

''یہاں کی زندگی سے مجھے کوئی واقفیت نہیں ہے، اس لیے میں اپنے آپ کو محدود رکھتا ہوں''

''اوہ نو... اسٹون برادرز اپنے ساتھیوں پر کوئی بھی پابندی نہیں لگاتے، اگر تمہیں بہت اچھے باس کی تلاش ہو تو ان سے اچھے لوگ تمہیں روئے زمین پر نہیں ملیں گے۔''

شاہ زیب نے گردن ہلائی، پھر وہ ایرا کے ساتھ کیمپ کے حصار سے باہر آ گیا۔

اطراف میں لاتعداد مناظر بکھرے پڑے تھے، ایرا اور شاہ زیب ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے آبشار کے کنارے آ بیٹھے اور ایرا شاہ زیب کو برق پاش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

''ڈیئر شاہ زیب! دوران سیاحت تمہاری ملاقات تو بہت سے ایسے لوگوں سے ہوئی ہوگی جنہوں نے تمہیں متاثر کیا ہوگا۔ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''بہت اچھی... بہت عمدہ...'' شاہ زیب نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

''کیا تم مستقل ہمارے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو گئے ہو؟''

''فی الحال تو ارادہ ایسا ہی ہے۔''

''اوہ ڈیئر، اگر اسٹون برادرز سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے تو تمہیں تفصیلات بھی معلوم ہوگئی ہوں گی، میں اس دنیا میں تنہا ہوں، اسٹون برادرز کی دو فلموں میں کام کر چکی ہوں، کیا تم نے میری فلمیں دیکھی ہیں؟''

''نہیں۔''

''اوہ کاش تم نے انہیں دیکھا ہوتا میرے مداحوں کا خیال ہے کہ میں جذباتی اداکاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔''

''کون سی فلم تھی تمہاری؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''سن شیڈو۔'' اس نے جواب دیا۔

''افسوس، میں نے نہیں دیکھی۔''

اسی وقت شاہ زیب کی نگاہ ہالک پر پڑی جو ایک درخت کے نیچے کھڑا ان دونوں کو گھور رہا تھا، اس کے گھورنے کا انداز بے حد خطرناک تھا۔ اسی وقت اس نے درخت کی دو موٹی شاخوں پر ہاتھ رکھا اور پھر بازوؤں کی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاخ کو درمیان سے توڑ دیا، ایک طرح سے یہ شاہ زیب کے لیے چیلنج تھا۔ اس نے دہشت سے آنکھیں بند کر لیں۔

ایرا نے بھی اس کی آہٹیں محسوس کر لی تھیں پھر اس کا سریلا قہقہہ گونج اٹھا اور اس نے کافی زور سے کہا۔

''ہالک ایک ٹکڑ ہارا ہے۔'' ہالک نے ایرا کا تبصرہ سنا اور غصے سے پاؤں پٹختا ہوا آگے بڑھ گیا تھا، لیکن اس کے بعد شاہ زیب ایرا سے ایک بھی رومانی جملہ نہ کہہ سکا جبکہ ایرا نے بہت ساری باتیں کر ڈالی تھیں۔

پھر کیمپ میں کچھ سرگرمیاں دیکھی گئیں اور ایرا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او ہو شاید اسٹون برادرز کی طرف سے آگے بڑھنے کا اعلان کیا گیا ہے آؤ چلیں۔''

ایرا کا اندازہ درست نکلا، لوگ خیمے اکھاڑنے میں مصروف تھے، شاہ زیب نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دیا، ایرا مسلسل اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ہالک کے علاوہ ابھی تک کسی اور نے ان دونوں کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ نہایت برق رفتاری سے کام کیا گیا تھا اور اس کے بعد تمام لوگ ٹرکوں اور جیپوں میں سوار ہو گئے، ایرا نے یہاں بھی شاہ زیب کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ جس لینڈ روور میں شاہ زیب سوار تھا وہیں ایرا بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی، لیکن دوسرے کئی افراد بھی تھے، البتہ ہالک نہیں تھا، ایرا نے شاہ زیب کے کان میں سرگوشی کی۔

''اب سے پہلے وہ میرے ساتھ سفر کرتا تھا۔''

''ہالک۔'' شاہ زیب نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.. اس نے کہا اور شاہ زیب ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر تک یہ خاموشی طاری رہی۔ باہر کے مناظر نگاہوں سے روپوش تھے، شاہ زیب نے دوسرے لوگوں پر توجہ دی، تین نوجوان اور پانچ لڑکیاں ان کے ساتھ لینڈ روور میں ان کے ساتھ بیٹھے تھے مگر سب کے سب خاموش تھے۔ صرف ایرا ہی تھی جو بار بار شاہ زیب کے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ دفعتاً شاہ زیب کو کچھ خیال آیا اور اس نے ایرا سے پوچھا۔

''ایرا ایک بات بتاؤ، ہمارے درمیان ایک شخص موجود ہے جس کے بال برف کی مانند سفید ہیں میری مراد اس سفید بوڑھے سے ہے جس کے ساتھ ایک دبلی پتلی لڑکی رہتی ہے۔''

''مسٹر گرج۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''شاید اس کا نام گرج ہی ہو، تمہارے گروہ میں وہ ایک ہی شخص ہے جس کی داڑھی بھنویں مونچھیں اور سر کے بال برف کی طرح سفید ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے وہ مسٹر گرج ہیں اور ان کے ساتھ سونارا ہے۔''

''سونارا؟''

''اسٹون برادرز اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ویسے مسٹر گرج بہت نفیس انسان ہیں نرم خو خوش مزاج اور بزرگانہ شفقت کے مالک...''

''ہاں... بس مجھے ان کی شخصیت میں ایسی ہی کچھ کیفیات نظر آئی تھیں جس کی وجہ سے میں نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔''

ایرا خاموش ہو گئی، یہ سفر شام تک جاری رہا، جس جگہ اسٹون برادرز نے قیام کیا تھا وہ اونچے نیچے بھورے ٹیلوں سے بھری ہوئی تھی، درمیان میں کہیں کہیں تھوڑی بہت جگہ موجود تھی، لیکن اس رات خیمے نہیں لگائے گئے بلکہ گاڑیوں کا ایک دائرہ بنا کر ان کے درمیان رہنے کے لیے جگہ صاف کر لی گئی۔

رات کا کھانا بھی سفری قسم کا تھا اور آج رات یہاں رقص و سرور کی محفل بھی نہ جمی۔ یہ تھا اسٹون برادرز کے سفر کرنے کا انداز۔ صحرائے اعظم میں جگہ جگہ خطرناک دلدلیں' خوفناک جنگل اور وحشی قبیلوں کی بھرمار تھی۔ اسٹون برادرز ہر سلسلے میں ہوشیار نظر آتے تھے، ویسے شاہ زیب ان کی تنظیم کا دل سے قائل ہوتا جا رہا تھا، بلاشبہ وہ جو کوئی بھی تھے۔ بہترین ذہانت کے مالک تھے اور اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس گروہ میں جتنے افراد شامل تھے وہ سبھی جانتے تھے کہ ان کا یہ سفر کس حیثیت کا حامل ہے اور سب کے سب اپنے طور پر اس سے دلچسپی رکھتے تھے، یہاں تک کہ خواتین بھی خزانے کی تلاش میں دوڑی دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ یہ ایک دلچسپ مرحلہ تھا اور شاہ زیب کو اس سے پہلے ایسے واقعات

سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ شاہ زیب کی آوارہ گردی کے دوران میں بے شمار کردار آئے تھے اور ہر کردار اپنی جگہ ایک الگ حیثیت کا حامل تھا لیکن اسٹون برادرز اسے کافی پسند آئے تھے۔

سفر کا دوسرا دن بھی پہلے دن کی مانند تھا، البتہ چونکہ راستے دشوار گزار تھے اس لیے یہ سفر تکلیف دہ رہا۔ خاص طور سے پہلے ایسے راستوں کا تعین کیا جاتا تھا جہاں سفر کیا جائے۔ دوسری رات کا قیام بھی بالکل ایسا ہی رہا۔ البتہ شاہ زیب کی دلچسپی کے لیے ایرا موجود تھی شاہ زیب نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ لڑکی بہت آگے کی چیز ہے اور اس تک رسائی مشکل نہیں ہے، لیکن کیا کرتا، ہالک درمیان میں موجود تھا، شاہ زیب نے مختلف طریقوں سے ہالک کو اپنے گرد چکراتے محسوس کیا، ایرا ابھی اس سے الجھی نہیں تھی بلکہ اس کی موجودگی میں شاہ زیب سے زیادہ رغبت کا اظہار کر کے وہ غالباً ہالک کو جلانا چاہتی تھی اور شاہ زیب ہالک کے چہرے پر طیش کے آثار دیکھ کر اپنے حواس گم کرنے لگتا تھا۔

☆......☆......☆

تیسرے دن کا سفر دھوپ اور گرمی کی وجہ سے انتہائی تکلیف دہ تھا، پتا نہیں اسٹون برادرز کون سی لائن پر آگے بڑھ رہے تھے، تمام دن گرمی میں سفر کرتے ہوئے گزر گیا۔ پھر اس رات یہ لوگ ایک نخلستان میں پہنچے، ناریل اور کھجور کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان پانی موجود تھا، اسٹون برادرز نے یہاں خیمہ زنی کا حکم دے دیا اور شاہ زیب کو ان کے اس عمل سے یہ احساس ہوا کہ وہ ایسی جگہ قیام کرتے تھے جہاں زندگی کی سہولتیں موجود ہوں یعنی پانی درخت وغیرہ وغیرہ۔

یہاں راتوں رات خیمہ زنی کر لی گئی اور بالکل اسی انداز میں خیموں کا شہر آباد ہو گیا۔ ایرا نے شاہ زیب کو بتایا کہ اسٹون برادرز اب یہاں دو تین دن تک قیام کریں گے کیونکہ اب تک جو مسلسل سفر کیا گیا ہے اس سے تھکن بھی ہوگئی ہے۔ اس قیام کے بعد پھر نئے سفر کا آغاز کر دیا جائے گا۔'' شاہ زیب نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلا دی تھی، بہرطور! اس رات کوئی تفریحی پروگرام نہیں بنایا گیا لیکن دوسرے دن پکنک کا سا سماں تھا، رائفلیں نکل آئی تھیں اور بہت سے لوگوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ ٹولیاں شکار کے لیے نکل گئی تھیں، غالباً گوشت جمع کرنے اور اضافی خوراک حاصل کرنے کا یہی طریقۂ کار تھا۔ ایرا نے شاہ زیب سے شکار کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں تو خود شکار ہوں اور عموماً شکاری مجھے شکار کرتے رہے ہیں، میں کسی معصوم جانور کا شکار کر کے کیا کروں گا؟''

ایرا ہنسنے لگی پھر بولی ''میرا خیال ہے تم مختلف ہے، تم درحقیقت شکار کے انداز کے شکاری ہو اور یقینی طور پر دھوکے سے شکار کرتے ہو۔''

''تم نے اس کا اندازہ کیسے لگایا؟''

''اپنے آپ کو دیکھ کر کیونکہ میں تمہاری شکاری ہوگئی ہوں اور تم مستقل مجھے تڑپا رہے ہو۔''

شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے ایرا کو دیکھا اور اس کا چہرہ دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی، دیر تک وہ ایرا کے ساتھ رہا پھر کسی طرح اس سے فراغت حاصل ہوگئی اور شاہ زیب اپنے طور پر آگے بڑھ گیا۔

شکاری جنگلوں میں پھیلے شکار کر رہے تھے، بعض ہرن اور نیل گائے اٹھائے واپس آگئے تھے اور دوسرا گروہ ان جانوروں کی کھال اتارنے میں مصروف ہو گیا تھا، مگر شاہ زیب آگے بڑھ گیا اور پھر ایک درخت سے ٹک کر اطراف کے مناظر دیکھنے لگا، پتا نہیں ان جنگلوں میں درندے بھی موجود تھے یا نہیں، ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ ویسے صحرائے اعظم میں دن کے وقت بھی وحشی درندے بھاگتے دوڑتے نظر آجاتے تھے۔ شاہ زیب نے سوچا کہ اس کے پاس بھی ایک رائفل ہونی چاہیے اس احساس کے تحت اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور دفعتاً ہی اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔

شاہ زیب سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہالک کھڑا تھا، چوڑے چکلے بدن کا یہ آدمی ہاتھ میں رائفل لیے شاہ زیب کا نشانہ لے رہا تھا۔ رائفل کی نال اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھی اور آنکھ سے دوربین لگی ہوئی تھی۔ اس کے دیوتا کوچ کر گئے، ایک لمحے میں اسے احساس ہوا کہ اب اس کے بدن کے مختلف حصوں کے سوراخوں سے تازہ تازہ خون ابلتا نظر آرہا تھا۔ شاہ زیب نے وہاں سے ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ہالک رائفل

کے ٹرائیگر پر ہاتھ رکھے ہوئے شاہ زیب کا نشانہ لیے رہا اور پھر چند لمحات کے بعد رائفل کی نال نیچے کر لی۔ شاہ زیب کی طرف دیکھ کر دانت نکوسے اور گردن جھکا کر ایک جانب بڑھ گیا۔ شاہ زیب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ یہ مذاق تھا یا اپنے غصے کا مظاہرہ یا پھر ایک وارننگ...

بلاشبہ ہالک اگر اس وقت چاہتا تو شاہ زیب کو نشانہ بنا سکتا تھا، اس کے پاس کہنے کے لیے بڑا عمدہ بہانہ تھا وہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے ایک شکار پر گولی چلائی تھی جو غلطی سے شاہ زیب کو جا لگی اس بات پر اس سے باز پرس بھی نہیں ہو سکتی تھی اور شاہ زیب کا کام بھی تمام ہو سکتا تھا، پتا نہیں کیوں اس نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

شاہ زیب کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہالک اس سے سخت نفرت کرنے لگا ہے اور کسی بھی وقت وہ شخص شاہ زیب کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اور وہ کسی ایسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ آہستہ آہستہ جس طرح بھی ممکن ہو سکا اس لڑکی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا آغاز دوسرے ہی دن سے کر دیا گیا۔

شام کو معمول کے مطابق محفل جمی وہی بزم، وہی موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں اور اسٹون برادرز کی تفریحات... شاہ زیب نے ایرا کو خیموں کے درمیان سے آتے ہوئے دیکھا۔ عین اسی وقت مسٹر گرج بھی باہر آ کر ایک میز پر بیٹھے تھے اور اتفاق سے شاہ زیب ان کے قریب ہی تھا شاہ زیب کی نگاہیں ان سے ملیں تو شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے انہیں ہیلو کہا، مسٹر گرج بھی مسکرانے لگے اور پرشفیق لہجے میں بولے۔

''آیئے کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھئے۔'' انہوں نے پیشکش کی اور شاہ زیب جلدی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ایرا کے قدم رک گئے تھے وہ چند لمحات کھڑی شاہ زیب کو دیکھتی رہی اور اس کے بعد پاؤں پٹختی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ مسٹر گرج کی ساتھی لڑکی کو شاہ زیب نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا، وہ کچھ عجیب سے خدوخال کی مالک تھی، مگر ان میں بے پناہ کشش تھی، لیکن نجانے کیوں اس کے چہرے پر ایک اجنبی اجنبی سا انداز پایا جاتا تھا، شاہ زیب بیٹھ گیا تو مسٹر گرج بولے۔

''کئی دن سے آپ ہمارے ساتھی ہیں، لیکن نجانے کیوں آپ نے ہم دونوں سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''اوہ، نہیں مسٹر گرج، اس میں میرے کوشش کرنے کا دخل نہیں ہے بس یوں سمجھیے کہ میں جرأت نہیں کر سکا۔''

''نہیں بھئی، انسانوں کو ایک دوسرے سے مل لینا چاہیے، اگر آپ ایک آدھ دن اور ہم سے دور رہتے تو پھر میں خود ہی آگے بڑھتا، دراصل سونارا کی نگہداشت کے سلسلے میں میرا تمام وقت صرف ہو جاتا ہے۔ میں آپ کو اس سے ملاؤں۔ یہ میری بیٹی سونارا ہے اور میرا نام گرج ہے، آپ کے بارے میں مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا نام شاہ زیب ہے اور آپ ایشیائی ہیں۔''

''مسٹر گرج، آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور حقیقت یہی ہے کہ میں آپ کی شخصیت سے متاثر ہوں۔''

''ارے بھئی واہ، یعنی مجھ سے ملاقات کیے بغیر ہی آپ میری شخصیت سے واقف ہو گئے۔''

''جی ہاں، کچھ شخصیتیں براہ راست ذہن کو متاثر کرتی ہیں اور آپ بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ میں نے مس ایرا سے آپ کے بارے میں تفصیلات معلوم کی تھیں۔''

''اوہ... اچھا تعجب ہے میں نے تو اپنی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہیں پائی۔'' شاہ زیب ہنسنے لگا تھا مسٹر گرج پھر بولے۔

''اب جبکہ آپ نے یہ قدم اٹھا لیا ہے تو ہمارے درمیان اجنبیت نہیں رہنی چاہیے' آپ کا تعلق کون سے ملک سے ہے؟''

شاہ زیب نے مسٹر گرج کو اپنے بارے میں مختصر تفصیلات بتا ڈالیں۔ بلاشبہ ان کا اندازِ گفتگو بہت اچھا تھا اور اس میں اپنائیت سی جھلکتی تھی، وہ کہنے لگے۔

''مسٹر شاہ زیب! جیسا کہ میرے علم میں ہے کہ آپ اتفاقاً بلکہ حادثاتی طور پر اس گروہ میں شامل ہوئے ہیں، میں نے

تو یہ بھی سنا تھا کہ آپ شوراک کے ساتھ رہ چکے ہیں۔''
''شوراک۔'' شاہ زیب نے سوالیہ انداز میں مسٹر گرج کو دیکھا۔
''ہاں افریقی نسل کی ایک لڑکی! جوان سب کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔''
''اوہ... اس کا نام پہلی بار میرے علم میں آیا ہے۔ پہلے مجھے اس کے نام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔''
''ہوسکتا ہے انہوں نے اس کا نام آپ کو کچھ اور بتایا ہو، لیکن درحقیقت اس کا نام شوراک ہی ہے، کیا واقعی آپ اس لڑکی کے ساتھ رہ چکے ہیں؟''
''جی... مجھے اس عذاب میں پھنسانے والی وہی شخصیت ہے لیکن مسٹر گرج، میں نے محسوس کیا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے کتراتے ہیں، ایسا کیوں؟''
''میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، یا تو آپ نے اس کے سلسلے میں صحیح طور پر تفتیش نہیں کی ہوگی اور اس کے بارے میں جاننا نہیں چاہا ہوگا، یا پھر ہوسکتا ہے کہ کوئی خاص وجہ ہو اس کی۔'' مسٹر گرج نے کہا۔
''نہیں حقیقت یہی ہے کہ اسٹون برادرز سے دو ملاقاتوں میں میں تمام تفصیلات نہیں معلوم کرسکا اور ان کے بعد اس کا موقع بھی نہیں ملا۔''
''اس کا نام شوراک ہے اور وہ شیکال قبیلے کی لڑکی ہے، شیکال قبیلہ جو کسی نامعلوم جگہ آباد ہے اور یہ پورا گروہ یعنی اسٹون برادرز اس قبیلے کی تلاش میں نکلے ہیں۔''
''میری بدقسمتی ہے مسٹر گرج کہ اس سے پہلے میں آپ سے ملاقات نہیں کرسکا، آپ کے ذریعے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔''
''یہ وہ عام معلومات ہیں جو آپ کسی بھی شخص سے حاصل کرسکتے ہیں کیا آپ کو اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ اسٹون برادرز کا یہ گروہ درحقیقت صرف فلم بندی نہیں کررہا ہے بلکہ خزانے کا متلاشی ہے۔'' مسٹر گرج نے کہا۔
''ہاں مجھے تھوڑی بہت تفصیلات معلوم ہوچکی ہیں، مس سونارا بالکل خاموش ہیں، کیا یہ کچھ بیمار ہیں۔'' شاہ زیب نے مسٹر گرج کی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اوہ ہاں۔ سونارا ذہنی طور پر معذور ہے اور خاموش رہتی ہے۔ طویل عرصے سے یہ کچھ نہیں بولی، دیکھتی ہے، عمل کرتی ہے لیکن کچھ بولتی نہیں۔''
شاہ زیب نے ہمدردانہ نگاہوں سے سونارا کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے بیٹھی دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب کو اس کا یہ انداز بھی بے حد پرکشش لگا، پھر شاہ زیب نے مسٹر گرج کے ساتھ کوئی پی اور مسٹر گرج کافی دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے، ایرا سے برداشت نہ ہوسکا تو وہ خود ہی اٹھ کر شاہ زیب کے پاس آگئی۔
''رقص شروع ہوچکا ہے۔ کیا آج تم میرا ساتھ نہیں دوگے؟''
اس نے کچھ اس انداز میں شاہ زیب کا بازو پکڑا کہ اسے اٹھنا ہی پڑا، شاہ زیب اس کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف ہوگیا، عجیب و غریب لڑکی تھی، کسی طرح جان ہی نہیں چھوڑتی تھی، شاہ زیب اس سے اتنا منحرف نہ ہوتا اگر وہ دیو قامت بالک درمیان میں موجود نہ ہوتا، وہ کمبخت ہر وقت ہی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی رقص کے دوران وہ خاموش بیٹھا شاہ زیب اور ایرا کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں، شاہ زیب کے قدم ڈگمگا گئے اور ایرا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''کیوں... کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں رقص کرتی رہو۔'' شاہ زیب نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور ایرا مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ شاہ زیب کے حواس اب برقرار نہیں رہے تھے، رقص میں ذرا بھی لطف نہیں آرہا تھا اور شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔
''ارے یہ کیا کررہے ہو؟'' دفعتاً ایرا کسمسائی اور شاہ زیب چونک پڑا۔

''کیا بات ہے؟''

''بار بار میرا پاؤں کچل رہے ہو۔''

''سوری۔''

''تم کچھ الجھے ہوئے ہو۔''

''ہاں شاید۔''

''کیا اس کی وجہ وہ لڑکی ہے؟''

''کون؟'' شاہ زیب چونک کر بولا۔

''سونارا کی بات کر رہی ہوں۔'' ایرا کے لہجے میں جلن ابھر آئی اور شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔

''جی نہیں محترمہ، اس کی وجہ وہ لڑکی نہیں ہے بلکہ وہ دیوزاد ہے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کئی بار ہڑپ کر چکا ہے۔''

''تم اس کی طرف غور بھی نہ کیا کرو۔''

''میں صرف اپنی طرف غور کرتا ہوں اور میں... آپ خود میرا جائزہ لے سکتی ہیں۔''

''وہ دنیا کا سب سے بزدل انسان ہے، کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''تب تو وہ خطرناک ہے، کیونکہ بہادروں کی بہادری سے نمٹا جا سکتا ہے، لیکن جب کوئی بزدل سینہ تان کر سامنے آ جائے تو اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''نرالی منطق ہے۔'' ایرا بولی۔

''لیکن حقیقت پر مبنی ہے، تم اسے میرا تجربہ بھی کہہ سکتی ہو۔'' شاہ زیب نے گہری سانس لے کر کہا۔

بہر حال ایرا نے کسی منطق پر غور نہ کیا اور مسلسل شاہ زیب پر نازل ہی رہی، اس سے پیچھا اسی وقت چھوٹا جب یہ ہنگامے ختم ہوئے۔ تفریحات ختم ہو گئیں اور شاہ زیب اپنے خیمے میں آرام کرنے لیٹ گیا، دیر تک مختلف خیالات میں ڈوبا رہا پھر نیند آ گئی۔

☆......☆......☆

نجانے کتنی دیر گزری تھی کہ آنکھ کھل گئی، کوئی سرسراہٹ سنائی دی تھی، شاہ زیب اچھل کر بیٹھ گیا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور پھر اسے خیمے کا ایک گوشہ اٹھتا نظر آیا۔ کوئی خطرناک جانور بھی ہو سکتا تھا، شاہ زیب کسی قدر خوفزدہ ہو گیا، لیکن تاریکی کے باوجود شاہ زیب نے سفید ڈاڑھی اور سفید بال دیکھ لیے پورے گروہ میں ایک ہی شخص ایسا تھا اور یہ تھے مسٹر گرج.....

''مسٹر شاہ زیب۔'' مسٹر گرج کی آواز ابھری۔

''میں جاگ رہا ہوں مسٹر گرج۔'' شاہ زیب نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''سوری مسٹر شاہ زیب اس وقت آپ کو اس طرح پریشان نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن میں کئی دن سے برداشت کر رہا تھا اور اب مجھ میں مزید برداشت کی ہمت نہیں رہی تھی۔''

''خیریت... کیا بات ہے؟''

''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بارے میں تفصیلات معلوم ہونے کے بعد کہ تمہارا تعلق اس گروہ سے براہ راست نہیں ہے، مجھے تم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' شاہ زیب نے چونک کر پوچھا۔

''میں اور میری بیٹی صرف دو افراد ایسے ہیں جو اس گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم ان کے درمیان قیدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''اچھا.....'' شاہ زیب نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''بظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔''

''بظاہر... اور اس کی وجہ بھی ہے۔''

''کیا؟''

''میری صحت اچھی ہے، اس کے باوجود میں اپنی ذہنی طور پر معذور بیٹی کے ہمراہ اس بھیانک صحرا میں تنہا سفر نہیں کرسکتا، ظاہر ہے یہ لوگ یہ بات جانتے ہیں اس لیے انہیں میرے فرار کا اندیشہ نہیں ہے۔''

''کیا آپ ان کے درمیان سے فرار ہونا چاہتے ہیں مسٹر گرج؟''

''نہیں... میں تمہیں اپنی اور استون برادرز کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔'' بوڑھے گرج نے جواب دیا اور شاہ زیب خاموشی سے گہری گہری سانسیں لینے لگا، وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر گرج آپ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے، آپ مجھے صرف ایک کہانی سنا سکتے ہیں، جبکہ تو کہانیوں کی پوری کتاب ہوں، بہرحال سنا دیں اپنی کہانی۔ مسٹر گرج کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''دولت کے حصول سے دلچسپی رکھتے ہو؟''

''ہاں۔'' شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی ''اس سے کسے دلچسپی نہیں ہوتی، مگر اسے بھی تو کسی سے دلچسپی ہو؟''

''یقیناً یہ خزانہ تمہارے لیے بھی دلکشی کا حامل ہوگا جس کے لیے استون برادرز کام کررہے ہیں''

''میں بیوقوف نہیں ہوں خزانوں کے لیے ہونے والے کھیل جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ جب کسی کو دولت ملتی ہے تو اس کی سوچ کا کیا انداز ہوتا ہے۔''

''اوہ... ویری گڈ، اس کا مطلب ہے کہ تم ایک ٹھوس انسان ہو اور مجھے اپنے مشن میں کامیابی ہوسکتی ہے۔''

''کون سا مشن؟''

''بہت پہلے کی بات ہے غالباً اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ تین مہم جو، جن میں سے دو کا تعلق ایک ہی ملک سے تھا، صحرائے اعظم آئے، وہ یعنی شان گرج اور نائیکل استون ایک ساتھ یہاں آئے تھے، ان دونوں کی ملاقات صحرائے اعظم میں ایک شخص سے ہوئی جس کا نام سوناٹا تھا۔ سوناٹا سب سے زیادہ طاقتور سب سے زیادہ خوبصورت جوان تھا، صحرائے اعظم میں ہم تینوں بہت دور تک نکل گئے۔ تب ہماری ملاقات ایک بوڑھے سیاح سے ہوئی جس کی دونوں ٹانگیں بھیڑیے کھا گئے تھے، بوڑھے سیاح کو بچانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا، مرتے ہوئے اس نے شیکال کے خزانے کا حوالہ دیا، اسی خزانے کا حصول اس کی آرزو تھی، لیکن شدید زخمی ہونے کی وجہ سے وہ اسے حاصل نہ کرسکا، اس نے خزانے کا نقشہ ہمارے حوالے کردیا اور اس کی تفصیل بتانے کے بعد مرگیا... اس کی تدفین کے بعد ہم نے خزانے کی تلاش کی ٹھانی اور نقشے کے سہارے شکال چل پڑے۔

ہم تینوں ذہین تھے، بالآخر ہم قبیلہ نوزاک میں داخل ہوگئے، لیکن اس کے بعد وہی روایتی کہانیاں شروع ہوگئیں، نوزاک میں ہمیں وحشی قبیلے کا شکار ہونا پڑا اور ہم قید ہوگئے۔ طویل عرصہ اس قید میں گزر گیا، پھر حالات بدلے۔ شیکال قبیلے کے سردار کی بیٹی سوناٹا پر عاشق ہوگئی اور سوناٹا کو اس سے پیار ہوگیا، لڑکی نے سوناٹا کو اس قید سے آزاد کرالیا اور ہم دونوں بھی رہا ہوگئے، اس لڑکی کا نام میسی تھا، میسی نے سوناٹا سے شادی کرلی لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دونوں کی شامت آگئی، کیونکہ اب ہم اس قبیلے کے فرد بن چکے تھے اور اس سے باہر نہیں جاسکتے تھے، ہم دونوں ہی شادی شدہ تھے، یعنی میں اور استون، استون درحقیقت شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، استون برادرز اس کے جڑواں بیٹے ہیں۔

سوناٹا بدل نہیں گیا تھا، لیکن ظاہر ہے ہم لوگ ان وحشیوں میں پوری زندگی نہیں گزار سکتے تھے، سوناٹا بھی یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، میسی سے اس کی بیٹی پیدا ہوگئی، میسی سوناٹا پر حاوی تھی اور سوناٹا کی مجال نہیں تھی کہ وہ باہر جانے کا نام بھی لے سکے، ہماری کوششیں ناکام ہوگئیں اور ان کوششوں کے نتیجے میں ہمیں ایک بار پھر قید کرلیا گیا، یعنی مجھے اور استون کو، سوناٹا آزاد تھا لیکن درپردہ یہاں سے فرار کی کوششوں میں مصروف تھا اور اب وہ اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا، وہ چاہتا تھا کہ صرف اپنی بیٹی کو نکال لے جائے تاکہ اسے بہتر مستقبل دے سکے، وہ کوششیں کرتا رہا اور ایک بار اسے کامیابی حاصل ہوگئی۔''

شاہ زیب حیرت اور دلچسپی سے اس کی داستان سن رہا تھا، واقعی حیرت انگیز داستان تھی مسٹر گرج کی، اس نے کچھ دیر رکنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

''تمام تیاریاں مکمل تھیں، اس کے بعد ہم تینوں فرار ہوگئے، بیسی کی بیٹی شوراک اس وقت میرے پاس تھی اور سوناٹا میری مدد کررہا تھا، ہم دونوں رسیوں کے اس پل کو عبور کر گئے جو ہم نے عارضی طور پر تیار کیا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب سوناٹا پل عبور کرنے والا تھا وحشی عقب سے پہنچ گئے اور انہوں نے سوناٹا کو پکڑ لیا، ہم لوگوں تک اس کی رسائی اس پل کے ذریعے ممکن تھی، لیکن موجودہ حالات میں پل کو برقرار رکھنے کا مطلب تھا کہ ہم بھی ان کی گرفت میں آجائیں، چنانچہ مجبوراً ہم نے پل کاٹ دیا۔ سوناٹا ان کے قبضے میں رہ گیا، ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ہم اپنے دوست کو رہا کرا سکتے، مجبوراً یہی فیصلہ کیا گیا کہ ہم یہاں سے نکل چلیں اور سوناٹا کو اس کی تقدیر پر چھوڑ دیا جائے، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم واپس جا کر دوبارہ خزانے کے حصول کے لیے کوشش کرسکیں۔ چنانچہ اس پروگرام کو بعد کے لیے ملتوی کردیا گیا اور سوچا گیا کہ ازسرنو تیاریاں کرکے ہم واپس آئیں گے، اپنے دوست سوناٹا کو ان کی قید سے چھڑائیں گے اور خزانے کے حصول کی کوشش کریں گے، لیکن وقت بار بار ساتھ نہیں دیتا، ہم اپنی دنیا میں واپس آگئے، دوبارہ صحرائے اعظم کے لیے تیاریاں کرنا ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ مائیکل اسٹون اور میں بارہا اس سلسلے میں سر جوڑ کر بیٹھے لیکن کبھی بھی کوئی آخری فیصلہ نہیں کرپائے اور وقت گزرتا رہا، سوناٹا کی بیٹی شوراک میرے پاس پرورش پاتی رہی اور میں اس کی نگہداشت کرنے لگا۔ اسٹون نے مجھ سے ایک باعزت سمجھوتہ کرلیا، نقشوں کے درمیان سے دو ٹکڑے کردیے اور ان میں سے ایک ٹکڑا اسٹون نے اپنے پاس محفوظ کرلیا۔ دوسرا ٹکڑا میرے پاس تھا۔ ہم نے یہی سوچا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو ہم خزانے کے حصول کے لیے دوبارہ کوششیں کریں گے اور اس وقت یہ نقشہ پھر جوڑ لیا جائے گا۔ ہم دونوں ہی مطمئن ہوگئے تھے۔

شوراک میرے پاس پرورش پاتی رہی، ایک وحشی قبیلے کی لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کے اندر وحشیانہ صفات باقی تھیں، لیکن شاید وہ گونگی تھی۔ میں نے اسے ہر طرح بولنے پر آمادہ کیا لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور وہ اسی انداز میں پرورش پاتی رہی۔ اس کے گونگے پن کا علاج کرانے کے لیے میں نے ڈاکٹروں کا سہارا بھی حاصل کیا لیکن ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو اسے گونگا قرار دے۔ اس کی مکمل خاموشی کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ بہرطور ہماری کوشش کارگر نہ ہوئی، مجھے اس کی پرورش کے دوران یہی محسوس ہوتا رہا جیسے اس نے کبھی اپنے آپ کو ہم میں ضم نہ سمجھا ہو اور اپنے طور پر بالکل الگ رہی ہو۔ میری بیٹی سونارا بھی اس کے ساتھ پروان چڑھ رہی تھی، لیکن دونوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ شوراک اپنی مرضی کی مالک تھی۔ وہ اپنے طور پر جیتی تھی، میں نے اسے تعلیم دلانے کی کوشش کی اور میں نے اس سے دلچسپی کا اظہار بھی کیا لیکن اس کی بے زبانی اس کی تعلیم کے آڑے آئی۔ تاہم جب میں مجبور ہوکر اس کی تعلیم ختم کرنا چاہی تو اس نے شدت سے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ خاموشی سے اسے تعلیم دی جانے لگی، لیکن اس کی مسلسل خاموشی برقرار رہی اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اسے کوئی ایسی پراسرار بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر ہے۔ بہرطور اب یہ تصور میرے ذہن سے نکل گیا تھا کہ شوراک کبھی بولے گی۔

وقت گزرتا گیا، مائیکل اسٹون بیمار ہوگیا، اس کے دونوں جڑواں بیٹے اس کی بے پناہ دولت نے پرورش پا رہے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں کبھی اسٹون کی عیادت کے لیے جاتا تو وہ خزانے کا تذکرہ نکال بیٹھتا، اس کے دل میں شدید آرزو تھی کہ وہ عظیم الشان خزانہ حاصل کیا جائے دوسری طرف میرے وسائل بھی ایسے نہیں تھے کہ میں ان کو بروئے کار لاکر کسی خزانے کی تلاش میں صحرائے اعظم میں نکل آؤں۔

وقت مزید گزر گیا، اس کے بعد مائیکل اسٹون کا انتقال ہوگیا، مجھے اپنے اس مہم جو دوست کی موت کا بہت افسوس تھا، لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اسٹون برادرز اپنے باپ سے بالکل مختلف نوجوان ہیں۔ مائیکل اسٹون کی موت کے بعد انہوں نے ایک فلم کمپنی قائم کی اور اس کے بینر تلے کئی فلمیں بنائیں، لیکن نجانے کیوں ان کے ذہن میں بھی خزانے کا تصور جم گیا تھا۔ خزانے کا وہ آدھا نقشہ جو مائیکل اسٹون کے پاس محفوظ تھا اب اسٹون برادرز کی ملکیت بن چکا تھا۔ بہت

عرصے کے بعد اسٹون برادرز میں سے ایک نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی اور کہا کہ اب وہ صحرائے اعظم جانا چاہتے ہیں چنانچہ میں یا تو ان کا ساتھ دوں اور خزانے کے حصول میں ان کا شریک کار بن جاؤں یا پھر وہ آدھا نقشہ ان کے حوالے کردوں، انہوں نے اس کے لیے مجھے ایک بہتر رقم کی پیشکش بھی کی تھی، میں الجھن میں تھا۔ میں اپنی اس فطرت کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کے تحت خزانہ میرے دل میں بھی مچلتا رہتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ کوئی ایسا ذریعہ حاصل ہوجائے جس سے میں وہ خزانہ حاصل کرسکوں۔ میری بیٹی سونارا بیمار رہتی ہے اور ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے، میرا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اسٹون برادرز نے مجھ سے پھر ملاقات کی اور اس خزانے کے سلسلے میں تمام تفصیلات طلب کیں۔ میں نے اسٹون برادرز کو شروع سے لے کر آخر تک تمام کہانی سنادی۔ انہوں نے پھر مجھے پیشکش کی کہ میں ان کے ساتھ صحرائے اعظم کا سفر کروں لیکن میں نے معذوری کا اظہار کردیا اور اسٹون برادرز مجھ سے ناراض ہوگئے۔ انہوں نے کہا میں دونوں کاموں میں ان سے تعاون نہیں کررہا، آخر میں انہیں وہ نقشہ فروخت کیوں نہیں کردیتا، میں نے ان سے کہا کہ بہت جلد انہیں اس بارے میں اطلاع کردوں گا۔ چنانچہ وہ چلے گئے، لیکن مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ شوراک کسی خفیہ جگہ سے ہماری ساری باتیں سن رہی ہے اور اپنے پورے ماضی سے باخبر ہوگئی ہے، میں نے اس رات جب سے کھانے کی میز پر دیکھا تو اس کا چہرہ جوش و غضب سے سرخ ہورہا تھا، اس نے کھانا بھی نہ کھایا، میں حیران ہوگیا تھا، میں نے اس کی پرورش اپنی اولاد ہی کی طرح کی تھی چنانچہ میں نے اس سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بولتی وہ ویسے بھی نہیں تھی ہر اہم بات کو لکھ کر دیا کرتی تھی۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ وہ لکھ کر مجھے بتائے کہ اس کی ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا اور اسی رات میری تجوری سے خزانے کا نقشہ غائب ہوگیا۔ میں نے اس وقت تو توجہ نہیں دی تھی لیکن غالباً تیسرے ہی دن شوراک نے وہ ٹکڑا میرے سامنے رکھا اور اسے اٹھا کر اپنے گریبان میں رکھ لیا، وہ غالباً یہ کہنا چاہتی تھی کہ اب اپنا گھر وہ خود تلاش کرے گی اور اپنے والدین سے ملے گی۔ میں نے اس وقت یہ تفصیلات سمجھی نہیں، لیکن اس کے بعد شوراک میرے پاس سے اچانک غائب ہوگئی۔ خزانے کے نقشے کا ٹکڑا اس کے پاس تھا، میں سخت پریشان ہوگیا، اس طرح میرے اوپر ضرب بھی آسکتی تھی۔ شوراک سے مجھے محبت تھی، میں بڑی کشمکش کا شکار تھا کہ اسٹون برادرز نے دوبارہ مجھ سے رابطہ قائم کیا اور آخری فیصلہ کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ خزانے کے نقشے کا وہ ٹکڑا غائب ہوچکا ہے اور انہیں اس کے بارے میں تفصیلات بھی بتادیں۔

بہر طور وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے اور پھر ایک ہفتے کے اندر اندر ایک شام اس وقت جب میں ایک تقریب میں شرکت کے بعد واپس آرہا تھا مجھے اور میری بیٹی کو اغواء کرلیا گیا اور اس کے بعد ہمیں بے ہوشی کے عالم میں ایک طویل سفر کرنا پڑا۔ یہ سفر ہم نے کس طرح کیا یہ ہم نہیں جانتے بلکہ آج تک مجھے نہیں معلوم ہوسکا، بہر طور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو انہی خیموں کے شہر میں پایا اور یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ میں اسٹون برادرز کا قیدی ہوں۔ اسٹون برادرز نے اس سلسلے میں مجھ سے پھر ملاقات کی اور نقشے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ اس وقت تک انہوں نے میری بات کو تسلیم نہیں کیا تھا، لیکن پھر ایک رات دفعتاً ہی اسٹون برادرز کے خیمے پر شدید حملہ ہوا اور وہ اس حملے سے بال بال بچے، حملہ آور شوراک تھی جو طوفانی بدن اور طوفانی کارکردگی رکھتی ہے۔ پتا نہیں اس لڑکی میں یہ صفات کہاں سے پیدا ہوگئی تھیں بلکہ میں تو انہیں قدرتی ہی کہوں گا، اسٹون برادرز وہ نقشہ بچانے میں کامیاب ہوگئے اور اس وقت شوراک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، تب اسٹون برادرز کو اس بات کا یقین ہوا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست کہہ رہا ہوں، شوراک نقشے کا آدھا ٹکڑا لے کر فرار ہوگئی ہے، بہر طور وہ میری طرف سے مطمئن ہوگئے تاہم وہ رنجش کا شکار ہیں کہ میں نے ان سے تعاون نہ کرکے انہیں مشکل کا شکار کردیا ہے۔ شوراک بھی انہی علاقوں میں سفر کررہی ہے۔ اسے بھی خزانے کا آدھا ٹکڑا چاہیے جو اسٹون برادرز کے پاس ہے اور اس کے بعد وہ اپنی حکومت میں واپس جانا چاہتی ہے۔

یہ ہے میری کل کہانی، دراصل مسٹر شاہ زیب شوراک ان صحراؤں میں بھٹک رہی ہے اور اسٹون برادرز اپنے شاہانہ

انداز میں آگے کا سفر طے کر رہے ہیں، انہوں نے نہایت مضبوط بنیادوں اور مقامی حکومتوں کے مکمل تعاون سے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ بلاشبہ ان کے ساتھ اسلحے اور افراد کی طاقت ہے لیکن تمہیں شاید اس بات پر حیرت ہوگی کہ شوراک چھ کوششیں کر چکی ہے اور ان چھ کوششوں میں اس نے اسٹون برادرز کو بدحواس کر دیا ہے، ہر چند کہ وہ بقیا نقشہ حاصل کرنے کی کوششوں میں اب تک ناکام ہے، لیکن بہرطور یہ لوگ اس کی جانب سے سخت خوفزدہ ہو چکے ہیں۔ وہ بالکل تنہا ہے اور جب میں نے یہ سنا کہ اس نے تمہارا ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے تو میرے آنسو نکل آئے۔ بلاشبہ ایک تنہا لڑکی پورے گروہ کا مقابلہ کر سکتی ہے، اب تک وہ ان لوگوں سے خود کو محفوظ رکھے ہوئے ہے، یہی بڑی بات ہے میرے دوست، یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ تمہارا براہ راست کوئی تعلق اسٹون برادرز سے نہیں ہے اور تم شاید صرف اس لیے اس گروہ میں شامل ہو گئے ہو کہ خزانہ تمہارے لیے بھی باعث دلچسپی ہو سکتا ہے میری جرأت ہوئی کہ میں تم سے بات کروں اور اپنی یہ کہانی سناؤں۔''

مسٹر گرج کی کہانی بلاشبہ بڑی دلچسپ تھی، شاہ زیب کافی دیر تک اس پر غور کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

''لیکن مسٹر گرج میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''ہاں اگر تم خلوص دل سے کچھ کرنے پر تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔''

''میں ہمیشہ خلوص دل سے تیار ہو جایا کرتا ہوں۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسٹون برادرز نے تمہارے سامنے واپسی کی تجویز بھی رکھی تھی اور تم نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا تھا اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تم خزانے سے دلچسپی رکھتے ہو۔ خزانے سے یہ دلچسپی بلاشبہ ہر شخص کو ہو سکتی ہے، لیکن اسٹون برادرز کے ساتھ تم نے جو یہ اتنا بڑا گروہ دیکھا ہے ان میں سے ہر شخص خزانے کا حصے دار ہے، ذرا تم غور کرو اگر خزانہ ہمیں دستیاب ہو گیا تو اس کے کتنے ٹکڑے ہوں گے اور ان مہم جوؤں کے ہاتھ کیا آئے گا۔ اس کے برعکس ہم تین افراد ہیں، تم میں اور میری بیٹی، اگر ہم اس خزانے کے حصول میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری مالی حیثیت کیا ہوگی، میں شوراک کی ذہنی کیفیت جانتا ہوں وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کی خواہش مند ہے، نہ اسے خزانے کے حصول سے دلچسپی ہے اور نہ وہ اس کے حصول کے لیے سرگرداں ہے۔ ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں اور اسٹون برادرز کو دھوکہ دینے کے لیے تم سے بہتر مہرہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی زندگی خطرے میں ڈالو، خزانے کے نقشے کا دوسرا حصہ چراؤ اور یہاں سے نکل جاؤ، یہ ممکن نہیں ہوگا اور اس طرح ہمیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم جن راستوں پر سفر کر رہے ہیں ان پر سفر جاری رکھیں اور جب بھی کبھی ہمیں موقع ملے ہم شوراک کی مدد کریں۔ یہ میرے محبت کے جذبات بھی ہیں اور اس کے لیے انسانیت کے جذبات بھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتی ہے اور اپنا لالچ بھی ہے، بلاشبہ ہم اسٹون برادرز کے ساتھ ہی سفر کریں گے لیکن اگر کبھی شوراک اسٹون برادرز کے چکر میں پھنس جائے تو میں اور تم مل کر اس کی مدد کریں اور اگر کوئی ایسا ہی موقع پیش آ جائے کہ ہمیں اسٹون برادرز کے گروہ سے نکلنا پڑے تو ہم اس کے لیے بھی بھرپور کوشش کریں گے اور یہ کام نہایت احتیاط کے ساتھ کرنا ہوگا اور ایک خاص بات جو میں تمہیں بتا رہا ہوں اور جو میرا اہم راز ہے اگر تم اسے افشا کر دو گے تو میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی لیکن میں تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ راز یہ ہے میرے دوست کہ کم از کم میں تو ان راستوں پر سفر کر چکا ہوں، نقشہ اس خزانے کا ہے اور وہ خزانہ ہمیں شیکال پہنچنے کے بعد ہی دستیاب ہو سکتا ہے، لیکن اسٹون برادرز یوں سمجھ رہے ہیں کہ موجودہ راستے بھی اس خزانے یعنی نقشے میں درج ہیں۔ وہ مسلسل راستے تلاش کر رہے ہیں جبکہ یہ راستے میں جانتا ہوں۔ مائیکل اسٹون نے یقیناً انہیں ان راستوں کے بارے میں بتایا ہوگا اور وہ ابھی تک صحیح راستوں پر جا رہے ہیں، لیکن اگر وہ یہ راستے طے بھی کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے اس کے بعد مشکلات ان کے سامنے ہوں گی۔ اگر ہم شوراک کے ذریعے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کریں تو غالباً اس کہانی میں تمہیں شوراک کی ماں کا کردار ضرور یاد ہوگا، وہ اس وقت قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی، اگر شوراک کو لے کر میسی کے پاس پہنچیں گے تو یقینی طور پر اس کی محبت اور مراعات کا مرکز ہوں گے کیونکہ شوراک میسی کی بیٹی ہے، جبکہ اسٹون برادرز کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا، اس طرح سمجھ لو کہ ہمیں ایک زبردست قوت حاصل ہے بشرطیکہ تم اسے حاصل کرنے کی کوشش خود بھی کرو۔''

شاہ زیب دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بڑے میاں میری تو زندگی ہی آوارہ گرد ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے تو اس کی زندگی کے بارے میں پیشگوئی کر دی تھی اور گھر سے بددل ہو کر وہ اپنے ہم شکلوں کی تلاش میں نکلا تھا اور اب یہاں تک پہنچ گیا ہوں، دیکھتا ہوں آگے کیا کیا کھیل اور ہم شکل ملتے ہیں۔

چند لمحات خاموشی کے بعد شاہ زیب نے کہا۔

''مسٹر گرج، آج سے میں آپ کا اور شوراک کا ساتھی ہوں، بس آپ مجھے ہدایات دیتے رہیں کہ کس وقت کیا کرنا ہے، اپنے طور پر میں جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔''

مسٹر گرج کا چہرہ فطری مسرت سے سرخ ہو گیا تھا، انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''میں اپنی بیٹی کے ساتھ بالکل تنہا تھا اور اس کی کیفیت کا اندازہ تمہیں ہے ڈیئر شاہ زیب، میں سوچتا تھا کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آگئی تو بوڑھا گرج کیا کر سکے گا، لیکن اب تمہارا سہارا مل جانے پر میں اپنے آپ کو انتہائی مضبوط اور توانا محسوس کر رہا ہوں، میں ذہنی طور پر کمتر نہیں ہوں ڈیئر شاہ زیب اور بہترین پلاننگ کر سکتا ہوں، لیکن جسمانی طور پر میں جو کچھ نظر آتا ہوں وہ نہیں ہوں، عمر بھر طور ایک حیثیت رکھتی ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ ذہن میرا اور جسم تمہارا، خزانہ ہم سب کا.....''

مسٹر گرج کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک نظر آنے لگی، اس خزانے کی چمک۔ ان ہیروں کی چمک جو خزانے میں محفوظ تھے، کافی دیر تک شاہ زیب سے گفتگو کرتے رہنے کے بعد انہوں نے شاہ زیب کو گڈ بائی کہا اور باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان سے آزادانہ طور پر مل سکتا ہے کیونکہ اسٹون برادرز بہت گہرائیوں میں نہیں جھانکتے۔ ہاں جب کوئی کارروائی کی جائے ان کے خلاف تو پھر وہ باعمل ہو جاتے ہیں، چنانچہ ہمیں ملنے جلنے میں کوئی تکلف نہیں برتنا چاہیے۔ یہ کہنے کے بعد وہ باہر نکل گئے اور شاہ زیب اس کہانی کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔

یہ کہانیاں ہی تو میری زندگی سے وابستہ تھیں، پہلے اسٹون برادرز کی کہانی شروع ہو گئی تھی اور اب اس کے بعد مسٹر گرج اور شوراک کی، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کہانی کا اختتام کیا ہوتا ہے۔

گرج کے جانے کے بعد کافی دیر تک شاہ زیب اس کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کرتا رہا، اس بات کا اندازہ تو بخوبی ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی جسے شوراک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہی تھی جو شاہ زیب کے ساتھ رہی تھی اور جو شاہ زیب سے کچھ چاہتی تھی۔ اس کے انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ عام لڑکی نہیں ہے، گو یا وہ اس قبیلے کی بیٹی تھی، لیکن اس کی ذہانت اور اس کی دلیری کا شاہ زیب بھی دل سے قائل ہو گیا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر مسٹر گرج کا ساتھ ہی دے۔ ویسے اسٹون برادرز بھی برے نہیں تھے، لیکن یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خطرناک ہیں اور کسی بھی وقت وحشت خیزی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

رات کے کسی حصے میں نیند آگئی تھی، دوسری صبح جاگا تو پتا چلا کہ اسٹون برادرز پھر سفر کے لیے تیار ہیں، اب مجھے ان تمام باتوں پر حیرت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اسٹون برادراز کا اصل مقصد کیا ہے، لیکن یہ بھی دلچسپ بات تھی کہ انہوں نے خزانے کے حصول کے لیے کتنے اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے تھے اور بلاشبہ یہ ان کی ذہانت کی دلیل تھی کہ انہوں نے صحرائے اعظم میں داخل ہونے کے لیے ایک نفیس طریقہ اختیار کیا تھا جیسا کہ مسٹر گرج نے بتایا تھا کہ اسٹون خود فلم ساز نہیں تھا۔ اس کارروائی کا آغاز اس کے بیٹوں نے کیا تھا، ہو سکتا ہے کہ وہ فلم ساز کی حیثیت سے اپنے آپ کو مستحکم کرنا چاہتے ہوں اور بلاشبہ ایسا ہی تھا، انہوں نے صحرائے اعظم میں اپنے اس عظیم الشان سامان کے ساتھ داخل ہونے کے لیے جواز پیدا کر لیا تھا۔

سفر کے لیے تیاریاں مکمل ہو گئیں اور پھر یہ لوگ آگے بڑھ گئے، تاحد نظر پھیلے ہوئے جنگل پہاڑ دلدلیں انسانی زندگی سے دوران وحشت خیز علاقوں کو دیکھ کر عجیب عجیب خیالات دل میں آتے تھے، زمانہ قدیم میں جب انسان تہذیب سے نا آشنا تھا اس وقت صرف یہی کچھ ہوتا ہوگا۔ جنگلی جانوروں کے درمیان انسان بھی انہی کی طرح زندگی گزارتا ہوگا اور پھر تہذیب... تہذیب کے نام پر اس نے کیا کیا مصیبتیں خرید لیں؟ بلاشبہ وہ زندگی موجودہ زندگی سے کہیں بہتر تھی، خزانوں کا

چکر تھا اور نہ اقتدار کی ہوس... جس نے انسان کو پہلے سے کہیں زیادہ وحشی بنا دیا تھا، شاہ زیب خاموش بیٹھا رہا۔
آج اتفاق سے ایرا کو میرے ساتھ جگہ نہیں ملی تھی، پھر شاہ زیب نے اسٹون برادرز کا اصل کام دیکھا، یہاں جنگلی درندے وغیرہ تھے اور اسٹون برادرز ان کے درمیان شوٹنگ کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اس جگہ رک کر کیمرے وغیرہ تیار کیے گئے اور اس کے بعد ایک دلچسپ کارروائی شروع ہوگئی۔ وحشی جانوروں کو سلولائیڈ پر قید کیا جانے لگا اور اس کے لیے وہ کافی ایڈونچر پسندی کا ثبوت دے رہے تھے۔
یہ قیمتی منظر اسٹون برادرز کے لیے کتنے کارآمد ہوسکتے ہیں اس کا مجھے بھی اندازہ تھا، گاڑیاں یہاں سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں، دن بھر سفر کیا گیا اور اس کے بعد عارضی قیام کے لیے ایک جگہ منتخب کرلی گئی، عارضی قیام کے دوران یہ لوگ صرف گاڑیوں کے حصار میں کھلی جگہ پر رہا کرتے تھے۔ جو گاڑیوں میں سونا چاہتے تھے وہ گاڑیوں میں سو جاتے تھے۔ ایرا حیرت انگیز طور پر شاہ زیب سے دور رہی تھی اور غالباً اس نے کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس کے قریب آئے ورنہ اس جیسی بے باک لڑکی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا، لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا، شام ہوتے ہی ایرا اس کے پاس پہنچ گئی۔

☆......☆......☆

سورج چھپ چکا تھا اور ماحول پر تاریکی مسلط ہوتی جارہی تھی، اس نے عقب سے آکر شاہ زیب کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور میں چونک پڑا، لیکن ہاتھوں کی نرمی اور ملائمت سے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایرا ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی شاہ زیب کے سامنے آگئی اور بولی۔
''میں جائزہ لے رہی تھی کہ کیا تمہیں بھی میرا اتنا ہی خیال ہے جتنا مجھے تمہارا، پورا دن دور رہے ہو مجھ سے۔''
شاہ زیب نے نڈھال سے انداز میں ان معزز خاتون کی طرف دیکھا جو لمحوں میں طویل سفر کرنے کی عادی تھیں۔ اب وہ شاہ زیب سے بھی اس بات کی متوقع تھیں کہ وہ ان کی فرقت کا رونا روؤں گا، اب اتنا بیوقوف بھی نہیں تھا، اس نے مسکراتے ہوئے اپنا رخ تبدیل کردیا تاکہ وہ جو آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں شاہ زیب کے اوپر لدرہی تھی ذرا فاصلے سے ہوجائے، ایرا کہنے لگی۔
''آؤ ادھر چلتے ہیں، میں نے وہاں ایک چھوٹا سا چشمہ دیکھا ہے، وہاں لطف آئے گا' آؤ!'' اس نے شاہ زیب کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف لے جانے لگی، چشمہ بہت چھوٹا سا تھا اور اس کا پانی گدلا اور بدبودار تھا۔ ایرا کو وہاں پہنچ کر بہت مایوسی ہوئی وہ کہنے لگی۔
''میرا خیال تھا کہ چشمے کے پانی سے ہم لوگ غسل کریں گے، لیکن بدقسمتی.....''
شاہ زیب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلادی، ایرا ایک پتھر پر بیٹھ گئی، شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔
''یہ جگہ تو زیادہ اچھی نہیں ہے ایرا؟''
''جہاں میں ہوں وہ جگہ اچھی ہوتی ہے۔''
دفعتاً ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور دونوں دہشت زدہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ان کی نگاہ ہالک پر پڑی جو بوکھلایا ہوا سا نظر آرہا تھا، گڑگڑاہٹ ایک پتھر کی تھی جو چشمے کے کنارے سے لڑھک کر پانی میں جاپڑا تھا۔ اس کے بعد ہالک تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، ایرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر کہا'' آپ نے کوئی اندازہ لگایا مس ایرا؟''
''کیا؟''
''یہ بڑا پتھر لڑھک کر ہم پر بھی آسکتا تھا۔''
''گویا تمہارا خیال ہے کہ یہ ہالک کی حرکت تھی'' ایرا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی، پھر اس نے کہا۔
''ہالک ایسا تو نہیں۔ وہ شیر جیسے جسم کا مالک ہے، لیکن اس کے سینے میں ایک چوہے کا سا دل ہے۔''
''یہاں سے چلیں...'' شاہ زیب نے کہا، ہالک کی اس حرکت کو شاہ زیب نے بھی عجیب و غریب انداز میں دیکھا اور

سوچا تھا، وہ اب تک صرف دھمکیاں ہی دیتا رہا تھا، عملی طور پر کچھ نہیں کیا تھا۔ شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، ایرا سے اسے کوئی خاص رغبت بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں واپس آ گئے، ایرا بھی ہالک کی اس حرکت سے شاید کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی کیونکہ اس کے بعد وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہ رکی اور اسے نجات مل گئی۔

شاہ زیب نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ ہالک کے ہاتھوں شکار ہو جائے بہتر ہے کہ ہالک کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کر دے اور اس سے کہہ دے کہ بھائی تیری محبوبہ تجھے مبارک... مجھے جان دینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کس طرح کروں...

رات کا کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد شاہ زیب نے بھی اپنے لیے ایک جگہ منتخب کر لی اور ایک ٹرک کے نیچے جا لیٹا تھا۔

ابھی اسے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً ہی دوسری سمت سے ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دی، شاہ زیب نے گردن گھما کر دیکھا اور چونک پڑا، یہ سونارا تھی، اس نے بھی غالباً شاہ زیب کو دیکھ لیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس کی سفید آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کا چہرہ شاہ زیب کی ہی جانب تھا، شاہ زیب نے اس کے آس پاس دیکھا اور یہ غور کرنے لگا کہ مسٹر گرج بھی یہاں کہیں آس پاس ہی موجود ہیں یا نہیں، لیکن سونارا کے پاس وہ نظر نہیں آئے، غالباً اور کوئی شخص بھی یہاں موجود نہیں تھا، شاہ زیب نے دل ہی دل میں غور کیا کہ سونارا اتفاقیہ طور پر اس طرف آئی ہے یا اس میں کوئی اور تصور ہے، چند لمحات دونوں خاموش رہے، فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو نظر انداز کر سکتے، مجبوراً شاہ زیب کو ہی بولنا پڑا۔

''ہیلو مس سونارا۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے دیکھتی رہی، پھر شاہ زیب نے کہا۔

''مسٹر گرج کی زبانی آپ سے تعارف ہو چکا ہے اور درحقیقت یہاں جتنے لوگ موجود ہیں، میری مراد خواتین سے ہے، ان میں آپ مجھے سب سے بہتر نظر آئی ہیں، خاموش طبع دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے والی۔''

وہ اب بھی خاموشی سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی، تب شاہ زیب نے کہا۔

''محترمہ اب اس طرف آ ہی گئی ہیں تو کچھ باتیں کریں میں ایک بے ضرر آدمی ہوں اور آپ کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

سونارا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ خوش ہو گیا، نجانے کیوں اس لڑکی سے ایک انسیت سی محسوس ہو رہی تھی، غالباً اس کے ذہنی توازن کی خرابی اور اس کی یہ کیفیت دل پر اثر انداز ہوئی تھی، شاہ زیب نے اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر کہا۔

''اگر آپ مجھ سے دوستی کرنا چاہیں تو میں آپ کو اچھے اچھے لطیفے اور کہانیاں سناؤں گا، ویسے تو میں بذاتِ خود ایک کہانی ہوں، میں نے ایک ایسی منحوس شکل پائی ہے جو میرے لیے مصیبت کا باعث ہے، پتا نہیں اس شکل نے مجھے کیسے کیسے چکروں میں پھنسا دیا ہے۔'' شاہ زیب کے ان الفاظ پر سونارا کے ہونٹ کپکپائے اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی، لیکن پھر خاموش ہو گئی۔

''بولیے پلیز بولیے، جب آپ یہاں آ ہی گئی ہیں اور ہم اتفاق سے یکجا ہو گئے ہیں تو کچھ بولیے مس سونارا۔'' شاہ زیب نے عاجزی سے کہا اور اس کے ہونٹ کپکپاتے رہے، لیکن ان سے آواز نہیں نکلی تھی، پھر دفعتاً ہی کچھ اور بھی ہوا، وہ تھوڑی سی کھسکی اور اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

یہ دوستی اور اپنائیت کا اظہار تھا، میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی ملائمت سے اسے دبانے لگا۔

''میں جانتا ہوں کہ اگر آپ بولنے کی تھوڑی سی کوشش کریں تو آپ کو اس میں کامیابی ہو سکتی ہے، ویسے بھی آپ ایک مکمل خاتون ہیں، بلاشبہ ایک نفیس ترین خاتون...''

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)

پہلا شعلہ

محبت اور نفرت کی دہکتی آنچ میں لو دیتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

کتے کی موت

ندیم عباس میواتی



وہ جب سے اس کی دکان پر آئی تھی تب سے سجاول بے چینی کا شکار تھا۔ اس نے اپنی اس بے چینی کو دور کرنے کے لیے مختلف طریقے آزما ڈالے۔ مگر پھر بھی وہ اس اضطراب سے جان نہ چھڑا سکا۔ وہ حیران تھا کہ آخر کیا وجہ ہے؟ جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آخر ایسی کیا وجہ ہے جو اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ تمام جتن کرنے کے بعد بھی جب وہ اپنی بے چینی سے جان نہ چھڑا سکا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سے بات کرے گا۔ اسے اپنی بے چینی کا حال بتائے گا۔ وہ اس کی اک جھلک پر ہی دل ہار بیٹھا تھا۔

وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ دو دن پہلے اس کی دکان پر سودا لینے آئی تھی۔ وہ مکمل حجاب میں تھی۔ صرف اس کی کاجل بھری گول مٹول تیر جیسی لمبی آنکھیں ہی دکھائی دی تھیں، وہ بھی کچھ پل کے لیے......

سجاول کا ایک بہت بڑا کریانہ اسٹور تھا۔ جسے ایک جدید گروسری اسٹور کہہ سکتے تھے۔ جس پر، ہر وقت گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، جس میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔

اس قدر تو اُسے کسی نے بھی متاثر نہ کیا تھا مگر وہ بس اک پل میں ہی سجاول کو بے چین کر گئی تھی۔ اب وہ بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے نجانے کیوں یقین تھا کہ وہ ضرور اس کے اسٹور پر سودا سلف لینے آئے گی۔

☆......☆......☆

جون کا مہینہ اور گرمی جوبن پر...... ہر شخص اپنے گھر میں دبکا بیٹھا تھا۔ سجاول اسٹور پر سست انداز میں گاہکوں سے ڈیلنگ کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر سامنے اسٹور کے گلاس ڈور پر پڑی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

سامنے وہی دلربا، وہی دشمنِ جاں، وہی حسن پیکر، اس کے دل پر قبضہ کرنے والی جس نے اسے بے چینی کا شکار، راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد کر رکھا تھا۔ وہ سامنے اک ادائے بے نیازی سے خود کو حجاب میں سمیٹے چلی آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پسینے میں تربتر محسوس کیا۔

کیونکہ جس سے بات کرنے کو وہ تڑپ رہا تھا وہ یوں اچانک اس کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔ اس نے بھی نظر اُٹھا کر اس کی طرف

دیکھا مگر سجاول کو اپنی طرف وارفتگی سے دیکھتے ہوئے فوراً نظر جھکالی، جس پر سجاول کو بھی شرمندگی ہوئی اب اس کے کان اس کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ مگر جب اس نے اشیاء کی لمبی فہرست کو کاؤنٹر پر رکھا تو اسے اپنی آرزو دم توڑتی محسوس ہوئی۔

سجاول نے فہرست میں مطلوبہ اشیاء کو تلاش کرنے کے لیے ملازم کو بلایا خود تیزی سے اپنے دماغ کو چلانے لگا اور اس سے بات کرنے اپنے حال دل بتانے کا طریقہ سوچنے لگا مگر ہمت ساتھ نہ دے رہی تھی۔

جیسے ہی اسے پیسے پکڑانے لگی تو سجاول نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا، مخمل جیسے نرم ہاتھ سے ٹکراتے ہوئے اسے کرنٹ سا لگا اور پیسے زمین پر گر گئے۔ وہ پیسے اٹھانے کے لیے جھکی تو وہ بھی جھکا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مدہوشی میں وہیں جھکا جھکا اسے تکنے لگا۔ اس انداز پر اس کی ہنسی نکل گئی اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''او پاگل۔'' کہتے ہوئے جلدی سے سودا اُٹھا کر وہ اسٹور سے تیزی سے نکل گئی۔ سجاول کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ آج اس ملاقات نے اسے سرشار کردیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کے ردِعمل پر مسکرائی تھی۔ اس سے سجاول کا حوصلہ بڑھ گیا تھا کہ اب آگ دونوں طرف برابر کی لگے گی۔ اس نے اسے اپنا حال دل بتانے کے لیے کاغذ و قلم کا سہارا لیا، پھر رات کو اسے عملی جامہ پہنایا اور پھر سے اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆......☆......☆



اچانک سجاول کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے نیند کی نگری میں جا چکا تھا۔ مسلسل گھنٹی کے بجنے سے اسے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے نیم وا آنکھوں سے فون کی اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے کال بیک کی جو پہلی ہی گھنٹی پر ریسیو کر لی گئی۔ جیسے وہ موبائل ہاتھوں میں تھامے انتظار میں بیٹھی ہو۔

''ہیلو۔'' ایک مترنم سی آواز سجاول کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہائے۔'' کہہ کر سجاول نے اپنے حاضر ہونے کا ثبوت دیا پھر گویا ہوا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور کال کرو گی۔''

''اوہ، ہو، اتنا یقین کس لیے۔'' اس نے مسکراہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اپنی محبت کے سچا ہونے پر۔'' سجاول نے بھی ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کیا کرتی! آپ کے پیام نے میرے دل میں ہل چل مچا دی۔ آپ کے الفاظ تیر بن کر دل پر وار کرنے لگے۔ دل نے اقرار محبت پر مجبور کر دیا۔''

''اوہ رئیلی! کیا میں سمجھ لوں کہ آپ نے میری محبت کو دل و جان سے قبول کر لیا۔''

''ہاں سجاول جی، رئیلی قبول کر لیا۔''

پھر وہ آپ سے تم بن گئے۔ پیار ہوا، اقرار ہوا، تعارف ہوا، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ صبح کی اذان کی آواز ہوش کی دنیا میں واپس لائی۔ کل رات بات کرنے کے وعدے کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا۔

سجاول نے بتایا کہ اس کے پاپا ریٹائرڈ پولیس آفیسر ہیں اور وہ خود کچھ پرابلم کی بنا پر پڑھائی مکمل نہ کر سکا تو پاپا نے یہ اسٹور کھلوا دیا۔ جس کی ڈیلی آمدنی ایک لاکھ تک تھی۔

یوں ان کا اچھا خاصا کھاتا پیتا گھرانہ تھا' جبکہ علینا مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے پاپا ایک شیشے کی فرم میں کام کرتے تھے۔ وہ لوگ اس محلے میں نئے آئے تھے۔

اور یوں علینا اور سجاول کی محبت دن بدن پروان چڑھنے لگی۔ علینا خود کو سجاول کے ساتھ پا کر ہواؤں میں رقص کرتا محسوس کرتی۔ وہ دکان پر جاتی، دیدار کرتی یوں دن مہینوں میں بدلنے لگے۔

☆......☆......☆

ایک دن اچانک سجاول نے پوچھا۔ ''علینا ہمیں فون پر بات کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''میرے خیال میں تین ماہ۔''

''کیا ہم زندگی بھر فون کے ہی محتاج رہیں گے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو سجاول......؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم روبرو بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے؟ میں تمہارا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔'' سجاول نے اپنا مطلب واضح کرتے ہوئے کہا۔

''کسی خوبصورت پارک میں یا پھر کسی رومان پرور ماحول مہیا کرنے والے ریسٹورنٹ میں......'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

''نہیں سجاول یہ مناسب نہیں ہوگا۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ میرے پاپا مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور باہر جانے کی میرے پاپا اجازت بھی نہیں دیں گے، وہ اتنے آزاد خیال نہیں ہیں۔''

''پاپا کو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟''

''اگر پتا چل گیا تو......'' علینا نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ سجاول نے پوچھا۔

''اتنا ہی ڈرتی ہو؟''

''نہیں میں ان کی اور اپنی بدنامی سے ڈرتی ہوں۔''

''تمہاری عزت میری عزت ہے علینا جانی۔''

''اور میں ایسا کوئی رسک لینا نہیں چاہتی۔'' علینا نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں سجاول۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' وہ متامل لہجے میں گویا ہوئی۔
''سجاول! میں کسی قسم کے خطرہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی؟''
''اگر میں تمہیں کسی خطرے میں مبتلا کروں تو مجھے موت آ جائے۔'' سجاول نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''پلیز فار گاڈ سیک سجاول!'' علینا جسم و جان سے لرز اٹھی۔
''ایسی منحوس بات منہ سے نہ نکالو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے تم میرے نزدیک کیا اہمیت رکھتے ہو۔ میں کتنا چاہتی ہوں تمہیں۔''
''مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا ہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔
''بدگمانی دل میں نہ لاؤ پلیز۔''
''چھوڑو ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' وہ خفگی سے بولا۔
علینا نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔
''اچھا سنو۔'' میں خود کوئی مناسب موقع نکال لوں گی۔ پھر ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر کہیں مل لیں گے۔
''ٹھیک ہے نا، اب تو خوش نا؟''
''تھینک یو سو مچ علینا، تھینک یو۔'' سجاول نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔
''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں تمہیں قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کے لیے جس قدر بے قرار ہوں تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔'' وہ دل کی بے تاب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
علینا لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ''سجاول ایک بات کا وعدہ کرو۔''
''بولو میری جان میں ایک سو ایک وعدے کرنے کو تیار ہوں۔''
''کبھی مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گے، وعدہ کرو۔''
''جان جگر یہ کیا بات کر دی تم نے۔ جان ہو تم میری سانس ہو۔ تو کیا میں تم سے جدا ہو کر زندہ رہ پاؤں گا۔
بہت دکھ ہوا علینا تمہاری بات سن کر۔'' سجاول نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''او نہیں سجاول جانا بس ایسے ہی خیال آ گیا۔ سوری جانی آئی ایم ریئلی سوری۔''
چلو پلیز اپنا موڈ ٹھیک کرو جانی۔'' علینا نے جلدی سے کہا۔
کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔
''سجاول!''
''جی۔''
''ہم کسی کھلی جگہ پر نہیں ملیں گے۔'' علینا نے خاموشی کو توڑا۔
''جو مزاج یار میں آئے۔'' سجاول نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔
''ویسے تم میرے گھر آ سکتی ہو۔ میں تو نہیں آ سکتا نا۔ تو کیا خیال ہے۔''
''ونڈرفل، اب مناسب موقع دیکھ کر تم خود مجھے انفارم کرو گی۔''
''ہاں یہ اب میری ذمہ داری ہے۔ اچھا اب میں سونے لگی ہوں۔'' علینا نے کہا۔
''ٹھیک ہے جانی اب کچھ دیر آرام کرو۔'' پھر ساتھ ہی اک زوردار کس کی آواز آئی۔ جس نے علینا کو اندر تک سرشار کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سجاول کے تصور سے لپٹ کر خوابوں کی نگری میں اتر گئی۔

☆......☆......☆

سجاول کافی دن چڑھے بیدار ہوا۔ ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ علینا کا نام اسکرین پر چمکتا دیکھ کر مسکراتے رچی ہوئی آواز میں کہا۔
''ہیلو علینا کیسی ہو؟''
''میں بالکل ٹھیک ٹھاک۔'' پُرمسرت آواز سجاول کی سمت سے ٹکرائی۔ جو اسے اندر تک سرشار کر گئی۔

اسے میں شکار کر لیتا ہوں اور جو میرے ردعمل میں شدید مزاحمت کرے تو میں اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں جاتا۔

بلکہ وہ میری نگاہ میں انتہائی محترم ہستی ٹھہرتی ہے۔ تم بھی میری طرف باآسانی آ گئی ہو تو آج تمہارا بھی شکار کر لیا۔''

پھر اس نے انگلی دائیں خالی صفحے پر رکھی وہاں کوئی تصویر نہ تھی مگر علینا کا نام درج تھا۔ سجاول نے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''یہاں میرے آٹھویں شکار کی تصویر رونق افروز ہوگی۔'' پھر علینا سے حاصل کردہ پوسٹ کارڈ سائز تصویر مذکورہ صفحے پر لگا دی۔

علینا کے پورے جسم میں تیزابی شرارے اڑ رہے تھے اس کا دل و دماغ منہ زور اور کرتوڑ آندھیوں کی زد میں تھا۔ اس کے خیالات احساسات اور جذبات نے بے بسی کی انتہا کو چھوا تو بے اختیار اس کو رونا آ گیا۔

''اتنا دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں علینا۔'' میں منتقم مزاج ضرور ہوں مگر کم ظرف نہیں ہوں۔ تم اس البم کے بارے میں ذرا فکر نہ کرو۔ یہ ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گی۔ کوئی دوسرا شخص اس کی گردنتک نہیں پا سکے گا۔

میں بلیک میلنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اپنے آنسو پونچھ لو۔''

''تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا سجاول۔'' علینا نے غصے اور لاچاری کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''میں اتنی بلندی سے گری ہوں کہ پستی کو چھونے سے پہلے اپنا نام و نشان کھو بیٹھی ہوں۔'' اس کی سسکیاں اور ہچکیاں بڑے تسلسل کے ساتھ ابھر رہی تھیں۔

''مجھ سے حسین عورت کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے ساتھ جو نشاط انگیز اور آسودگی بخش وقت گزارا ہے اگر تم چاہو تو اس کا معاوضہ وصول کر سکتی ہو۔ میں بلینک چیک کاٹ دیتا ہوں تم اپنی حیثیت اور اوقات کا تعین کرتے ہوئے اس میں رقم درج کر لینا۔''

علینا اچانک اٹھ کھڑی ہوئی پھر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دہاڑتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''میں تھوکتی ہوں تمہارے منحوس چیک پر...... اور تمہاری مردود صورت پر...... میرے دکھی اور زخمی دل کی بددعا ہے کہ تم کتے کی موت مرو۔''

اس کے بعد وہ آندھی اور طوفان کے مانند سجاول کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر تک کیسے پہنچی اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ابھی تک اس کے مما پاپا گھر نہیں آئے تھے۔

☆......☆......☆

اس واقعے کے بعد وہ چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ ایک روز وہ سب کے ساتھ بیٹھی ناشتا کر رہی تھی کہ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے شدید متلی کا احساس ہوا۔ چائے میں چینی زیادہ نہ تھی۔ یہ اس کے اندر کی گڑبڑ تھی جو اس کا جی متلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد واش روم کے اندر اس کی ابکائیاں واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔

علینا کی مما نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بات کی تو اس نے شدت سے انکار کر دیا۔

''نہیں ممی ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں۔ رات کو مرغن کھانا کھا لیا تھا، شاید یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' اس کی ماں ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ بیٹی کی دلیل اس کے حلق سے نہ اتر سکی۔

وہ جتنی شدت سے علینا کو کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے اصرار کرتی، علینا اس سے کہیں زیادہ شدت سے انکار کر رہی تھی۔

ماں کی کرید جاری رہی اور بالآخر اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ یقین ہوتے ہی اس کا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ بیٹی کے کارنامے نے اس کے پاؤں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بہلا پھسلا کر علینا سے سجاول کا نام اگلوا لیا تھا جس نے ان

کی عزت کا جنازہ نکالا تھا۔ اس نے پہلی ہی فرصت میں اپنے شوہر کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ میاں بیوی نے باہمی مشاورت سے طے کیا انہیں جا کر سجاول کے والد سے ملنا چاہیے کیونکہ یہ ان دونوں کا مشترکہ کھیل تھا اب عزت اسی میں تھی کہ جلد از جلد ان کی شادی ہو جاتی۔

☆......☆......☆

سجاول نے بڑے احترام سے عبدالرحمان اور اس کی بیوی کو اپنے شاندار کشادہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر ان کی آمد کی غرض دریافت کی۔ عبدالرحمان نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"بیٹا ہم تمہارے پاس سوالی بن کر آئے ہیں، ہمیں مایوس نہ کرنا۔"

"آخر بات کیا ہے انکل؟" سجاول حیرت سے بولا۔

"انجان نہ بنو بیٹے! اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" بیگم عبدالرحمان نے ملتجانہ انداز میں کہا۔ سجاول نے پلکیں جھپکائیں پھر اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں سمجھا نہیں انکل آپ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ہم علینا کے سلسلے میں آئے ہیں۔" عبدالرحمان نے مجبوراً بتایا۔

"کون علینا؟" سجاول نے چونکنے کی اداکاری کی۔

"خیریت تو ہے نا انکل؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" بیٹے عبدالرحمان کے لہجے میں دنیا جہاں کا غم اُمڈ آیا تم دونوں کی نادانی رنگ لے آئی ہے۔ اب تمہارا فرض بنتا ہے کہ پہلی فرصت میں علینا سے شادی کر لو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔"

عبدالرحمان نے اُسے بتایا کہ علینا تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

"واٹ۔" سجاول اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بیٹا۔" عبدالرحمان نے عاجزی سے کہا کہ علینا نے اپنی ماں کو بتایا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اب شادی ہی اس کا واحد حل ہے۔" سجاول نے برہمی سے کہا۔

"آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں نے ایسی کوئی نادانی نہیں کی جس کی سزا کے طور پر مجھے علینا کو قبول کرنا پڑے۔"

"تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا۔" بیگم عبدالرحمان نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"ٹھہرو۔ میں سمجھاتا ہوں۔" سجاول کا باپ لیاقت خان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ قہرناک نظر سے علینا کے باپ عبدالرحمان کو گھور رہا تھا۔ پھر پھنکارتے لہجے میں بولا۔

"تم دونوں شرافت سے اپنے قدموں سے چل کر جاتے ہو یا مجھے ملازمین کو زحمت دینا پڑے گی۔"

"ڈیڈی پلیز!" سجاول نے کچھ کہنا چاہا مگر لیاقت خان نے اسے جھڑک دیا۔

"تم چپ رہو سجاول! ان غریب لوگوں کی بلیک میلنگ کو میں بخوبی سمجھتا ہوں۔" اس نے عبدالرحمان کو نفرت آمیز نظروں سے گھورا پھر بیگم عبدالرحمان کو کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بڑے بڑے پھنے خانوں کو سیدھا کیا ہے۔" عبدالرحمان نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا تو خیال تھا اس صورت حال میں آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے لیکن آپ تو اُلٹا ہم پر بلیک میلنگ کا الزام لگا رہے ہیں۔"

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔" لیاقت خان نے خالصتاً پولیس والوں کے انداز میں کڑک کر کہا۔

"میں ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے آپ لوگوں کی پوری بات سن چکا ہوں۔ تم کسی اور کا گناہ میرے بیٹے کے کھاتے میں ڈال کر اسے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے مجبور کر رہے تھے۔"

"ہم نے جو کہا وہ حرف بہ حرف حقیقت ہے۔"

''واہ جی خیر ہے آج اتنا خوش۔'' سجاول نے رومینٹک ادا سے کہا۔
''آج میں بازار جارہی ہوں تو کچھ دیر کے لیے تمہارے پاس آجاؤں گی۔''
''سچ جانی کب آرہی ہو؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔
''بس کچھ دیر میں نکل رہی ہوں۔''
''اوشٹ یار۔''
''کیا ہوا سجاول؟'' علینا نے جلدی سے پوچھا۔
''کچھ نہیں یار جانی، میرے کچھ دوست آرہے ہیں۔''
''چلو کوئی بات نہیں، ہم پھر مل لیں گے۔''
''نہیں نہیں تم آؤ تب تک میں اُن کو رخصت کردوں گا۔''
''ارے نہیں نا اُن کو ٹائم دو۔''
''نہیں علینا جانی تم آؤ۔ میں تمہارا ویٹ کررہا ہوں اور تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔''
''کیا سرپرائز ہے کوئی کلیو دو؟''
''نہیں اگر اشارہ دے دیا تو سرپرائز کیا رہ جائے گا۔''
''اچھا جیسے تمہاری مرضی۔''
''اچھا اپنی ایک پاسپورٹ سائز تصویر لیتی آنا۔''
''شاید میرے وہ دوست آگئے ہیں۔'' سجاول نے کہا۔ بیرونی گیٹ پر بیل ہورہی ہے۔
''تم سے گھنٹہ بعد ملاقات ہوگی۔''
''اوکے اللہ حافظ۔'' اس نے کال ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

سجاول کے محل نما گھر کا بیرونی گیٹ بند نہیں تھا۔ سجاول نے علینا کو ایڈریس بتادیا تھا۔ گیٹ کھلا ہونے کے باوجود بھی اس نے اطلاعی گھنٹی بجانا مناسب سمجھا۔
وہ گیٹ کے پہلو میں نصب ڈوربیل کے قریب گئی پھر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ گھر کے اندرونی حصے میں ایک چڑیا چہچہا اٹھی۔ تھوڑی دیر بعد سجاول مسکراہٹ چہرے پر سجائے گیٹ پر آیا۔
''کمال ہے تم ابھی تک باہر کھڑی ہو جانی۔ میں نے تو خصوصاً تمہارے لیے گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا۔''
''اوہو۔'' وہ مسکرائی۔ پھر سجاول کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوگئی اور پوچھا۔
''تمہارے دوست چلے گئے سجاول۔''
''اتنے خوبصورت دوست کی آمد تھی۔'' سجاول نے میٹھے لہجے میں کہا۔
''میں نے اس لیے جلد از جلد ان دوستوں سے جان چھڑالی۔'' علینا خوش ہوگئی۔ گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہوئے علینا نے سوال کیا۔
''بڑی خاموشی لگ رہی ہے۔ کیا تم اکیلے یہاں رہتے ہو۔''
''ممی کا عرصہ ہوا انتقال ہوچکا۔'' وہ اُداس ہوگیا۔

''ہاں تم نے ایک مرتبہ بتایا تو تھا۔'' علینا نے چونکتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔
''گھر کے باقی افراد۔''
''بہنوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں اور پاپا کہیں باہر دوستوں کی طرف نکلے ہیں۔''
''اوہ، یہاں تو کوئی ملازم بھی نظر نہیں آرہا۔''
''ملازم کو دوستوں کے جانے کے بعد میں نے خود ہی چھٹی دے دی۔'' سجاول نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔
''میں نہیں چاہتا کہ ہماری ملاقات کسی کی بھی نظر میں آئے۔''
''تھینک یو سجاول! تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔''
''تھینک یو ہرگز نہیں۔'' سجاول نے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔
''اوہ! بس بھول گئی تھی۔ تم بہت اچھے ہو سجاول۔''
''تم سے زیادہ اچھا نہیں ہوں۔'' علینا سجاول کے ساتھ اس کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔

علینا کو اپنے بیڈ پر بٹھانے کے بعد بولا۔

''یار اب تو اپنا دیدار کروادو۔ چار ماہ سے نقاب زدہ آنکھیں ہی دیکھتا رہا ہوں۔''

جونہی علینا نے اپنا نقاب ہٹایا سجاول کی نظر سراپا حسن پر پڑی۔ اس نے اس سے قبل کبھی اتنا حسین چہرہ نہ دیکھا تھا۔ کاجل بھری آنکھیں، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ، چہرے کی رنگت ایسی جیسے دودھ میں جام شیریں ملا دینے سے نکھر آتی ہے۔

لمبے ریشمی بال جو اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ سجاول جو اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھا تھا، بے اختیار آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا اور گھیرے کو تنگ کرتا گیا۔ وہ اس وقت چونکا جب اس کے ہاتھوں میں علینا کا نرم و ملائم وجود کسمسایا۔

اس کے ہاتھوں کی گرفت سے اپنا وجود چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو زحمت دینا چاہی مگر سجاول نے اس کی استعداد گویائی سلب کر دی اور اس پر اپنی محبت کی برسات کر دی۔ اس کے انداز میں جارحیت آمیز وارفتگی پائی جاتی تھی۔

اس روز وہ جذبات کے منہ زور تیز و تند دھارے کے آگے بند باندھنے میں ناکام ہو گئے اور تمام حدود کو پامال کر دیا۔

جب ہوش آیا تو وقت کا پنچھی اُن کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ علینا اپنی نظر میں نابود ہو چکی تھی۔ وہ شرمندگی سے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ سجاول کی بھاری آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''علینا اپنے پرس سے اپنی تصویر تو نکالو، تمہیں سرپرائز دینے کا وقت آ گیا۔''

''اب کون سا سرپرائز باقی ہے سجاول۔'' وہ شاکی لہجے میں منمنائی۔

''تم تصویر تو دو مجھے۔''

علینا نے اپنی تصویر نکالنے لگی اس دوران سجاول دیوار گیر الماری سے ایک البم اٹھا لایا۔ علینا نے سوچا وہ اس کی تصویر اپنے البم میں لگانا چاہتا ہے۔ علینا نے تصویر اُس کو دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے سجاول۔''

''وکیا؟''

''اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔ ہمیں جلد شادی کر لینی چاہیے۔''

''تم نے فیصلہ غلط کیا ہے علینا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کانپ اٹھی۔

''مطلب سمجھ میں آ جانا ہے ادھر دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی سجاول نے اپنی گود میں رکھا ہوا البم کھولا۔ وہاں کئی خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ سجاول نے تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''یہ سب میرے بستر کی زینت بن چکی ہیں۔''

اور اک ادھ جلی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''یہ میری وائف کی تصویر ہے مگر اب اس کا انتقال ہو چکا ہے۔'' علینا نے حیرت اور تعجب کے ملے جلے تاثرات سے سجاول کو دیکھا پھر پوچھا۔

''تم نے پہلے تو یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔ میرے ساتھ تمہارے وعدے، قسمیں عہد و پیماں زندگی بھر ساتھ جینے مرنے کا وعدہ کہاں گیا۔'' وہ رونے لگی۔ وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔

''چار سال پہلے میں نے بڑے چاؤ سے غیرہ سے شادی کی تھی۔ میں نے اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسے ہر نعمت میرے گھر میں میسر تھی۔ دولت، عزت اور محبت سے میں نے اس کا دامن بھر دیا تھا۔ لیکن وہ مجھے کچھ بھی نہ دے سکی سوائے بدنامی، رسوائی اور اذیت کے۔

شادی کے ایک سال بعد ہی میں اسے طلاق دینے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ میری لاعلمی اور غیر موجودگی میں وہ میرے دوست سے عشق لڑانے لگی تھی۔ میں نے اس بے وفا کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کی بے وفائی نے دنیا بھر کی عورتوں کو میری نظر میں بے اعتبار بنا دیا۔

اس روز سے میں نے عورت ذات سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ جو با آسانی جال میں آ جاتی ہے۔

عبدالرحمان نے قدرے مضبوط لہجے میں کہا۔
''آپ کا بیٹا......''
''خبردار جو اب میرے بیٹے کا نام بھی لیا تو۔'' لیاقت خان نے چلا کر مزید گویا ہوا۔
''میں تم جیسے شریف بدمعاشوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ پہچانتا ہوں۔ تم اپنی بیٹیوں کے ذریعے امیر لڑکوں کو پھانستے ہو۔ اپنی بیٹیوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہو تاکہ وہ خوب گل کھلائیں۔ وہ شریف صاحب ثروت خاندانوں کے لڑکوں سے دوستی کرتی ہیں پھر تم نادانی کا ڈرامہ رچا کر مسکین صورت بنا کر لڑکے کے پاس چلے جاتے ہو کہ شادی کے لیے تیار ہو جائے۔ میں مانتا ہوں کہ تمہاری بیٹی سجاول کے دوستوں میں شامل ہو گی لیکن میرا بیٹا بے قصور ہے۔ تمہارا یہ ناٹک یہاں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ آئی سمجھ۔'' عبدالرحمان نے شکستہ لہجے میں کہا۔
''اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو ہم اپنی بیٹی کا میڈیکل چیک اپ کروا لیتے ہیں۔''
''تم میڈیکل چیک اپ کرواؤ یا فزیکل چیک اپ! مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہاری بیٹی اگر میرے بیٹے کی دوست تھی تو اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے دوست ہوں گے۔ پتا نہیں اس نے کہاں منہ کالا کیا ہے۔''
عبدالرحمان کے تن بدن میں آگ سی بھڑکی اس نے غصیلے لہجے میں استفسار کیا۔
''لیاقت خان صاحب! کیا آپ کی کوئی بیٹی ہے؟''
''میری دو بیٹیاں ہیں۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔
''پھر آپ کو دوسروں کی بیٹی کے بارے میں سوچ سمجھ کر زبان کھولنا چاہیے۔'' عبدالرحمان نے زہریلے لہجے میں کہا۔
''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بیٹی ایک نازک آبگینے کی مانند ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتی ہے۔''
''ہاں! یہ بات میں بخوبی جانتا ہوں۔ مجھے لیکچر پلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' لیاقت خان نے ترش لہجے میں کہا۔
''میں نے اپنی بیٹیوں کو بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے تمہاری بیٹی کی طرح وہ آوارہ نہیں پھرتیں جو مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ گیٹ اُدھر ہے پھر کبھی بھول کر بھی اِدھر کا رُخ مت کرنا۔''
عبدالرحمان اپنی بیوی کے ہمراہ لیاقت خان کے گھر سے نکلا۔ گھر پہنچ کر وہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں، جائیں تو کہاں جائیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ کسی بھی طور پر ایک صاحب ثروت ریٹائرڈ پولیس آفیسر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔
بیٹی نے ان کے منہ پر ایسا جوتا مارا تھا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ ایک خیال آتا تھا کہ علینا کے سینے میں گولی اُتار دیں، اسے زہر دے دیں یا گلا گھونٹ کر اس کا کام تمام کر دیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ علینا اُن کی اکلوتی اولاد تھی۔
پھر وہ یہ ہی سوچتے کہ خود کو ختم کر لیں تاکہ بار بار دنیا والوں کے سامنے جھکنے کی بجائے ایک مرتبہ ہی جھک جائیں اور ایسے جھک جائیں کہ پھر کبھی اُٹھ نہ سکیں۔
''اے اللہ! ہمیں عزت عطا فرما تاکہ ہم بدنامی سے نہیں عزت سے مر سکیں۔'' وہ دونوں جیتے جی مر گئے تھے۔
بدنامی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کوئی امید کی کرن نظر نہ آ رہی تھی۔ پھر وہ رات کے اندھیروں میں ایسے گم ہوئے کہ کبھی کسی کو اس محلے میں نظر نہ آئے اور دروازے پر بڑا سا تالا نظر آنے لگا۔
اِدھر سجاول اپنی نویں شکار کے لیے نکل رہا تھا کہ گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس میں اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ وہ پھر سے کھڑا نہ ہو سکا۔ زخم بڑھتے گئے۔ اُن میں کیڑے پڑ گئے۔ اسے علینا کی بددعا یاد آنے لگی۔ وہ رفتہ رفتہ یونہی کتے کی موت مر گیا۔

☆☆......☆☆

عزت دار



ارم ناز

عزت دار معاشرے کے بطن سے جنم لینے والی ایک برہنہ سچائی' کراچی سے

یہ مصر کے کوچہ و بازار نہ تھے۔ جہاں لونڈیاں بکتی ہیں بلکہ یہ تو لاہور کا ایک بالا خانہ تھا۔ یہاں کے شریف زادے تو صرف جسم خریدتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ لونڈی خریدیں اور خریدیں بھی تو گھر کیسے لے جائیں؟ یہ تو رات کی سیاہی میں منہ چھپا کر ریڈ لائٹ ایریا میں داخل ہوتے اور پھر بالا خانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی شرافت اُتار پھینکتے۔ اپنی پسند کی عورت کے ساتھ خواہشات پوری کرتے مگر کسی عورت کو یہ اختیار نہ تھا کہ اپنی پسند کا شریف زادہ چنتی۔

جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، اس طرح ہر پیشہ ور عورت کے پیچھے ایک مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔

یہ مرد کبھی محبوب ہوتا ہے، کبھی شوہر، کبھی باپ، کبھی بھائی۔

ہم جیسے شریف اور خاندانی لوگ اس طرح کی عورتوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ ان سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ کبھی واسطہ پڑ جائے تو انہیں بے انتہا ذلیل کرتے ہیں مگر کبھی ان کی مجبوری جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ عورت ہمیشہ دو ہی چیزوں کی خواہش کرتی ہے عزت اور محبت۔ وہ کیا حالات ہوتے ہیں جو اسے ان دونوں چیزوں سے دور کر دیتے ہیں، یہ تو نیلم ہی بتائے گی۔

نیلم بھی اسی بالا خانے کی پیدائش تھی۔ وہ کس شریف زادے کی اولاد تھی یہ نہ تو اس کی ماں جانتی تھی، نہ وہ۔ اس کی ماں البتہ ایک شریف خاندان کا خون تھی۔ فلموں کی ہیروئن بننے کا جنون اسے چادر اور چار دیواری سے بھگا کر بالا خانے تک لے آیا تھا۔ اُسی بالا خانے میں اس نے نیلم کو جنم دیا تھا۔ بالا خانے کی مالکہ آنٹی فیروزہ نیلم کے پیدا ہونے پر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ نیلم تھی ہی اتنی خوبصورت۔

طوائف زادیوں کے اکثریت میں نام پتھروں پر رکھے جاتے ہیں، جیسے فیروزہ، نیلم، ہیرا، روبی، زمرد وغیرہ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ پتھر ہوتی ہیں۔ یہ بھی جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔ گھریلو عورتوں سے زیادہ حساس۔

بالا خانے اور باہر کی دنیا کے کچھ اصول جدا ہیں۔ جس طرح بکری، بھیڑ، بھینس کو مادہ بچے پیدا کرنے پر ان کے مالکان مہربان ہو کر ان کا بہت خیال رکھتے ہیں اسی طرح لڑکی پیدا کرنے پر طوائف زادیوں کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کی پیدائش سے نائیکاؤں کا بڑھاپا بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں۔ روزی روٹی کی فکر تو ہر کسی کو ہوتی ہے۔ یہ عورتیں گناہ گار سہی مگر منافق نہیں ہوتیں۔ جو کرتی ہیں کھلے

عام، ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہیں۔

نیلم کی بدقسمتی کہ وہ یہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی مگر اس کی سوچ اس ماحول سے بالکل جدا تھی۔

شاید شریف خون کا اثر تھا۔ وہ عزت کی زندگی جینا چاہتی تھی۔ اس کی اس باغیانہ سوچ کا علم یہاں کے مکینوں کو نہیں تھا۔

نیلم کی تربیت بہترین خطوط پر کی جا رہی تھی۔ اسے ناچنے گانے میں ماہر بنایا جا رہا تھا۔ مردوں کو لبھانے والی ادائیں سکھائی جا رہی تھیں۔ بات کرنے اٹھنے، بیٹھنے کے آداب سکھائے جا رہے تھے۔ نیلم خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی، ورنہ عام طور پر جہاں ذہانت ہوتی ہے، وہاں سے خوبصورتی بھاگ جاتی ہے اور جہاں خوبصورتی ہوتی ہے وہاں ذہانت غائب ہوتی ہے، مگر یہاں تو دونوں ہی چیزیں موجود تھیں۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب نیلم کو گاہکوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ گاہکوں میں ایک سے بڑھ کر ایک امیر آدمی تھا۔ نیلم کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ محفل اپنے عروج پر تھی۔ ناچ گانا، شراب و شباب یہاں سبھی کچھ تو تھا۔ امراء نیلم کی ایک ایک ادا کے عوض نائیکاؤں کی جیب نوٹوں سے بھر رہے تھے۔ نیلم کی ماں بھی اس کی اداؤں پر فدا ہوئی جا رہی تھی۔ نیلم تو مرد کا دوسرا روپ دیکھنا چاہتی تھی۔ باپ، بھائی، شوہر کا روپ جو عورت کو گھر عزت و تحفظ دیتے ہیں۔ وہ بالا خانے میں رہتے ہوئے مردوں کے صرف دو روپ سے واقفیت رکھتی تھی۔ ایک گاہک دوسرا دلال اور یہ دونوں ہی عزت کے لفظ سے ناواقف تھے۔

عورتوں کی اس منڈی میں نیلم اپنی خوبصورتی اور آواز کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہو گئی تھی۔ لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔ انہی سننے والوں میں ایک عدنان بھی تھا۔ وہ خاموشی سے گانا سنتا اور اٹھ کر چلا جاتا۔ نیلم کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی اور محبت نظر آتی تھی۔



نیلم کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا اور وہ خود بھی کچھ نہ بولتا تھا، نیلم کے دل میں ایک موہوم سی آس تھی کہ شاید عدنان ہی ہے جو اسے اِس دلدل سے نکالے۔ ورنہ نیلم کی ماں تو اس ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اگر اپنے گھر واپس بھی جاتی تو وہ اسے قبول نہ کرتے اسی لیے وہ اس بالا خانے کو اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے محفوظ ٹھکانہ سمجھتی تھی۔ نیلم اِس گندے ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ آج بھی اسے کوئی گندی نظر سے دیکھتا تو اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ وہ ابھی تک صرف ناچ گانے تک ہی محدود تھی۔ آنٹی فیروزہ اِس کے سلسلے میں کسی موٹی آسامی کے انتظار میں تھیں۔ نیلم وہ وقت آنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

جمعرات کے دن نیلم اپنی ساتھی لڑکی زمرد کے ساتھ قریبی مزار پر چراغ جلانے جاتی تھی۔ اس نے کسی طرح عدنان کو یہ پیغام کہلا بھیجا کہ وہ جمعرات کے دن انہیں سید صاحب کے مزار پر ملے۔

عدنان مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ عدنان اور نیلم میں ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ قول و قرار ہوئے۔ عدنان نے نیلم کو یقین دلایا کہ وہ اسے اس دلدل سے نکال لے جائے گا۔ ملاقات کے لیے پھر اگلی جمعرات کا دن منتخب ہوا۔

اگلی جمعرات کا دن پھر پیار بھری باتوں کے ساتھ نیلم کے یقین کو پختہ کر گیا۔ وہ اسے کسی کے ہتھے چڑھنے سے پہلے ہی اپنی دلہن بنا لے گا۔''

ادھر نیلم کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اِسی شہرت کو سن کر سیٹھ حیات احمد نیلم کی بولی لگانے پہنچ گیا۔ آنٹی فیروز سیٹھ کو دیکھ کر منجن کا اشتہار بن گئیں۔ وہ اس شہر کا امیر ترین آدمی تھا، جوان بیٹیوں اور بیٹوں کا باپ ہونے کے باوجود بڑا رنگین مزاج تھا۔

نیلم کو سجا بنا کے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہ نیلم کا حسن دیکھ کر اس کا دیوانہ ہو گیا۔ آنٹی فیروزہ کو بڑی رقم ادا کر کے وہ نیلم کو اپنے گیسٹ ہاؤس لے گیا۔

نیلم کو اتنا موقع ہی نہ ملا کہ عدنان کو آگاہ کرتی یا یہاں سے بھاگنے کی کوئی تدبیر کرتی۔

نیلم سیٹھ حیات کے ساتھ پورے پندرہ دن گزار کر واپس آئی۔ آنٹی فیروزہ اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھی۔

نیلم خاموش ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن زندہ لاش بنی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ نہ ماں سے کچھ بات کرتی نہ ساتھی لڑکیوں سے۔ اِدھر عدنان جمعرات کو اس کا انتظار کرتا رہا اِدھر نیلم لٹ جانے کا دُکھ بھولتی ہی نہ تھی حالانکہ وہ اپنے انجام سے باخبر تھی۔ ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا پھر اتنا رونا دھونا کیوں؟

یہ بات بہت دنوں سے اس کی ماں کہہ کہہ کر تھک گئی تھی۔ آنٹی فیروزہ نے بھی کہہ دیا تھا۔

''بس لڑکی سوگ ختم کر اور اپنے اصل کی طرف لوٹ آ۔'' نیلم خدا سے گڑگڑا کر دعا کرتی۔

''اے رب رحیم! اگر تو اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے تو مجھے اس گندگی سے نکال۔ بے شک تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ اپنے محبوب ﷺ کے صدقے مجھ پر رحم کر مولا۔ جب کوئی خدا سے اس کے محبوب ﷺ کے صدقے سے مانگے اور وہ نہ سنے ایسا ممکن نہیں۔

عدنان کو کہیں سے خبر مل گئی کہ نیلم واپس آ گئی ہے۔ وہ فوراً بالا خانے پہنچ گیا۔ ملاقات تو نہ ہو سکی مگر عدنان نے زمرد کے ہاتھ نیلم کو پیغام پہنچا دیا کہ وہ جمعرات کو سید صاحب کے مزار پر اس سے ملے۔

نیلم کو یقین ہی نہ آیا کہ عدنان اب بھی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ عدنان سے ملے یا نہ ملے۔ وہ اب عدنان کے قابل نہ رہی تھی۔ کئی دن دل و دماغ کی جنگ رہی آخر کار دل یہ جنگ جیت گیا۔

☆......☆......☆

وہ جمعرات کو مزار پر حاضری دینے کو راضی ہو گئی۔ مگر اسے مزار پر چراغ نہ جلانا تھا۔ اس کی عزت کا چراغ تو گل ہو چکا تھا۔ اب چراغ جلا کر کیا منت مانگتی۔

جمعرات کو وہ مزار پر پہنچ گئی۔ عدنان موجود تھا۔ وہ رونے لگی۔

''عدنان میں اب تمہارے قابل نہیں رہی۔ میرا جسم گندگی میں لت پت ہو گیا۔''

عدنان نے اسے اچھی طرح رونے دیا تا کہ دل کا درد آنسوؤں کے ذریعے بہہ نکلے۔ جب وہ روتے

روتے تھک گئی تو عدنان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"نیلم جسم کی گندگی کو دھویا جا سکتا ہے مگر روح کی گندگی کو نہیں۔ تمہاری روح پاکیزہ ہے۔ میں تمہیں اپنانے کو تیار ہوں۔" نیلم نے بے یقینی سے عدنان کی طرف دیکھا۔
"عدنان ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ بڑی خاردار راہ کا انتخاب کر رہے ہو۔ پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔"
"نیلم محبت میں نفع نقصان کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جس میں نقصان ہو اور نفع ہو وہ کاروبار ہوتا ہے، محبت نہیں۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔"
نیلم یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی عدنان اسے لے کر اپنی منہ بولی بہن نرگس کے گھر گیا۔
"نرگس باجی نیلم آپ کے پاس میری امانت ہے۔ اسے کل صبح تک رکھ لیں۔ میں صبح ہی اسے لے جاؤں گا۔" عدنان نے نیلم کو کہا۔
"میں صبح تک نکاح کا انتظام کرتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔"

☆......☆......☆

اِدھر جب نیلم مزار سے بالا خانے نہ پہنچی تو فیروزہ آنٹی نے اپنے کارندے مزار پر دوڑائے مگر وہ کہیں نہ ملی۔ زمرد سے بھی پوچھ گچھ کی گئی مگر اس نے بھی نیلم کا ساتھ دیتے ہوئے اپنا منہ نہ کھولا۔ ماں سے نیلم نے کبھی دل کا راز نہ کہا تھا اس لیے وہ بھی کچھ نہ جانتی تھی۔ آنٹی فیروزہ کو نیلم پر پورا اعتماد تھا۔ اس کا چکر تو کسی سے نہیں تھا شاید کسی نے اغواء کر لیا ہے۔
آنٹی فیروزہ بڑی مطمئن تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عزت دار معاشرے میں اس جیسی عورتوں کی کوئی جگہ نہیں۔ ایک نہ ایک دن نیلم نے واپس یہیں آنا ہے۔

☆......☆......☆

عدنان نے اگلی صبح اپنے دوست کے گھر نیلم سے نکاح کر لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نیلم کو گھر کس طرح لے جایا جائے۔ ابا کو تو عدنان کسی طرح منا لیتا مگر اماں زبان کی بڑی کڑوی تھیں۔ انہیں رام کرنا آسان نہ تھا۔ بہرحال آج کل یا پرسوں نیلم کو گھر تو لے کر جانا ہی تھا کیوں نہ یہ ہمت آج ہی کر لی جائے۔" عدنان نے سوچا۔ پہلے خود جا کر اماں سے بات کرے پھر نیلم کو لے کر جائے اگر اماں نے منع کر دیا تو پھر بھی نیلم کو گھر نہ لے جا سکوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ ساتھ ہی چلے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
عدنان اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ نیلم بولی۔
"عدنان گھر چلیں۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اماں سے سامنا ہوا۔
"اے یہ کس لونڈیا کو اٹھا لایا۔"
"اماں یہ میری بیوی نیلم ہے۔ میں نے آج ہی اس سے نکاح کیا ہے۔" پھر تو بھونچال آ گیا۔ اماں نے رو رو کر اپنا سینہ پیٹ لیا۔
"ہائے ہائے یہ بے حیائی کا وقت آ گیا ہے۔ نجانے کس خاندان کی لونڈیا میرے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ یہ میری بیوی ہے، ارے کیسی بیوی، کہاں کی بیوی، نہ کوئی نکاح میں شریک ہوا، نہ کوئی رشتہ لے کر گیا۔ اماں باوا اب پرائے ہو گئے۔ پال پوس کے اس وقت کے لیے جوان کیا تھا۔ یا میرے اللہ! کیسی اندھیر نگری ہے۔ آج یہ جوان ہو کے اپنی مرضی کے ہو گئے، اے لڑکی!" اماں غرائیں۔
"چل بھئی اپنے گھر واپس جا۔ ہم نہیں مانتے اس شادی کو۔" یہ سننا تھا کہ عدنان اماں کے پیر پڑ گیا۔
"اماں معاف کر دیں۔ اسے گھر سے نہ نکالیں۔ اس کے گھر والے مجھے بھی مار ڈالیں گے اور اسے بھی۔"
"ارے بھیا کیا ڈاکوؤں کی لونڈیا بیاہ لایا جو کاٹ مار کر دیں گے۔" اماں اب کچھ نرم پڑ گئیں۔ اماں کے نرم پڑتے ہی عدنان نے اماں کی منتیں کرنی شروع کر دیں، ابا بھی تماشا دیکھ رہے تھے۔ اماں کے آگے اُن کی ایک نہ چلتی تھی۔ اماں کو نرم پڑتا دیکھ کر ابا بھی میدان میں اُتر آئے۔
"چل نیک بخت معاف کر دے، بچوں سے تو غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ دیکھ تو بیٹا کیسی حور جیسی بہو بیاہ کے لایا ہے۔ تو خود بھی ایسی حسین بہو نہ ڈھونڈ سکتی تھی۔" اماں نے نظر بھر کے نیلم کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ اب بڑی بی کی سمجھ میں آیا کہ لونڈا کیوں اس لڑکی کے لیے زمانے کی ٹکر لینے کو تیار ہو گیا۔ خوبصورتی اور معصومیت نیلم کے چہرے سے عیاں تھی۔
بڑی بی نے عدنان کا کمرہ صاف کر کے بہو کے حوالے کر دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ بی بی بنا جہیز لیے آ گئی

ہو۔اب میرے لونڈے کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''
عدنان کا ایک بھائی فرحان بھی تھا جو اس وقت نجانے کہاں آوارہ گردی کو گیا ہوا تھا۔وہ کالج میں پڑھتا تھا یا پھر آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔
اس کے آنے پر اسے بھی خبر دے دی گئی۔وہ بھی بنا دستک بھابی کو دیکھنے گھستا چلا آیا۔نیلم سنبھل کے بیٹھ گئی۔ فرحان نے نیلم کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔
''بڑے بھائی یہ پری کہاں سے اُٹھا لائے۔'' عدنان بھائی کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔نیلم اپنی تعریف سن کر اور سمٹ گئی۔ پتا نہیں کیوں نیلم کو فرحان کچھ پسند نہ آیا۔نیلم ایسی جگہ سے آئی تھی جہاں وہ مردوں کی نظروں کا مفہوم بخوبی سمجھ سکتی تھی۔فرحان کا بازاری لہجہ نیلم کو کھٹک گیا مگر اگلے ہی پل اس نے اس سوچ کو جھٹک دیا اور بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دی۔
☆......☆......☆
نیلم نے عدنان کی اماں کو ملکہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا اور خود ملازمہ بن گئی۔مگر پھر بھی بڑی بی کوئی وار خالی نہ جانے دیتیں۔دن میں کئی بار ایسے ایسے طنز کے تیر چھوڑتیں کہ خدا کی پناہ۔عدنان کام سے واپس آ کر اماں کے پاس بیٹھتا اور جو بھی غلطی سے بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا تو اماں کی صلواتیں شروع ہو جاتیں۔
''اماں کو بھول گئے جاؤ جا کے پہلے بیوی کے مزار پر حاضری لگا لو۔وہی تو تمہیں بخشوائے گی۔اس کے قدموں تلے تو جنت ہے۔جورو کا غلام! خدا جانے کیا الو کی لکڑی گھمائی ہے کہ اماں نظر نہیں آتیں۔''
یہی سب سنتے سنتے آٹھ سال بیت گئے عدنان اور نیلم کی دو بیٹیاں بھی ہو گئیں۔بڑی سات سال کی گڑیا، چھوٹی چار سال کی منی۔اماں کو بیٹیاں پیدا ہونے پر بھی اعتراض تھا تبھی نیلم سوچتی وہ جس دنیا کی باسی تھی۔وہاں تو لڑکیاں پیدا کرنے پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔مگر عزت دار گھرانے میں نسل بڑھانے کے لیے بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔
عدنان کے ابا تو گھر کے معاملات سے بے فکر تھے جبکہ فرحان وہی اپنی پرانی ڈگر پر تھا۔نیلم اس گھر میں بڑا سنبھل کے رہ رہی تھی۔باہر کہیں آتی جاتی نہ تھی۔اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ کر پہچان نہ لے۔اور یہ عزت دار زندگی اس سے چھن نہ جائے۔

جس بات کا زیادہ خوف ہو وہ ہو کر رہتی ہے۔گھر میں کوئی نہ تھا دروازے پر دستک ہوئی ایک مرتبہ دو مرتبہ بالآخر نیلم کو دروازے پر جانا ہی پڑا۔
نیلم نے کون ہے کی آواز دیتے ہوئے دروازہ کھولا۔کوئی ادھیڑ عمر مرد تھا مگر چہرہ کچھ شناسا سا تھا۔مرد نے نیلم کو غور سے دیکھا نیلم گڑبڑا گئی۔
''جی کہیے کس سے ملنا ہے۔'' اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔مرد بولا۔
''ملنا تو سلیم احمد سے ہے مگر یہاں تو پرانی جان پہچان نظر آ گئی۔'' سلیم احمد عدنان کے ابا کا نام تھا۔نیلم کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کہا۔
''ابا گھر پر نہیں ہیں۔''
ابا کے ملعون دوست نے انہیں ڈھونڈ کر راز فاش کر دیا۔
''ابے یار سلیم احمد! ہمیں تمہارے گھر میں کوٹھے کا ہیرا نظر آیا۔نو دس سال پہلے تک تو وہ کوٹھے کی زینت تھی اب تمہارے گھر میں ہے۔کیا بھلا سا نام تھا نیلم ہاں نیلم! فیروزہ کا تراشا ہوا ہیرا۔کیا حسن، کیا آواز۔'' سلیم احمد کی آنکھیں فرعونیت سے چمک اٹھیں۔
''یار نیلم تو عدنان کی بیوی ہے۔اب سمجھ آیا کمبخت کوٹھے سے بھگا کر لایا ہے۔جبھی کہوں لڑکی ڈری سہمی رہتی ہے۔باہر بھی نہیں جاتی اور تو اور عدنان کی اماں کی تمام کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے سہہ جاتی ہے۔''
سلیم احمد بھاگے دوڑے گھر گئے۔گھر میں گھسے تو بیگم سر سے برقع اُتار رہی تھیں۔
''ارے تم کہاں مٹرگشت پر گئی تھیں۔''
''آئے ہائے زبان سنبھالو سلیم احمد۔نہ کام نہ دھندا سارا دن مٹرگشت تو تم کرتے ہو۔میں تو گڑیا اور منی کو لے کر اپنی بہن کی طرف گئی تھی اور یہ تم کیوں میرے لیے اُتاؤلے ہو رہے ہو۔''
''بات ہی ایسی ہے نیک بخت، سنو گی تو پیروں تلے زمین نکل جائے گی۔''
''ارے بیان بھی کر دو۔کیوں کٹنیوں کی طرح مرچ مسالا لگا رہے ہو۔''
سلیم احمد کی بات سُن کے تو بڑی بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''ہائے تیرا بیڑہ غرق ہو عدنان! کیا گندگی کی پوٹ لا کر ہمارے سر پر بٹھادی۔''

اِدھر باورچی خانے میں کام کرتی نیلم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اب تو اماں مجھے اس گھر میں نہ رہنے دیں گی۔کچھ بھی ہو میں یہ گھر چھوڑ کے نہ جاؤں گی۔اب تو میرے ساتھ دو جی اور بھی ہیں۔جو ہوگا دیکھا جائے گا۔نیلم یہ سب سوچتی ہوئی اپنے دل کو تسلی دینے لگی۔

اِسی کِٹ کِٹ میں صبح سے شام ہوگئی۔گھر کا ماحول بہت کشیدہ تھا۔اماں کا پارہ کسی طور نیچے نہ آتا تھا۔عدنان کے گھر میں داخل ہوتے ہی پھر سے جنگ وجدل کا سماں ہوگیا۔

''عدنان تجھے اور کوئی لونڈیا نہیں ملی جو اس حرافہ کو کوٹھے سے اٹھا لایا۔'' عدنان ساری کہانی سمجھ گیا۔اماں بہت دیر تک نیلم کو مختلف القابات سے نوازتی رہیں اور عدنان فرمانبردار بیٹے کی طرح سب سنتا رہا۔فرحان بھی موجود تھا۔ابا بھی آگ لگا کر مزے لے رہے تھے۔اماں اچانک اٹھیں اور نیلم کو ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئیں۔

''اٹھا اپنی دونوں لڑکیوں کو اور دفع ہو جا یہاں سے۔یہ شریف لوگوں کا گھر ہے۔یہاں بازاری عورت نہیں رہ سکتی۔'' عدنان طیش میں اٹھا نیلم کا ہاتھ اماں سے چھڑوایا۔

''بس کرو اماں! اب یہ میرے گھر کی عزت ہے۔میری بچیوں کی ماں ہے۔یہ اس گھر سے نہیں جائے گی۔کون کس خاندان کا ہے اور کون بازاری ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔میرا منہ مت کھلوائیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ بھول جاؤں کہ آپ میری ماں ہیں۔'' اماں تو جھٹکے سے خاموش ہوگئیں ایسے جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کر دیا ہو۔

بڑی بی بھی کسی معزز خاندان سے نہ تھیں، جیسے نیم حکیم ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی نیم شریف تھیں۔ابا بھی جوئے، شراب، عورت، ہر طرح کا شوق رکھتے تھے۔رہ گیا فرحان تو وہ بھی اسی قماش کا تھا۔ایک عدنان ہی کماؤ پوت تھا، گھر کی ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی۔گھر کے ماحول میں تناؤ سا آ گیا۔اماں نے نیلم سے بات کرنی چھوڑ دی۔بچیاں بھی سہمی سہمی رہنے لگیں۔البتہ ابا اور فرحان نے شرافت کا لبادہ اُتار پھینکا تھا۔

ابا نیلم کے ساتھ بڑی اوچھی حرکتوں پر اُتر آئے تھے۔عدنان کی غیر موجودگی میں ابا، کبھی فرحان نیلم سے نازیبا باتیں اور حرکتیں کرتے۔نیلم ان سے بچنے کی ہر ممکن کوششیں کرتی۔

ایسی حرکتوں پر نیلم ابا اور کوٹھے کے دلال کا موازنہ کرتی تو اسے ہر حال میں دلال بہتر نظر آتا۔تنگ آ کر اس نے عدنان سے ابا اور فرحان کی شکایت کردی۔عدنان نے الٹا اسی کو پیٹ ڈالا۔

''جھوٹی اپنی گندی حرکتوں پر اتر آئی نا۔اس سے پہلے تو کبھی تُو نے میرے باپ اور بھائی کی شکایت نہ کی۔اب جبکہ وہ تیری اصلیت جان گئے ہیں۔مجھے ان سے بدظن کر رہی ہے۔'' عدنان کے منہ میں اماں کی زبان تھی۔نیلم روتی رہی شوہر کو کیا بتاتی ابا اور فرحان اس کا ماضی جان کر ہی اتنی ہمت کر پائے ہیں۔اماں نجانے کس بات پر نیلم کو بے بھاؤ کی سنا رہی تھیں۔گڑیا نے کہا۔

''دادی امی کو کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔''

بڑی بی گڑیا پر چڑھ دوڑیں۔

''حرافہ! ماں کی حمایت لیتی ہے۔غضب خدا کا، گز بھر کی چھوکری ہمیں سبق دے رہی ہے۔ارے عدنان اللہ تجھے جہنم واصل کرے۔موری کی اینٹ چوبارے میں سجادی۔'' اماں کو دراصل غصہ اپنے شوہر پر تھا۔وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کا ادھیڑ عمر شوہر ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔فرحان الگ نیلم کے گرد بھونرے کی طرح چکر لگانے لگا تھا۔ابا نے تو حد ہی کردی تھی۔وہ یہ بھول گئے تھے کہ بہو بھی بیٹی ہی ہوتی ہے۔آج کل تو ان کی حرکتیں بہت ہی بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔نیلم کہاں تک ان کو روک سکتی تھی اور ابا اور فرحان قابو ہی نہ آتے تھے۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی نیلم کا ہر رشتے سے اعتبار اُٹھ گیا۔شرافت کی خواہش اسے بہت مہنگی پڑی۔ابا کی حرکتیں نیلم تک ہی محدود رہتی تو ٹھیک تھا مگر گڑیا......

منٹو نے کہا تھا کہ میں اس ننگی سوسائٹی کو چولی پہنانے کی کوشش نہیں کرتا، نیلم نے بھی اس ننگے معاشرے کو ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدم بڑھاتی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

اس کے قدم کوٹھے کی طرف اُٹھ رہے تھے کیونکہ اس کے لیے اب کوٹھے اور گھر میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔

☆☆......☆☆

تیسرا شعلہ

پگلی



راشد لطیف

صبرے والا سے ایک معصوم دوشیزہ کی پامالی کی داستان

''رانو کی ماں رانو نظر نہیں آ رہی کہاں ہے؟''

''کہیں باہر گئی ہوگی آ جائے گی۔''

ارے اُسے اکیلے باہر نہ جانے دیا کر۔ اب وہ بڑی ہوگئی ہے اور تجھے تو پتا ہے زمانہ بہت ظالم ہے۔ وہ پگلی اس ظالم زمانے سے ناواقف ہے اور مجھے بہت پریشانی رہتی ہے۔ وہ ٹھہری پگلی اور اس کا دماغ بھی ٹھیک طرح کام نہیں کرتا، اس لیے مجھے اس کی بہت فکر رہتی ہے۔ اللہ نہ کرے اس کو کچھ ہو جائے تو......''

اتنی دیر میں رانو بھی آ گئی۔

''رانو بیٹے کہاں چلی گئی تھی۔ تمہارے ابو بہت پریشان ہو رہے تھے۔'' ماں بولی۔

''آج میں اکیلے بہت گھومی اور بہت مزہ آیا۔'' رانو نے مزے سے بتایا۔

پگلی تیرا دماغ ٹھیک طرح کام نہیں کرتا اکیلے باہر مت جایا کر۔'' ماں نے فوراً اُسے ٹوکا۔

''امی! امی! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ خوامخواہ مجھے ایسے ڈانٹتی رہتی ہیں۔ اب میں بچی تھوڑا ہی ہوں۔ جو گم ہو جاؤں گی۔ دیکھو ابو آج پھر مجھے امی نے ڈانٹا ہے۔ اللہ کرے میں مر ہی جاؤں۔'' وہ ناک اور آنکھ رگڑتی بولی تھی۔

''نہیں نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ میری عمر بھی اللہ کرے میری گڑیا کو لگ جائے۔''

''پھر ابو ای کو روکیں مجھے نہ ڈانٹا کریں۔''

''ٹھیک ہے تم بھی اکیلے باہر مت جایا کرو دھی رانی۔''

ابو مجھے یہ بتائیں کہ آپ میری شادی کب کرو گے۔'' رانو نے بے ساختہ کہا تھا۔

''بیٹا ایسی باتیں خوبصورت گڑیا کے منہ سے اچھی نہیں لگتی ہیں۔''

''ہماری بیٹی کتنی بھولی ہے۔ میرے مولا اس کے نصیب اچھے کرنا۔ یا اللہ میری خوبصورت گڑیا کو اس ظالم سماج سے بچانا۔ یا اللہ میری پگلی گڑیا کو ہمیشہ بری نظر سے بچانا۔ یا اللہ میری بھولی بھالی بیٹی ہمیشہ مسکراتی رہے۔''

''رانو کے ابو مجھے تو ہمیشہ ہماری اس پگلی بیٹی کی فکر رہتی ہے۔ اس کا کیا بنے گا۔''

''تم فکر نہ کرو جو ہوگا اچھا ہوگا۔ مجھے اللہ تعالیٰ پر یقین ہے وہ کریم ذات ہے۔ کرم کرے گا۔ اچھا بیٹے تم اندر جاؤ تھک گئی ہوگی۔ اور ہاں اب تم اکیلے باہر نہ جانا۔''

''ٹھیک ہے ابو اور ہاں ابو، ابو مجھے نہ ڈھیر سارے کھلونے لا کر دو۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں کل اپنی بیٹی کے لیے بہت

سارے کھلونے لے کر آؤں گا۔"

رانو ماں باپ کے کہنے سے کب رکتی تھی۔ وہ معمول کی طرح صبح گھر سے نکل جاتی تھی۔ رانو کا دماغ تھوڑا کمزور تھا۔ اونچی اٹھان والی اس الہڑ دوشیزہ کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس عمر کو پہنچ کر بھی دماغی طور پر بچہ ہی ہے۔

کافی دیر تک وہ گھر سے باہر رہتی تھی۔ کبھی ہمسائیوں کے گھر اور کبھی کھیتوں میں۔ اُسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کون سی جگہ اُس کے لیے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب۔

وہ پگلی زمانے کے شکاریوں سے بھی ابھی تک ناواقف تھی اور دن یوں ہی گزرتے رہے صرف اس کے ماں باپ کو اس کی فکر تھی۔

گاؤں کی عورتیں اُس کی معصومیت کا خوب فائدہ اٹھاتی تھیں۔ اُس کے ساتھ دو چار پیار بھری باتیں کر کے عورتیں اپنے گھر کا سارا کام اُس سے کراتی تھیں اور اس کی عادت تھی وہ ہنستے مسکراتے سب کی جی حضوری کرتی رہتی۔

وہ پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ سبھی لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی سبھی دل کے صاف ہوتے ہیں۔ اسے نہیں پتا تھا کہ کوئی درندہ بھی اُس کی معصوم اور الہڑ جوانی پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔

☆...☆...☆

فخرو گاؤں کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بیوی سترہ سالہ رفاقت کے بعد داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اُس کے بیٹا شاکر اور سعید تھے۔

فخرو کی بیوی مائی سرمئی ایک نہایت نیک خصلت عورت تھی اور رانو سے بھی بہت پیار کرتی تھی۔ رانو اکثر اس کے گھر میں آتی جاتی تھی اور فخرو بھی اُسے بہت پیار کرتا تھا۔ اور اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی جانتا تھا۔

سرمئی کے دنیا سے چلے جانے کا رانو کو بہت دکھ تھا۔ اب بھی رانو اکثر فخرو کے گھر جاتی تھی۔ اب گھر میں اکیلے مرد ہی ہوتے تھے۔ فخرو نے شروع میں رانو کو گھر آنے سے منع کیا مگر پھر اچانک سے اس کے دل میں کھوٹ آ گیا۔

ایک دن رانو جب اُس کے گھر آئی تو وہ بولا۔

"رانو مجھے تیری ماسی سرمئی یاد آ رہی ہے۔" رانو



معصومیت سے بولی۔
''کاش میں ماسی کو لے کر آ سکتی۔'' فخرو اُس کے جسم کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا بولا۔
''پگلی! وہ کیسے آ سکتی ہے۔''
''اللہ کرے اللہ میاں مجھے ماسی سرمئی بنا دے۔''
اُس پگلی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔
''رانو! تیری دعا خدا نے سُن لی ہے۔ دیکھ تُو اب سرمئی بن گئی ہے۔'' رانو فخرو کی بات سُن کر بہت خوش ہوئی۔
''سچ میں! اب تو تُو خوش ہے نا۔'' فخرو کی طرف مطمئن نظروں سے خوش ہوتی وہ بولی۔
''ہاں ہاں! میں بہت خوش ہوں۔ چل سرمئی اب ہم اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔'' فخرو اُس ہنستی مسکراتی لڑکی کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔
''مجھے بہت نیند آ رہی ہے...... آ جا تُو بھی سو جا۔''
رانو فخرو کو خوش دیکھنے کے چکر میں اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔ فخرو گھاگ آدمی تھا۔ اُس نے رانو کی معصومیت کا فائدہ اُٹھا کر اُس کی عزت کا موتی گندا کر دیا اور رانو کو پتا بھی نہ چلا کہ اُس کے ساتھ کیا سانحہ گزر گیا۔
جب رانو گھر جانے لگی تو فخرو نے ماسی سرمئی کا واسطہ دے کر اُسے کہا کہ دیکھ رانو! اگر تُو نے کسی کو کچھ بتایا تو تیری ماسی کو رب سوہنا آگ میں جلا دے گا۔'' یہ سُن کر رانو رونے لگی۔
''نہیں نہیں...... میرے منہ سے ایک لفظ بھی نکلے گا۔ میری ماسی جل جائے گی اگر میں نے کہا۔'' اور پھر یہ شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔

☆......☆......☆

کچھ ماہ بعد ایسا ہی ہوا جب رانو کسی ہمسائیوں کے گھر گئی۔ اُس گھر کی سبھی عورتوں نے رانو سے کہا رانو تم اتنی موٹی ہو رہی ہو۔ رانو اُن عورتوں کی بات سُن کر آگے سے ہنسنا شروع ہو گئی۔
اِس کھیل کا نتیجہ بہت جلد سامنے آ گیا اور رانو کو پتا بھی نہ چلا اور وہ حاملہ ہو گئی۔
اچانک بیٹھے بیٹھے کسی وجہ کے بغیر رانو کو قے اور متلی نے اس کی ماں کو اندیشوں کے جال میں قید کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی وہ اُسے لے کر ایک قریبی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

ڈاکٹر نے رانو کے حاملہ ہونے کی تصدیق کر دی۔
رانو کی ماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ کس کے پاس جاتی اپنی فریاد لے کر۔ وہ کس سے اپنا روگ بیان کرتی۔ وہ تو ایک مجبور و بے کس ماں تھی جو اپنی اکلوتی بیٹی کو بھیڑیوں کے چنگل سے نہ بچا سکی تھی۔
وہ بے چاری بھیڑیے کہاں تلاشتی۔
''کیا گاؤں کے لوگ رانو کے لیے پرائے تھے؟''
''کیا گاؤں والے اُس اللہ لوک پگلی کو نہیں جانتے تھے؟''
''کیا اپنے گھر میں بھی کبھی کوئی سوچ سکتا ہے کہ نقب لگانے والا بھی کوئی ہو سکتا ہے؟''
بس دکھوں کی ماری اپنی بیٹی کا وجود اور اس کے اندر ایک ناجائز کا بوجھ لیے مرے مرے قدموں سے گھر کی جانب چل دی تھی۔
اُس کا دل تو بہت چاہا کہ چٹکی بھر زہر پھانک کر چٹ پٹ ہو جائے مگر...... ابھی غم کی فصل کاٹنی تھی۔

☆......☆......☆

رانو کی ماں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح رانو کی اس بوجھ سے جان چھڑا دی جائے لیکن...... وقت نے اپنی پرواز بہت تیز کر دی تھی۔ رانو کے ابارشن میں اُس کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ ڈاکٹروں کی معذرت کے بعد اب کوئی راستہ نہ تھا کہ رانو کو کس طرح بھی اس سماج کے آگے بے قصور ثابت کیا جائے۔

☆......☆......☆

وہ دن بھی آ گیا تھا جس دن رانو کی ڈیلیوری ہونی تھی۔ رانو کے گھر والے رانو کو اسپتال لے گئے۔ اور رانو نے ایک چاند سی بیٹی کو جنم دیا۔ جو بے حد خوبصورت تھی۔
رات کے اندھیرے میں رانو کو اس کے گھر والے واپس گھر لے کر آ رہے تھے۔ وہ بہت غم زدہ تھے اور اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کریں۔ جانے کس طرح شیطان نے آن کی آن میں اُن پر اپنا طلسم پھونک دیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ رانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اس ناجائز بچی کو ختم کر دیا جائے۔
رانو پگلی کو تو کچھ بھی پتا نہ چل سکا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا انہونی ہونے والی ہے۔ رانو کے باپ نے رانو کی بچی کو پولی والی نہر میں پھینک دیا اور اس قتل پر

انسانیت بھی کانپ اٹھی۔
بھلا اُس ننھی پری کا اس سب معاملے میں کیا قصور تھا۔جس نے آنکھ ہی ابھی ابھی کھولی تھی۔
رانو کے گھر والوں نے دنیا کی باتوں سے ڈر کر رانو کی بچی کو زندہ مار دیا۔ پر اُن کو اُس ذات کا کوئی ڈر نہیں جس سے ہر انسان کو ڈرنا چاہیے۔رانو گھر آتے ہی بیمار ہوگئی تھی۔ کچھ دن بیمار رہی اور ٹھیک ہوگئی۔

☆......☆☆

یہ خبر جب رانو کے ماموں تک پہنچی تو رانو کے ماموں نے بہت غصہ کیا۔ اور رانو کے گھر آ کر بہت خفا ہوا اور اپنی بہن سے بہت ناراض ہوا اور بولا۔
''اس لڑکی نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اور تم لوگوں نے اُسے اب تک زندہ چھوڑا ہوا ہے۔اسے تو اسپتال میں ہی مار دینا چاہیے تھا۔ اُس کو ابھی کے ابھی مار دو۔ ورنہ ہمارا تم سے رشتہ ناتا ختم۔''
اُن کو یہ پتا نہیں تھا کہ ایک ماموں دو ماؤں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ ظالم تو اُس درندے سے بھی زیادہ ظالم نکلے۔اس نے تو رانو کو درندگی کے بعد زندہ چھوڑ دیا تھا لیکن اُس وقت رانو کے ماموں کی سوچ میں صرف شیطان تھا۔جو اُن کو اُکسا رہا تھا۔
رانو کا ماموں رستم اس درندے کو ڈھونڈ نہ سکا تھا۔ جس نے رانو کے ساتھ یہ حرکت کی تھی۔رستم چاہتا تھا کہ اگر وہ درندہ مل جائے تو وہ رانو اور اُسے ایک ساتھ موت کے گھاٹ اُتار کر برادری میں اپنا شملہ اونچا کر سکے۔مگر اُسے جب ناکامی ہوئی تو اُس نے سب سے آسان حدف رانو کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنالیا۔
ظاہر سی بات ہے۔عزت سے بڑھ کر کوئی چیز تو نہیں ہوتی۔رہی بات انسانیت کی تو اگر انسان کو روزِ محشر یاد ہو تو دنیا میں بدی ختم ہو کر نیکی کا لبادہ نہ اوڑھ لے......
اِس وقت رستم بھی بہن کے کاندھے پر بندوق رکھ کر رانو کے ذریعے اپنی بہادری اور نام نہاد غیرت کا تاج اپنے سر پر سجانا چاہ رہا تھا۔

☆......☆☆

اگلے دن اتفاق سے کسی عزیز کے گھر شادی میں جانا تھا۔رانو کی طبیعت کے باعث اُس کی ماں نے جانے سے معذرت کرلی۔ رستم بہن کو ایک طرف لے گیا اور......
کچھ دیر بعد رانو کی ماں اور اس کا باپ رانو کو پیار کر کے گھر سے شادی پر چلے گئے۔رانو سب کے عزائم سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مگن سو رہی تھی۔
ساتھ والے گھر میں رانو کے رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ رانو کو کچھ پتا نہیں تھا کہ آج اُس کا آخری دن ہے۔اُس کے اپنے ہی اُس کو دار پر چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جسے بڑے پیار سے وہ ماموں ماموں کہتی تھی وہی اُس کا سب سے بڑا دشمن بن جائے گا۔رستم نے بے فکری سے سوتی رانو کا گلا دبانے کی کوشش کی۔اس افتاد پر رانو کی آنکھ کھل گئی۔اور رانو چیخ مار کر باہر کو بھاگی۔اور اپنے ماموں کے آگے منت سماجت کی لیکن اس ظالم کو اُس پر ترس نہ آیا۔ وہ ہاتھ جوڑتی رہی مگر کسی نے اُس کی فریاد نہ سنی اور آخر کار رانو کے ماموں نے رانو کو مار کر اپنی غیرت کو داد دی۔
اِس انہونی پر کسی کو ترس نہیں آیا مگر کچھ رشتے دار رانو کے ماں باپ سے ناراض ضرور ہوئے تھے کہ رانو کو کیوں قتل کیا گیا۔اس قتل کی تھوڑی بہت پولیس نے بھی کارروائی ضرور کی تھی۔ جو صرف رسمی تھی۔ جو آخر کار لے دے کر بات ختم کردی گئی تھی۔
آج تک رانو کو لوٹنے والے درندے کا کوئی پتا نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا؟ مگر رانو کے قتل کے بعد سے فخرد گاؤں سے غائب ہوگیا۔اُس پر کسی نے قطعاً کوئی شک و شبہ کا اظہار تک نہ کیا۔
سنا ہے کہ آج کل فخرو لاہور کے ایک پاگل خانے میں زنجیروں میں جکڑا دیکھا گیا ہے مگر......اب اُس کی اس سزا سے رانو کے ساتھ ہوئی ناانصافی سے پردہ کون اٹھا سکتا ہے۔بس لوگ یہی کہتے ہیں کہ بیچاری رانو کے ساتھ جانے کس نے یہ مکروہ کھیل کھیل کر اُس کی بے فکر مست زندگی کو زنگ لگا دیا اور اپنی خوشبو سے بے خبر وہ کلی بغیر کسی بہار کے آئے خزاں برد ہوگئی۔
آہ! وہ بے خبری میں ہی اپنا جیون ہار گئی۔
''ابو ابو! دیکھنا کسی دن امی ہی مجھے مار دے گی۔'' ماں نے تو اُسے نہ مارا مگر دو ماؤں کے برابر ایک ماما نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔اُس کی بات سچ ثابت ہوگئی تھی۔

☆☆......☆☆

توشۂ خاص، خوان ہفت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت ساماں، زہر کار، عبرت اثر حکایتیں

کراچی سے پہلی حکایت

صدقہ

آفرین انیس

واقعی خدا سے بڑا حافظ اور کوئی نہیں۔

بزرگوں سے سنتے آئے تھے کہ 'صدقہ' بلاؤں، آفتوں اور مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔ لیکن یقین تو اس وقت آیا جب ہم خود اس تجربے سے گزرے۔ اور پھر ہر چیز کا صدقہ دینا میرا معمول بن گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ......

اپنی مالی ضروریات کے پیشِ نظر مختلف جگہوں پر امتحانات کے دوران ممتحن کے فرائض سرانجام دیتی ہوں۔ یہ پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے میں ان دنوں حکومتِ پاکستان کے شروع کیے گئے نیشنل انٹرن شپ پروگرام کے تحت خاتونِ پاکستان گورنمنٹ ڈگری کالج میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ مجھے کسی جاننے والے نے بتایا کہ کراچی یونیورسٹی میں بی کام کے امتحانات ہونے والے ہیں۔ تم وہاں ڈیوٹی کرنا چاہو تو میں تمہارا نام لکھوا دیتا ہوں۔ میں نے بھی حامی بھر لی۔

میری رہائش اُن دنوں گلستان جوہر میں جوہر چورنگی پر تھی، جہاں سے یونیورسٹی جانے کے لیے کوئی ڈائریکٹ بس نہیں ہے بلکہ دو بسیں کر کے جانا پڑتا ہے۔ پھر بھی چونکہ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی لہٰذا میں نے حامی بھر لی۔

انہوں نے مجھے ایک پرچے پر اپنا نام اور مدعا لکھ کر کراچی یونیورسٹی کے جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ بھیجا اور کہا کہ وہاں جا کر آفس میں مل لو وہ تمہاری ڈیوٹی لگا دیں گے۔

خیر اللہ اللہ کر کے میں نے وہاں جا کر اپنا نام لکھوا دیا۔ ویسے میں اس سے پہلے بھی کئی جگہ ممتحن کے فرائض سرانجام دے چکی ہوں، لہٰذا مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ لیکن اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ڈیوٹی میرے لیے اس قدر دشوار ثابت ہوگی۔

میں پیسے بچانے کے چکر میں اکثر اپنے گھر سے ایک ہی بس کے ذریعے سفاری پارک تک آتی اور پھر وہاں سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے گیٹ سے ڈیپارٹمنٹ تک پیدل مارچ...... پھر اس کے بعد ڈیوٹی کے دوران مسلسل تین گھنٹے تک کھڑا رہنے کے علاوہ پچاس لڑکوں کی حاضری کے فرائض بھی ہماری ڈیوٹی میں شامل تھے۔ چونکہ کراچی یونیورسٹی میں صرف لڑکوں کا سینٹر پڑتا ہے لہٰذا ڈیوٹی کے دوران بھی اپنے آپ کو بہت الرٹ رکھنا پڑتا ہے۔ اس دوران بہت سے تجربات بھی ہوئے جن کی ایک الگ کہانی ہے۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ امتحانات ختم ہوئے اور میں نے اگلے سال یہاں ڈیوٹی نہ کرنے کا فیصلہ کیا، جس

پر ابھی تک قائم ہوں۔ اس جان توڑ محنت کے بعد مجھے اس کا معاوضہ تقریباً آٹھ مہینوں کے بعد ملا۔

ان دنوں میرے پاس ذاتی موبائل کی سہولت موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے مجھے کافی پریشانی بھی اٹھانی پڑتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یونیورسٹی سے ملنے والے معاوضے سے کوئی سستا سا موبائل خرید لوں گی۔ جس پر فوراً ہی عمل بھی ہو گیا۔ چونکہ پہلی دفعہ موبائل لیا تھا لہٰذا والدہ کے بے حد اصرار پر باقی بچی ہوئی رقم سے صدقہ دے دیا۔

ان دنوں موبائل چھینے جانے کے واقعات عام ہو چکے تھے۔ میرے اپنے بھائی کا موبائل دو دفعہ چھن چکا تھا۔ اس لیے ڈر بھی لگا رہتا تھا۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی اور میرے پاس بھی یہ جدید سہولت آ گئی۔

عملی تجربہ تو اس وقت ہوا جب میرا یہی موبائل میرے بیگ سے نکال لیا گیا۔ لیکن پھر اللہ نے ایسی حفاظت کی کہ نکالنے والے نے واپس بھی ڈال دیا اور یہی موبائل آج تک میرے پاس ہے' الحمدللہ!'

میں نے جیسا کہ پہلے بھی بتایا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی کافی جگہوں پر ممتحن کے فرائض انجام دیتی ہوں۔ ان میں سے ایک آغا خان بورڈ بھی ہے۔ آغا خان بورڈ مئی کے مہینے میں پورے پاکستان میں اپنے امتحان منعقد کرواتا ہے۔ یہ مئی 2011ء کا واقعہ ہے۔

آغا خان بورڈ کی جانب سے میری ڈیوٹی PIDC کے پاس ایک معروف اسکول میں لگائی گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی میں آغا خان بورڈ کے تحت کروائے گئے امتحانات میں ڈیوٹی انجام دے چکی تھی۔ لیکن اس سینٹر میں پہلی دفعہ دے رہی تھی۔

ہماری سپروائزر نے ہمیں پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ آپ لوگ موبائل نہ ہی لائیں تو اچھا ہے۔ ہم لوگوں نے یہ بات ہنس کر ٹال دی۔ اس کے علاوہ موبائل کی ضرورت بھی تھی کہ شہر کے حالات ویسے ہی اکثر خراب رہتے ہیں۔ لہٰذا جب پہلے دن ڈیوٹی کے لیے پہنچے تو سب کے پاس موبائل موجود تھے، جسے بورڈ والوں نے آف کروا دیا کیونکہ امتحانات کے دوران اس کی اجازت نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

جہاں ہمارا سینٹر تھا وہاں ایک بہت بڑا جمنازیم ہے جس میں تقریباً پانچ چھ سو طلبا ایک ساتھ امتحان دیتے ہیں۔ تمام خواتین کو کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے بیگ سامنے رکھ دیں۔ تاکہ آرام سے ڈیوٹی دے سکیں جس پر سب نے عمل کیا۔

امتحانات کے دوران یہ بات پتا چلی کہ صرف



چند ممتحن ہی پرانے ہیں جو یہاں ہر سال ڈیوٹی کرتے ہیں جبکہ باقی سارے نئے ہیں۔

میں چونکہ اس سینٹر پر پہلی دفعہ آئی تھی لہٰذا میں بھی ایک طرح سے نئی بھی اور پرانے ممتحن سے ناواقف۔ چند دن اسی طرح گزرے پھر وہاں میری ایک ممتحن عذرا سے جان پہچان ہوگئی۔ وہ بھی اس طرح کہ میری عادت ہے جہاں بھی ہوتی ہوں میں اپنی نماز نہیں چھوڑتی۔ عذرا اور میں باقاعدگی سے وقفے کے دوران نماز ادا کرتے تھے۔ اسی دوران ہمارے ساتھ ایک اور خاتون آ کر بیٹھنے لگیں جن سے پتا چلا کہ وہ دو تین سالوں سے یہاں آ رہی ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں کہنے لگیں کہ یہاں ہر سال کسی نہ کسی ممتحن کا موبائل چوری ہو جاتا ہے۔''

میری عادت ہے کہ میں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں اور زیادہ دوستیاں وغیرہ بھی نہیں کرتی۔ وہ خاتون پہلے بھی مجھے کچھ مشکوک سی لگی تھیں۔ ان کی زیادہ تر ہمارے بیگ پر نظر ہوتی تھی۔ نماز انہوں نے پڑھنی نہیں ہوتی تھی، پھر بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ بہرحال وہ ہماری ہر چیز پر نظر رکھتی تھیں۔

چونکہ ہماری سپروائزر امتحان شروع ہونے سے پہلے ہی ہمارے موبائل بند کروا دیتی تھیں اس لیے میں امتحان ختم ہوتے ہی اپنا موبائل کھول کر چیک کرتی کہ کوئی ضرور کال وغیرہ آئی ہوئی ہو تو پتا چل جائے۔

ایسے ہی ایک دن جب میں نے اپنا بیگ کھولا تو موبائل غائب...... میں نے اسی وقت شور کرنا شروع کر دیا کہ میرا موبائل چوری ہو گیا ہے، تو عذرا نے کہا کہ تم اپنا نمبر بتاؤ میں کال دیتی ہوں پتا چل جائے گا۔''

اس وقت میرے ذہن میں ہی یہ بات نہیں تھی کہ موبائل تو آف ہے۔ میں نے نمبر بتانا شروع کیا تو وہ خاتون جو زبردستی ہم سے دوستی گانٹھنا چاہ رہی تھیں، وہ میرے بیگ میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگیں کہ ادھر اندر کی طرف چیک کرو، یہیں ہوگا جبکہ میں اپنا موبائل بیگ میں بنے موبائل پاکٹ کے علاوہ کہیں نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال میں نے اندر چیک کیا تو فوراً مجھے موبائل مل گیا۔ مجھے لگا شاید مجھ سے ہی غلطی ہوگئی ہے اور موبائل ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ میری اتنی محنت کی کمائی تھی۔

☆......☆......☆

دو ہی دن گزرے تھے کہ میری دوست عذرا کا موبائل غائب...... ہر جگہ چیک کیا لیکن موبائل نہ ملنا تھا، نہ ملا...... بعد میں عذرا نے بتایا کہ انہوں نے امتحان کے فوراً بعد بیگ کھولنے کی کوشش کی تو ان خاتون نے جلدی مچا دی کہ چلو چلو! دیر ہو جائے گی بعد میں دیکھ لینا۔''

اتفاق سے اُس دن میں اکیلے ہی وضو کرنے چلی گئی تھی اور یہ بات میرے پیچھے ہوئی تھی۔ ہر جگہ اور ہر کسی کی چیکنگ کی گئی۔ آغا خان والوں کو بھی شکایت کی گئی لیکن ہاتھ سے گیا موبائل واپس نہیں آتا۔ بعد میں جب تمام واقعات پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ چور تو ہمارے درمیان ہی موجود تھا یعنی وہی خاتون......! پہلے تو شک تھا بعد میں یقین ہو گیا۔

عذرا نے آغا خان والوں کے سامنے اُن کا نام رکھ دیا اور کہا کہ جب ہر سال چوریاں ہو رہی ہیں تو یقیناً اُن میں سے ہی کوئی ہے جو مستقل ہر سال یہاں ڈیوٹی کر رہا ہے۔''

ان کے اصرار پر آغا خان والوں نے ان خاتون کو مزید ڈیوٹی پر آنے سے منع کر دیا۔

مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ اس دن اگر اللہ حفاظت نہ کرتا تو یقیناً میرا موبائل پہلا شکار بنتا۔ واقعی اللہ تعالیٰ کس طرح حفاظت کرتا ہے اور یقیناً وہ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ اس کا یقین تو مجھے اس تجربے کے بعد ہوا۔ اب میں کوئی بھی چیز خریدنے کے بعد اس کا صدقہ ضرور نکالتی ہوں۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد اپنی بڑائی بیان کرنا نہیں بلکہ قارئین کو صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ اپنی چیزوں اور اپنے بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے بشرطیکہ اس پر بھروسا کیا جائے اور اپنی چیزوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے تو۔

☆☆......☆☆

نیکی کرتا جا



شیخ معظم الٰہی

اولاد سے لاپروائی برتنے والوں کے لیے ایک عبرت انگیز حکایت

جو کہانی میں لکھنے جارہا ہوں وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے، میں ایک چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں۔ سارا دن کاروباری سلسلے میں مصروف رہتا ہوں اور شام کو تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہوں۔ اپنی ماں سے پیار لینے کے بعد میری ساری تھکان اور سستی دُور ہوجاتی ہے کیوں کہ میری ماں مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ میری ماں کے لب ہمیشہ میرے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میری ماں نے کبھی بھی والد صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میری ماں نے ہی مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہے۔

میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر چہل قدمی کرنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ میرا یہ روزانہ کا معمول ہے۔

ایک دفعہ رات کے وقت جب میں گہری نیند سورہا تھا اور موبائل فون میرے سرہانے کے پاس پڑا ہوا تھا۔ رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے موبائل پر دیکھا تو کوئی اجنبی لائن نمبر تھا۔ میں نے جب کال وصول کی اور السلام علیکم کہا تو دوسری طرف ایک بچی کی آواز سنائی دی جو گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی، میں



نے اس بچی سے پوچھا۔

''بیٹی رات کے ڈیڑھ بجے آپ کو میرے ساتھ کیا کام پڑ گیا کہ مجھے فون کیا؟ آپ کو میرے نمبر کا کیسے پتا چلا؟ آپ کون ہو؟''

بچی نے جواب دیا۔

''انکل! میں نے اندازے سے نمبر ملایا ہے۔ میرا نام شازیہ ہے اور میں چھٹی جماعت کی طالبہ ہوں، میں لاہور ہی میں رہتی ہوں، میرے آج کل امتحان ہو رہے ہیں اور امتحان کی تیاری کر رہی ہوں اور گھر میں اکیلی ہوں، میرے سب گھر والے ایک شادی کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں، چوں کہ میرے امتحان ہو رہے تھے اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ وہ سب صبح سات بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔ وہ گھر کو لاک کر کے گئے ہیں، میں نے اس وقت تو بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکیلے رہنے کی حامی بھر لی تھی مگر اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے اس بچی سے پوچھا کہ بیٹی آپ گھر میں اکیلی ہیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اس بچی نے جواب دیا کہ انکل میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ممی رات کو کھانا بنا گئی تھیں کہ مجھے جب بھوک لگے تو گرم کر کے کھا لوں۔ میں کھانا گرم کرنے لگی تو وہ جل گیا اور کھانے کے قابل نہ رہا۔ مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں، سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں، کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ آپ باہر سے میرے لیے کھانا لا دیں میں آپ کو اس کھانے کا بل دوں گی میرے پاس پیسے ہیں۔''

میں نے اس بچی سے کہا۔

''بیٹی میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کے لیے کھانا خرید لوں، مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔''

اس بچی نے اپنے گھر کا پتا بتایا جو میرے گھر سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں بستر سے اُٹھا اور اپنی ماں کو بتانے کے لیے ان کے کمرے میں گیا تو وہ گہری نیند سو رہی تھیں، میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور گھر سے باہر نکل کر اسے اسٹارٹ کیا اور قریبی بازار میں چلا گیا۔ جہاں ایک دو بیکری کی دکانیں کھلی تھیں، میں نے ایک بیکری سے اس بچی کے لیے دو برگر خریدے اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا، جہاں ایک خوب صورت دو منزلہ مکان تھا۔ میں نے فوراً اس بچی سے موبائل فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ بیٹی اپنا کھانا آ کر لے لو۔ اس بچی نے جواب دیا۔

''انکل میں نیچے آ کر دروازہ نہیں کھول سکتی کیوں کہ دروازہ لاک ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میں اوپر والی منزل سے ٹوکری لٹکا دیتی ہوں، آپ ٹوکری میں وہ کھانا رکھ دیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹوکری دوسری منزل سے لٹکتی ہوئی نظر آئی تو میں نے اس ٹوکری میں مطلوبہ کھانا رکھ دیا۔ پھر ٹوکری کو اس بچی نے اوپر کھینچ لیا۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک پیاری سی بچی دکھائی دی، ٹوکری کھینچنے کے بعد اس بچی نے فون کر کے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میرے ابو اس کھانے کا بل ادا کر دیں گے۔ میں نے بچی سے کہا کہ بیٹی مجھے کھانے کا بل نہیں چاہیے بس تم کھانا کھاؤ اور اپنے امتحان کی تیاری کر کے پھر سو جاؤ۔ صبح میں آپ کے ابو سے خود مل لوں گا۔ اسے خدا حافظ کہہ کر میں گھر آ گیا۔

دوسری صبح میں اپنے کام پر چلا گیا اور شام میں آتے ہوئے اس مکان کی طرف گیا اور دروازے کی گھنٹی بجائی تو تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی باہر آیا تھا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے ان صاحب سے کل کا ماجرا بیان کیا، ساری کہانی سننے کے بعد ان صاحب نے مجھے اندر بلا لیا اور مدد کرنے کا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کھانے کا بل پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ مجھے بل کی ضرورت نہیں، بس میں آپ سے یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ آپ اس معصوم بچی کو اکیلا چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا، آپ کو چاہیے تھا کہ کوئی بڑا اس کے پاس چھوڑ کر جاتے تاکہ اس بچی کو کھانا گرم کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔ بچی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو، آگ لگنے کی صورت میں گھر کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ میری جگہ کوئی غلط قسم کا انسان اسے مل جاتا تو وہ بچی کی معصومیت سے فائدہ بھی اُٹھا سکتا تھا۔

میری باتیں سن کر وہ آدمی کچھ پریشان سا ہوا اور کہا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آئندہ ہم اس بات کا خاص خیال رکھیں گے، اور کوشش کریں گے کہ کسی بھی بچے کو اکیلا گھر چھوڑتے وقت کسی بڑے کو گھر پہ چھوڑ کر جائیں۔

اس کے بعد میں نے اس شخص سے جس نے اپنا نام سردار احمد بتایا تھا، اجازت چاہی اور اپنے گھر چلا گیا۔ اس واقعے کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن یہ واقعہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں بھی لوگ اس طرح بے احتیاطی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اگر اس بچی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو اس میں قصوروار کون ہوتا؟؟ ☆☆......☆☆

بھٹ شاہ سے تیسری حکایت

وڈیری

سیدہ کاظمی

جو ہمیشہ خود کو آسمان کہتے ہیں، انہیں زمین بھی قبول نہیں کرتی

آج میں تقریباً پچیس برس بعد اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنے گاؤں واپس آرہی تھی۔ میری شادی ہوگئی تھی۔ پہلے ہم اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد ہم امریکہ شفٹ ہوگئے تھے۔ آج اتنے سالوں کے بعد میری گاڑی جب گاؤں میں داخل ہوئی تو پرانی یادیں لوٹ آئیں۔ اچانک ایک



بوڑھی عورت ہماری گاڑی کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ پاگل دکھ رہی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اگر گاڑی کا بریک نہ لگتا تو شاید اسے چوٹ آجاتی۔ جیسے ہی گاڑی آہستہ ہوئی اس نے چلا کر کہا۔

''مجھے بھوک لگی ہے کھانا دو۔''

میرے شوہر نے اسے کچھ پیسے دیے اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔

وہ عورت مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ یہ تو وڈیرے کی بیوی تھی۔ اُف اللہ! اس کی یہ حالت۔

ہماری گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی لیکن میں بہت حیران ہو رہی تھی۔

جب ہم گھر پہنچے تو بہت تھک گئے تھے لیکن وڈیرے کی بیوی میرے ذہن سے نہیں نکل پا رہی تھی۔

میرا سارا بچپن اسی گاؤں میں گزرا، اس عورت کے پڑوس میں، میں بھلا اُسے کیسے نہیں پہچانتی۔ مجھے بڑا تجسس ہوا۔ گاؤں کے سب سے امیر گھر کی مالکن! جس کے آگے پیچھے نوکروں کی فوج ہوتی تھی۔ وہ اس حالت کو کس طرح پہنچی۔ پوری رات رہ رہ کر مجھے اس کا خیال آتا رہا۔

وہ بہت خوبصورت اور دولت مند عورت تھی۔ اس کے شوہر کی سیکڑوں ایکڑ زمین تھی۔ مزارعے تھے، نوکر چاکر اور بہت بڑی حویلی جس میں بیس سے زیادہ کمرے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی شادی اپنے چچازاد سے ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہوا تو اس کی زمین بھی اس کا شوہر ہی سنبھالتا تھا۔

یہ سب باتیں بچپن میں مجھے میری امی نے بتائی تھیں۔ چونکہ ہمارا ایک ہی گاؤں ہے اور پڑوس بھی، تو اس وجہ سے ان کی حویلی میں آنا جانا رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے اس کے بیٹے کی شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے انہوں نے بیٹے کی شادی کی تھی۔ خوب زیور چڑھایا تھا۔ مہمان دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا، گانا بجانا غرض کے گاؤں میں دھوم رہی اس شادی کی بڑے دنوں تک۔

ہم بھی اس شادی میں شریک تھے۔ میں نے دیکھا وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لا رہی تھی۔ ہر کسی کو ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی اسے اپنے حسن اور پیسے پر بڑا ناز تھا۔ سب کے سامنے اس نے اپنی ملازمہ کو اتنا مارا کہ وہ ادھ موئی ہوگئی تو اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ بیچاری بہت رو رہی تھی۔ اس عورت کو اپنے پیسے اور منصب پر گھمنڈ تھا اور اللہ کا ڈر قطعاً نہ تھا۔

اس طرح آئے دن گاؤں میں باتیں ہونے لگیں کہ وہ اپنی بہو پر بہت ظلم کرتی ہے۔ زیور چوری کا الزام لگا کر اسے گھر سے بھی باہر نکال دیا۔ کیونکہ وہ غریب خاندان سے تھی تو اس کے آگے اپنے پیسے کا رعب جھاڑتی تھی اور اسے بہت بے عزت کرتی تھی۔ وہ بیچاری رو رو کر اپنی صفائی پیش کرتی رہتی کہ میں نے زیور نہیں چرائے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ اس کی بہو بہت اچھی تھی۔ شوہر کی فرمانبردار، ساس کی بھی بہت خدمت کرتی تھی۔ ساس نے اس پر پابندی لگا دی کہ اب وہ میکے نہیں جائے گی۔ تو وہ پھر کبھی نہیں گئی۔ شادی کے بعد صرف ایک بار ہی گئی تھی۔ وڈیری نے منع کر دیا۔ تمہارے میکے والے ہمارے جوڑ کے نہیں۔ نہ وہ لوگ یہاں آئیں گے، نہ تم جاؤ گی۔''

کچھ دنوں کے بعد ہمیں پتا چلا کہ زیور تو گھر میں سے ہی مل گئے۔ جو اس کے شوہر نے الماری میں سے نکال کر چھپا لیے تھے۔ اور وہ جن غیر عورتوں کے چکر میں تھا انہیں دینے کے لیے الماری سے نکال کر لے جا رہا تھا۔ تو کسی نے دیکھ لیا۔

یہ سب باتیں ہمیں خالہ بلقیس نے بتائیں جو ان کے گھر کام کرتی تھیں۔ اور ہماری رشتے دار بھی تھیں۔ وہ اکثر امی سے وہاں کی باتیں کرتی تھیں تو میں بھی سنتی تھی۔

امی اکثر کہتی تھیں کہ انہیں ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆☆

ایک دن خالہ بلقیس توبہ توبہ کرتی ہوئی امی کے پاس آئیں کہنے لگی۔ ہمارے ہاں جو لڑکی ثمینہ کام کرتی ہے وہ غائب ہوگئی ہے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ اسے بیگم صاحبہ نے غائب کرایا ہے۔ کیونکہ بہت دنوں سے گھر میں پُراسرار باتیں اور سرگوشیاں ہورہی تھیں۔ ایک دن میں مالکن کے کمرے میں کپڑے دینے گئی تو دروازے پر ہی رُک گئی۔ ثمینہ ان کے کمرے میں رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں بیگم صاحبہ! یہ بچہ عاصم صاحب کا ہی ہے۔ اور مالکن غصہ ہورہی تھیں کہ خبردار جو ایک لفظ بھی آگے بولا۔ یا کسی سے اس بات کا ذکر بھی کیا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' وہ بیچاری روئے جارہی تھی۔ کیونکہ گھر کے نوکروں کو کمروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس کسی کو کان وکان خبر نہ ہوئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ دو تین دن کے بعد ثمینہ کی ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی حویلی میں آگئی۔

بیگم صاحبہ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑا شور کررہی تھی کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ مجھے اس کا پتا دو۔ وہ بیچاری روتی ہوئی جارہی تھی۔ لیکن کسی نے اس کی فریاد نہ سنی۔ خالہ بلقیس نے امی سے کہا میں پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ ثمینہ کو ان لوگوں نے غائب کرایا ہے۔''

جس نے سنا توبہ توبہ کرتا رہا کہ ان لوگوں کو خدا کا بھی ڈر نہیں۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔

پھر اچانک میرا رشتہ اچھی جگہ سے آگیا تو میری ماں نے میٹرک کے بعد فوراً میری شادی کرادی۔ اور میں امریکہ اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوگئی۔ اور میری نئی زندگی شروع ہوگئی۔ پھر بچے ہوگئے۔ اتنی فرصت کہاں رہی کہ گاؤں والوں کی خبرگیری کروں۔

آج اتنے سالوں کے بعد میں نے وڈیری کو اس حالت میں دیکھا تو میری عقل حیران رہ گئی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ہے۔

دوسری صبح میں نے جب اپنی بھابی سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا۔

''کافی سال پہلے وڈیرے کا انتقال ہوگیا۔ تو ان کے مرنے کے بعد تینوں بیٹوں نے اپنی اپنی جائیداد بیچ دی اور شہر میں رہنے لگے۔ بڑا بیٹا کینیڈا میں سیٹل ہوگیا۔ زمین حویلی' سب کچھ بیچ کر وہیں کینیڈا میں شادی بھی کرلی۔

ساری حویلی ویران ہوگئی۔ وہ حویلی جس میں سارا دن لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ آج وہاں کوئی نہیں۔''

چھوٹے بیٹے نے ماں کے لیے نوکرانی رکھی ہوئی تھی اور مہینے دو مہینے بعد گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ لیکن وہ نوکرانی کا کہا کب مانتی ہے۔ پتا نہیں اسے کیا ہوجاتا ہے۔ وہ چیختی چلاتی گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔ پاگلوں کی طرح پھرتی ہے۔ لوگوں سے کھانا مانگتی ہے۔ کوئی جان پہچان والا دیکھ کر اس کو گھر پہنچاتا ہے۔

بیٹے کے بہت کہنے پر بھی جانے وہ گھر میں کیوں نہیں بیٹھتی۔ اسے نہ جانے گھر میں کیا ہوجاتا ہے۔ سکون نہیں اسے ایک پل بھی۔''

بھابی کی باتیں سن کر مجھے جھرجھری آگئی اور وہ وقت آنکھوں کے آگے فلم کی طرح چلنے لگا جب وڈیری اپنی نوکرانی پر تشدد کررہی تھی۔

جب اپنی بہو پر چوری کا الزام لگا کر گھر سے بے دخل کررہی تھی۔

اور جب اس نے ایک ملازمہ کو اپنے بیٹے کا گناہ چھپانے پر موت کی نیند بھی سلادیا تھا۔

آہ! انسان کسی بھی عمل کے کرنے سے پہلے نیلی چھتری والے کے انصاف کو بھول جاتا ہے۔

جس نے بے گناہوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہوں وہ بھلا کس طرح اپنے آشیانے میں سکھ پاسکتا ہے۔

آج وڈیری کا نصیب در در کی ٹھوکریں ہیں۔ وہ سکون کھو چکی ہے۔ دعا کریں خدا اسے سکون عطا کرے۔

☆☆ ...... ☆☆

اُستاد

نعیم اللہ

ہم تو صرف فون پر دل پشوری کرتے تھے لیکن اُستاد فون کے ذریعے گھر میں گھس جایا کرتا تھا

''ابے یار زندگی میں کوئی نیا مزہ نہیں آ رہا۔'' ٹیپو نے میرے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ میں جو اتنی دیر سے اس نئے S.M.S کے Meaning تلاش کر رہا تھا۔ یکدم چونکا۔

''اوئے ٹیپو یار' یہ بتا یہ 'D'' کا مطلب کیا ہوا؟'' میں اس کی بات یکسر فراموش کر کے موبائل اس کے آگے کر چکا تھا۔

''اوئے۔ یہ ''D'' کو چھوڑ' یہ بتا یہ نئی بلبل کون سی ہے۔'' ٹیپو نے ایک واہیات سا اشارہ کرتے ہوئے آنکھ دبائی اور موبائل میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

''ابے موبائل دے ادھر' اتنے دن تک دانا ڈالا ہے تب جا کر تو یہ S.M.S آیا ہے۔'' میرے چہرے پر ایک مخصوص فاتحانہ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''اوئے ٹیپو' یہ D کا مطلب تو بتا دے۔'' میں نے پھر سوال دہرایا۔ ''ابے D کا مطلب D فور Duffer گدھے۔'' وہ مسکرایا۔

''اوہ! شٹ یار! دیکھا چکمہ دے گئی نا۔'' میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''کوئی بات نہیں' تیری تو میں..... ٹیپو یار چل استاد کے پاس چل۔ یہ چڑیا اسی کے ہتھے چڑھنا چاہیے۔'' میرے دماغ میں استاد کا نام آتے ہی ہر طرف رنگ ہی رنگ دوڑنے لگے۔

''واقعی یار! استاد بھی چیز ہے۔ ابے کتا دماغ ہے استاد کا۔'' ٹیپو بھی استاد کے نام پر فوراً الرٹ ہو گیا اور ہم دونوں استاد کی اسٹیٹ ایجنسی کی طرف چل دیے۔''

☆......☆

میرا نام سید راحیل شاہ ہے۔ میرا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ہے جہاں اولاد کو نوکری اور معاش کی فکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ آبائی زمینیں اور دکانیں اور اسی طرح کے بہت سارے ذریعوں سے ایک اچھی خاصی رقم ہاتھ میں آ کر تمام فکروں سے ازخود جان چھڑا دیتی ہے۔ میرے والد صاحب بھی زمیندار ہیں۔ یوں تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی میری بے فکری کے دن ختم نہیں ہوئے تھے۔ میں دوستوں کا دوست اور یار باش قسم کا لڑکا ہوں اور پھر جہاں عیاشی کی ساری سہولتیں موجود ہوں' آگے کون دیکھتا ہے؟ ہر وقت میں اور ٹیپو ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ ٹیپو بھی میری ہی کاپی تھا اور ہمارا سب سے بڑا سہارا اور ماسٹر مائنڈ بندہ استاد تھا۔

استاد کی کیا تعریف کروں استاد وہ آدمی تھا جس کے بارے میں کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کہ شیطان بھی اس کے آگے ہار مان جائے گا۔ ہم تو صرف موبائل پر باتیں کر کے دل پشوری کرتے تھے لیکن استاد موبائل کے راستے لڑکی کے گھر میں گھس جاتا تھا۔ ہم اس کی اس ذہانت کی داد دیتے تھے اور کو ان ہی خوبیوں کی بنا پر اسے استاد کہتے تھے۔

آج بڑے دن ہو گئے تھے ٹائم پاس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے سارے نمبرز نو Responded تھے۔ ایک نیا

نمبر چاہیے تھا۔ جو دل بہلانے کا باعث بنے اور جب ایک نمبر سے بار بار S.M.S کے بعد جواب آیا تو اس D کے لفظ نے میرا خون کھولا دیا اور پھر اپنے استاد کے پاس جانے کا خیال آتے ہی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ میرے اور ٹیپو کے قدم تیزی سے استاد کی اسٹیٹ ایجنسی کی طرف جا رہے تھے۔

☆......☆

''ابے آجا' بیٹھ آکر ادھر۔ یہ تو کیوں بیواؤں کی طرح منہ لے کر کھڑا ہے۔'' استاد نے مجھے دیکھتے ہی جملہ کسا۔ ٹیپو استاد کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ''استاد! ابے یار بڑی خواری ہو رہی ہے اور یہ نمبر پکڑ اور اس بندی کو لائن پر لے کر آ۔'' میں نے جاتے ہی سب سے پہلے D والا نمبر استاد کو دیا۔

''یہ تو بتا تیرا مسئلہ کیا ہے بے؟ تم مرد ہو' لعنت ہے تم مردوں پر جو ایک زنانی کو نہیں پٹا سکتے۔ ابے یہ لڑکیاں تو مکھن کی طرح ملائم ہوتی ہیں ذرا سی باتوں کی گرمی سے پگھل جاتی ہیں اور......'' استاد نے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگایا تھا۔ میں اور ٹیپو منہ افسردہ کیے نیچے دیکھنے لگے۔

''نہیں استاد ہمیں ذلیل نہ کر۔ کوئی نمبر دے پھر تجھے بتائیں گے۔'' میں یکدم جوش میں آگیا۔

''میرے منے' یہ بڑکیں نہ مار۔ میں تجھے جانتا ہوں بیٹا' اب میں جو تجھے نمبر دے رہا ہوں نا یہ پٹا پٹایا نمبر ہے۔ اپنی گرمی اس نمبر والی کو دکھائیو۔ میں آج کل اس کے پاس جانے کے لئے خود کو تیار کر رہا ہوں۔ آفت ہے آفت...... بس Hello بول اور لگ جا کام سے۔''

''کیا کہہ رہا ہے استاد۔'' میں خوش ہو کر بولا تھا۔

''ابے سچ کہہ رہا ہوں منے۔ ایسی ہی چیز ہے وہ۔ باتیں تو ایسی کرتی ہے کہ مزہ آجاتا ہے۔ قیامت سے کم نہیں ہو گی مسری۔ خدا کی قسم اگر زندگی کا مزہ لینا ہے تو ایک دفعہ اس نمبر پر ٹرائی ضرور کریو۔'' اور پھر اچانک ہی کسی کے آنے پر میں اور ٹیپو اسٹیٹ ایجنسی سے نکل کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

☆......☆

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح سے یہ نمبر ڈائل کروں۔ یہ پہلی بار تھا جب مجھے کچھ عجیب سا Feel ہو رہا تھا کہ جب کسی راضی بندی کو فون کرنا ہو تو بات کیسے شروع کی جائے۔ کوئی دو گھنٹے بعد میں نے نمبر ڈائل کر ہی دیا۔

''Hello۔'' میں نے جھجکتے ہوئے Hello کہا تھا۔

دوسری طرف سے ''Hello'' کی آواز آئی۔

اور...... پھر یوں ہوا تھا کہ

میں شرم کے مارے زمین میں گڑ کر رہ گیا تھا۔

میری نظریں خود اپنی نظروں کی تاب نہ لا پا رہی تھیں۔

دوسری طرف میری بھابی On line تھی۔ جس کی نہایت ہی خوب صورت' میٹھی اور منفرد آواز کو تو میں ہزاروں میں شناخت کر سکتا تھا۔



ایمانداری کا ٹکٹ

رانا محمد شاہد

کرپشن کے منہ پر ایک نوجوان کا طمانچہ

''بیٹا...... کوشش کرو کہ جلد نوکری مل جائے کیونکہ گھر کے حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ اخراجات میں اضافہ ہورہا ہے اور......''

''جی بابا جان! میں انشاء اللہ لاہور ضرور جاؤں گا۔'' زین نے اپنے ابو کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ اس دوران اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''بیٹا میں جانتا ہوں، تمہاری پڑھائی ضروری ہے لیکن کھانے کو کچھ نہ ہوگا تو پڑھائی اور دوسرے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ میں اگر مجبور نہ ہوتا تو کبھی تمہیں دوسرے شہر نوکری کے لیے نہ بھیجتا۔'' یہ کہتے ہوئے اکرام صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے زین کو گلے لگالیا۔

اکرام صاحب محکمہ ریلوے سے ریٹائرڈ تھے۔ اُن کے تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی شمسہ پھر زین اور سب سے چھوٹی بیٹی نائلہ، اکرام صاحب دے کے مریض تھے۔ انہیں یہ مرض کافی پرانا تھا۔ وہ کوئی کام بھی مستقل مزاجی سے نہیں کرسکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مقررہ مدت سے 2 سال پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی اور اب وہ پچھلے چھ ماہ سے بستر پر تھے۔

بچوں کے تعلیمی اخراجات، بجلی، گیس کے بل اور باقی ضروریاتِ زندگی معمولی پنشن سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ ایک دو ماہ تو سلسلہ چلا لیکن پھر انہوں نے اپنے بیٹے زین کو نوکری تلاش کرنے کے لیے کہا۔

چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے زین کو کوئی مناسب ملازمت نہ ملی۔ زین بی اے پاس تھا۔ اس کی عمر صرف 20 سال تھی چونکہ اس سے پہلے وہ کبھی رہنے کے لیے کسی دوسرے شہر نہیں گیا تھا۔ اس لیے گھر والوں سے دوری نے اُسے اُداس کردیا۔ لیکن پھر ایک اچھے مستقبل کی اُمید لیے وہ خوشی خوشی لاہور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

روانگی سے ایک دن پہلے اکرام صاحب نے اُسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''بیٹا ایمانداری کا مطلب ہے ہر چیز کو اس کی صحیح اور لائق جگہ پر رکھنا۔ ملازمت اسی شخص کا حق ہے جو اسے صحیح طرح سے ادا کرے یعنی اسے اپنا فرض سمجھ کر نبھائے اور یہ ایمانداری زندگی کے ہر

شعبے میں نظر آنی چاہیے۔ کیونکہ ایماندار وہی ہوتا ہے جس کا ایمان سلامت ہو۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے۔

''اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں۔'' اس لیے بیٹا! اپنے ایمان کی حفاظت کرنا تاکہ ایمانداری قائم رہے۔'' زین ادب سے اپنے والد کی باتیں سنتا رہا۔

☆......☆......☆

اگلے دن زین اپنے گھر والوں کو الوداع کہنے کے بعد چنگ چی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ دوسرے دن اس کا انٹرویو تھا۔ وقت اور حالات انسان کو ہر چیز کا مقابلہ کرنا سکھا دیتے ہیں۔ زین کے اندر بھی اب ایک نوعمر لڑکے کی جگہ ایک سمجھدار اور باشعور شخص آبیٹھا تھا۔

رکشے سے اُتر کر اُس نے کرایہ رکشے والے کو تھمایا اور تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا۔ کیونکہ گاڑی آنے میں اب چند ہی منٹ باقی تھے اور اُس نے ٹکٹ ابھی نہیں خریدا تھا۔ زین ابھی پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹرین کی آواز آنے لگی۔ چھوٹا اسٹیشن ہونے کی وجہ سے یہاں ٹرین کا اسٹاپ دو منٹ سے زیادہ نہ تھا۔ چند ہی لمحوں میں ٹرین اسٹیشن پر موجود تھی اور دوسری طرف ایمرجنسی میں ٹکٹ لینے کے لیے تقریباً دس افراد ٹکٹ گھر کے سامنے موجود تھے۔ اتنے افراد کی موجودگی کا صاف مطلب تھا کہ ٹرین چھوٹ جاتی اور اگر ٹرین چھوٹ جاتی تو انٹرویو بھی رہ جاتا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اسی دوران ٹرین نے روانگی کا وسل دیا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ زین نے فوراً ٹکٹ خریدنے کا ارادہ ملتوی کیا اور ٹرین کی طرف بڑھنے لگا۔

ٹرین کی رفتار ایک دم تیز ہوئی تو اُس نے جلدی سے اپنے بیگ کو بوگی کے دروازے سے اندر پھینکا اور خود پائپ پکڑ لیا۔ اس دوران دروازے کے قریب کھڑے ایک شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اُسے اوپر چڑھنے میں مدد دی۔ اس تیزی میں زین کے بائیں بازو کی کہنی زخمی ہوئی۔ زین نے اُس شخص کا اور پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ بحفاظت ٹرین میں سوار ہوگیا۔

زین نے بیگ اٹھایا اور بیٹھنے کے لیے ٹرین میں جگہ تلاش کرنے لگا۔ کھچا کھچ بھری ٹرین میں جگہ کہاں



سے ملتی۔ پورے کمپارٹمنٹ میں جگہ نہ تھی۔ البتہ ایک بڑی سیٹ پر دو نوجوان بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے جبکہ اُن کے بالکل قریب ہی دو بوڑھے شخص کھڑے تھے۔ سرپراما رے تھے، زین نے سوچا ان نوجوانوں نے جب بزرگوں کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تو مجھے پوچھ کر شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

اس دوران اُس نے دیکھا کہ ایک ماڈرن خاتون بڑی سیٹ پر ٹانگیں پسارے مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ اُس کے قریب کھڑی ایک نوجوان لڑکی نے اس خاتون سے کہا۔

''جگہ مل سکتی ہے؟'' خاتون فوراً بولیں۔

''کہاں جانا ہے؟''

''لاہور......'' اس لڑکی نے بتایا تو خاتون نے کہا۔

''یہ سیٹ ریزرو ہے۔ ہمارے ساتھ دو اور خواتین بھی ہیں جو ابھی آجائیں گی۔'' خاتون نے جھوٹ بول کر لڑکی کو بیٹھنے نہ دیا۔

ہم کیسے لوگ ہیں، کسی دوسرے کو ذرا سی سہولت یا آسانی دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ حالانکہ ہمارا دین ہمیشہ انسانیت سے محبت کا درس دیتا آیا ہے۔ انسان کے کام آنے اور اس کی مشکلات دور کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کا تو مقصد ہی دوسروں کے کام آنا ہے۔' گزرے واقعات نے اُس کے اعصاب میں تناؤ پیدا کر دیا تھا۔

اسی دوران اس نے بیگ گیٹ کے ساتھ والی سیٹ کے پاس رکھا اور خود بوگی کے اندر جگہ ڈھونڈنے لگا۔ مگر اسے پورے کمپارٹمنٹ میں کوئی صاحبِ دل بندہ نظر نہ آیا۔ صاحبِ دل اس لیے کہ بعض لوگ بڑی سیٹ پر لیٹے کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ رہے تھے مگر کسی کھڑے ہوئے شخص کو بیٹھنے کے لیے جگہ دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ دوبارہ گیٹ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ باہر کے خوبصورت مناظر، سرسبز و شاداب پاکستان اور گزرے ماحول کی تلخ یادوں سے زین کو پتا بھی نہ چلا کہ کب لاہور اسٹیشن آگیا۔

وہ ٹرین سے اُترا، پلیٹ فارم پر آکر ایک کینٹین سے ناشتا کیا۔ جب وہ پلیٹ فارم کی حدود سے نکل رہا تھا تو ایک خیال نے اس کے قدم روک دیے۔

''میں نے ٹکٹ تو لیا ہی نہیں۔''

''چلو کوئی بات نہیں...... میں ریلوے کے کسی افسر سے مل کر اسے ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔ ٹکٹ کے پیسے دے دوں گا اور اُس سے معذرت بھی کر لوں گا۔'

یہ سوچ کر زین اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر ایک دم اُس کے ابو کی ایک بات نے اُس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔

''بیٹا! میں نے تو ساری زندگی محکمہ ریلوے میں گزار دی، سب لوگ کرپٹ ہیں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے...... آج اگر محکمہ ریلوے اربوں روپے کے خسارے میں جا رہا ہے تو اس کی بڑی وجہ ریلوے افسران کا بدعنوان ہونا ہے۔''

زین تذبذب کا شکار تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پا رہا تھا اور بغیر ٹکٹ کے وہ اسٹیشن کی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنے مستقبل کی بنیاد بے ایمانی اور دھوکے پر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس کے والدین کی تربیت ہی ایسی تھی۔

کہتے ہیں کہ جب انسان ایمانداری پر چلنا چاہے تو اللہ تعالیٰ انسان کی سوچ کو وسعت دے دیتا ہے اور کئی راستے اُس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اُس لمحے بھی یہی ہوا۔ وہ فوراً ٹکٹ گھر کی طرف بڑھا۔ اُس نے لاہور سے اپنے شہر تک کے کرائے کا ٹکٹ خریدا اور اسٹیشن کی حدود سے باہر نکلتے ہی اُس ٹکٹ کے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیے۔ اب اس کے چہرے پر سکون و اطمینان تھا۔ ایمانداری کا ٹکٹ اُس کے مستقبل کے پلیٹ فارم پر اُس کی منزل تک اُسے باآسانی پہنچا سکتا تھا۔

☆☆......☆☆

تم یاد آتی ہو

ایم سلطان

محبت صرف پانے کا نام نہیں، اس کا دوسرا نام قربانی ہے

میں ایک گاؤں کا رہنے والا لڑکا زندگی سے لڑتے لڑتے شہر میں آ گیا۔ میں شہر میں کیسے آیا؟ کیوں آیا؟ یہ ایک الگ بات ہے لیکن شہر میں رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا لڑکا ہوں لیکن نوکری وغیرہ نہ ملنے کی وجہ سے مزدوری بھی کی اور فیکٹریوں میں بھی کام کیا۔ میں اس مزدوری والی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کوئی چھوٹا سا اپنا کاروبار کیا جائے، پھر ایک ہمدرد انسان مجھے ملا، جس نے مجھے موبائل ریپیئرنگ کا کورس کروایا۔ میں دن میں مزدوری اور شام کے بعد موبائل کورس کرنے جاتا تھا۔ میں نے اپنی محنت اور کوشش سے موبائل کورس مکمل کر لیا، پھر میں نے اپنی کالونی میں چھوٹی سی دکان کھول لی۔ مجھے اس کام میں تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ میرا دل بڑا عاشق مزاج ہے۔ میں شاعری کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔

میرا ذہن ایک بچے کی طرح ہے، جو چیز دل کو بھا جائے، اُس کو پانے کی تڑپ مجھے سونے نہیں دیتی اور اُس کو پانا میری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے، پھر میرے بس میں نہ بھی ہو۔ لیکن دل تو پاگل ہے، دل کو کون سمجھائے۔

میں ایک صائمہ لڑکی کا ذکر سنتا تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ اس کی سیرت بھی اچھی ہے اور صورت بھی۔ میرے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ اس لڑکی سے دوستی کی جائے۔ لیکن کریں تو کیسے کریں، نہ وہ مجھے پہچانتی ہے اور نہ ہی میں نے اُس کو دیکھا ہے۔ میں نے سُنا تھا تو صرف اُس کا ذکر سنا تھا۔ اس کے بارے میں

باتیں سنتے ہی میرے دل میں ہلچل مچ جاتی تھی اور یہ ہی سوچنے لگا کہ صائمہ سے رابطہ کس طرح کیا جائے۔ اور کس طرح اس سے دوستی کی جائے۔ سارا دن اور ساری رات اسی سوچ میں گزرنے لگے تھے۔ دن بہ دن اس کی تڑپ بڑھتی جارہی تھی۔ لیکن کروں بھی تو کیا کروں؟ کیسے بولوں کہ صائمہ میں آپ کے لیے کتنا تڑپتا ہوں۔ آپ کی تڑپ مجھے سونے نہیں دیتی۔

اور پھر میں نے کسی طرح اُس کا موبائل نمبر حاصل کرہی لیا۔ اب سوچ رہا تھا کہ بات کروں تو کیسے کروں۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک اسلامی ایس ایم ایس اسے بھیج دیا اور اُس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ "کون ہو......؟"

میں اُس کو الٹے سیدھے جواب دیتا رہا لیکن میں اُس کو بہت تنگ کرنے لگا تھا اُس کی بے رخی اور کڑواہٹ کی باتیں بھی مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ میرا دل اُس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اب تو میرے دل میں صائمہ کے لیے چاہت بڑھتی جارہی تھی۔ اگر وہ اک پل کے لیے بھی بات نہ کرتی تو مجھے رونا آجاتا تھا اور میں خود کو تنہا سمجھنے لگتا تھا اور مجھے ایک بات تڑپانے لگی کہ میں سے کس طرح اپنے پیار کا اظہار کروں؟

میں نے اُس کو SMS کیا، جس میں میں نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ صائمہ نے یہ پڑھ کر بہت غصہ کیا اور کہنے لگی۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ میں اور تم سے محبت۔" یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے صائمہ سے کہا۔

"میں بن آپ کے رہ نہیں سکتا۔ پلیز آپ بات کریں۔" صائمہ سے بھی میرے آنسو برداشت نہیں ہوئے اور وہ بات کرتی رہی، آہستہ آہستہ صائمہ کو بھی شاید مجھ سے محبت ہونے لگی تھی۔

اب میرے دل میں یہ تمنا جاگ اُٹھی تھی کہ صائمہ سے ملاقات کی جائے اور دیکھوں کہ صائمہ کیسی ہے؟

مجھے یقین تھا کہ صائمہ ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ میں نے صائمہ سے کہا۔

"آپ مجھ سے ملیں۔" پہلے تو اس نے منع کیا کہ میں نہیں مل سکتی لیکن میرا ناراض ہونا اُس سے برداشت نہیں ہوا اور اُس نے ملنے کا وعدہ کرلیا۔ اُس نے کہا کہ "میں 17 اکتوبر کو کالج جاؤں گی، پھر آپ بھی آجانا ہم مل لیں گے۔" 7 اکتوبر کو آنے میں ابھی 5 دن باقی تھے اور مجھ سے یہ دن بھی برداشت نہیں ہورہے تھے۔ 17 اکتوبر کے دن کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ رات دن یہ سوچ تھی کہ جلد وہ دن قریب آجائے کہ میں اپنی صائمہ سے مل پاؤں۔ دیکھوں کہ صائمہ کیسی ہے۔ آخر جب ایک دن باقی رہ گیا تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئی اور یہ سوچ رہا تھا کہ میں صائمہ کا سامنا کیسے کروں گا۔ وہ مجھے پسند کرے گی بھی یا نہیں۔

مجھے اتنا پتا تھا کہ صائمہ پنجاب کے ایک گاؤں کی رہنے والی لڑکی ہے اور اُس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ صائمہ مجھے کس لباس میں پسند کرے گی۔ میں تو شلوار قمیص اور پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ صائمہ گاؤں کی رہنے والی لڑکی ہے اور وہ مجھے سادگی میں بہت پسند کرے گی۔ یہی سوچتے سوچتے پوری رات گزر گئی اور صبح ہوتے ہی میں نے صائمہ سے پوچھا۔

"آپ کس وقت گھر سے نکلو گی۔ اُس نے کہا کہ میں 10 بجے تک گھر سے روانہ ہو جاؤں گی۔ آپ بھی آجانا۔" میں بہت سادگی سے سنور کر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر روانہ ہوا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا بہت ساری اور بھی کالج کی لڑکیاں تھیں تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک خوب صورت لڑکی کھڑی ہے۔ اس کی تیر نما آنکھیں، گول مٹول چہرہ، مدھم رفتار۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے قدم زمین پر نہیں تھے۔ میں دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا تو مجھے یقین ہوا کہ صائمہ یہی ہے۔ میں نے سائیڈ میں ہو کے کال کی۔

"صائمہ تم کہاں ہو؟" اُسی خوب صورت لڑکی نے کال اُٹھائی اور بات کی۔

"میں کالج پہنچ گئی ہوں، آپ کہاں ہو؟" میں نے کہا۔

"میں بھی آپ کے آس پاس ہوں۔" پھر صائمہ نے کہا۔ "آپ مل لو۔" میں صائمہ کے پیچھے گیا اور کہا۔

"ہائے صائمہ" صائمہ نے پلٹ کے جیسے ہی مجھے دیکھا تو اس کی کیا آنکھیں تھیں، پہلی بار اس سے ملتے ہی مجھے ایسا لگا کہ میری زندگی صائمہ کی آنکھوں میں ہے۔

پہلے تو وہ ڈر گئی، پھر اس نے ہنس کے بات کی لیکن میری سادگی دیکھ کے کچھ اچھا نہیں لگا اسے۔ شہر میں آکے شہر کی زندگی میں گاؤں کے خیالات بدل گئے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے کہا۔

''اب آپ چلے جاؤ۔'' شاید اس کو میرا ملنا پسند نہیں آیا تھا۔ مجھے بے رخی سے بولی کہ آپ نے مل لیا اور آپ چلے جاؤ، یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور افسوس بھی ہوا کہ آج میں بھی روزانہ کی طرح سنور کر آتا تو صائمہ کو شاید اچھا لگتا۔ صائمہ کی بے رُخی برداشت تو نہیں ہو رہی تھی لیکن کرتا بھی تو کیا کرتا۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی مجھے ایسا لگا کہ زندگی کی ہر خوشی جیسے روٹھ گئی ہو اور میں خود کو تنہا سمجھنے لگا تھا۔ صائمہ کی بے رُخی مجھے بُری تو نہیں لگی لیکن دکھ ضرور ہوا۔

میں اپنے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس گھر آ گیا اور پھر مجھے صائمہ نے کال کی کہ آج ہم دونوں کو ساتھ میں میری سہیلی نے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے آپ میرے ساتھ بات مت کریں اور مجھے بھول جائیں۔ میں اپنی سہیلی کو خود سنبھال لوں گی۔

یہ سن کر میرے تو ہوش حواس ہی ختم ہو گئے۔ پہلے ہی آنکھیں اشک بار تھیں، پھر تو ساون برسنے لگے۔ میں ساری رات سو نہیں سکا اور دل میں تڑپ بڑھنے لگی اور صائمہ سے میں یہ شکوہ کرنے لگا۔

''تم میرے ساتھ یہ مت کرو، ایسا نہ ہو کہ میں جینے کی آرزو کھو بیٹھوں۔ میرا آپ کے بنا کوئی نہیں۔'' یہ سوچتے سوچتے میرا دن بھی گزر گیا اور میں نے شام کو صائمہ کو کال کی اور کہا۔ ''صائمہ میرے ساتھ ایسا مت کرو، ابھی مجھ سے بات کرو۔ اب مجھ سے رہا نہیں جا رہا۔'' تو صائمہ نے کہا۔

''تم مجھ سے بات مت کرو۔ میں بغیر آپ کے رہ سکتی ہوں اور میں خوش ہوں۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''صائمہ میں تمہیں آہستہ آہستہ چھوڑ دوں گا، بھول تو تمہیں نہیں سکتا لیکن میں تمہارے سائے سے بھی دور ہو جاؤں گا۔ آپ مجھ سے کچھ دنوں کے لیے بات کریں۔ اگر کسی کا ایک دم دل ٹوٹتا ہے تو، درد ہوتا ہے۔'' صائمہ سے میرا رونا برداشت نہیں ہوا اور اس نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، کچھ دنوں کے لیے میں آپ کا ساتھ دوں گی۔''

میرا اُداسی والا عالم گزر رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کی سہیلی وغیرہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک صائمہ کی مجھ سے جان چھڑانے کی چال تھی، مجھے دُکھ تو ہوا لیکن میں نے صائمہ سے کچھ نہیں کہا۔

پندرہ بیس دن گزرنے کے بعد صائمہ نے مجھے کہا۔ ''اب تو آپ بھول جاؤ مجھے۔'' دل تو نہیں کر رہا تھا میرا کہ صائمہ سے میں دور ہو جاؤں لیکن صائمہ کی رضا یہی تھی کہ میں اُس سے دور ہو جاؤں۔ میں نے صائمہ سے کہا۔

''آپ مجھ سے آخری بار مل لو، تاکہ میں آپ کو اتنا دیکھ لوں کہ زندگی بھر میری آنکھوں میں آپ کی تصویر بسی رہے۔'' پہلے تو صائمہ نے منع کیا لیکن میری کافی التجا کے بعد اس نے ہاں کر دی اور اُس نے کہا۔

''میں 4 نومبر کو کالج جاؤں گی، آپ بھی مل لینا۔''

آخر وہ دن بھی آنا ہی تھا۔ میں نے وہ دن رات تڑپتے ہوئے گزارے۔ صبح ہوتے ہی میں زندہ لاش کی طرح کالج کی طرف چلا گیا۔ ملاقات خوشی کا باعث ہوتی لیکن یہ ملاقات ایسی تھی جس میں اپنی زندگی کو خود اُجاڑنا تھا۔

میں جب صائمہ سے ملا تو اس کے ساتھ اس کی دوست بھی تھی۔ صائمہ کے سامنے میں اپنی آنکھ نم اور اُداس دل لے کے کھڑا رہا۔

میں نے جب صائمہ کو ہاتھ دیا، پہلے تو اس کا دل نہیں بول رہا تھا لیکن پھر میرے اصرار کو دیکھ کے اس نے ہاتھ ملایا۔ مجھے ایسے لگا کہ اس کے ہاتھ ملانے سے میں انمول بن گیا ہوں۔ صائمہ سے کچھ پل باتیں کرتے مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کی بے رخی کی باتیں بھی دل کو راحت دینے سے کم نہیں تھیں۔ کچھ دیر بعد صائمہ نے مجھے کہا۔ ''اب آپ نے مل لیا، اب جاؤ اور مجھے کوئی SMS یا کال نہیں کرنا۔'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ خوش رہو۔'' یہ میرے پیار کی کامیابی ہے اور کبھی بھی درد آپ کو نہ چھوئے۔ میرے اب دکھ بھرے دنوں کا آغاز ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تھی اور کرتا رہوں گا۔ میری جتنی محبت کوئی اور نہیں کر سکتا آپ سے لیکن میری دعا ہے کہ آپ کو اتنا پیار ملے کہ آپ کو کبھی تنہائی کا احساس نہ ہو۔'' میری آنسو بھری آنکھوں کو چھوڑ کر وہ چلی گئی اور میں اپنے تھکے قدموں کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ آج ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا شہر اُداس ہو۔

☆☆......☆☆

صادق آباد سے ساتویں حکایت

ادھوری کہانی



عارف شہزاد

محبت کے ہاتھوں ناکام ہو جانے والے ایک نوجوان، بوڑھے کا حیات نامہ

میری ہر تحریر پڑھنے کے بعد اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ یہ آپ نے لکھی ہے۔ اتنی بڑی باتیں کیسے کر لیتے ہو؟ ہلکی آنچ پر اتنی گہری باتیں کیوں کرتے ہو؟ تم اپنی عمر سے بہت آگے ہو۔ شاید سب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ایسا ہی ہے۔

شاید اسی لیے جو کچھ میرے دوست کرتے ہیں وہ مجھے بچپنا لگتا ہے۔ وہ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے وہ سب فضول لگتا ہے۔ میں چلتے چلتے اپنی ادھیڑ عمری اپنے ساتھ لیے لوگوں سے بہت آگے نکل آیا ہوں۔ مگر میں بھی انسان ہوں۔ بشر ہوں۔ مجھے بھی

READING Section

درد ہوتا ہے۔

میرے سینے میں بھی دل ہے۔ مجھے بھی اندھیروں، انسانوں، زندگی، موت، محبت تقریباً سب ہی سے خوف آتا ہے۔ مجھے بھی رونا آتا ہے۔ انسان ہوں کوئی پتھر تو نہیں۔ جہاں تک بات ہے لکھنے کی تو یہ کہانی بہت لمبی ہے۔

یعنی بات اگر چل نکلی تو بہت دور تلک جائے گی۔ میرے خیال میں ایک عام انسان سے تخلیق کار، قلم کار بننے کا سفر بڑا ہی کٹھن ہے اور تکلیف دہ بھی ہوا کرتا ہے۔ سو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب ذات کا کرب اور خود سے خوش گمانیاں اور بے یقینیاں بڑھنے لگیں۔

زبان خاموش ہوگئی۔ لفظ ختم ہو گئے۔ اور آواز بھی مر گئی۔ تو تب میں نے اندر کے کرب اور اندر کی آگ کی زبان کو قلم بنا دیا۔

تب میں نے لکھنا شروع کر دیا اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔ میری ان تحریروں میں کہیں نہ کہیں وہ بے چینی اور درد بھی موجود ہے جو مجھے بخشا گیا۔

☆......☆......☆

مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں اور اس دنیا میں مجھ سے کیا کام لینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں نے ایک عمر لگائی خدا کو ڈھونڈنے میں۔ مجھے وہ نہیں ملا۔ نمازیں پڑھیں، عبادتیں کیں روزے رکھے۔ نیکیاں کیں۔ سجدے کیے مگر من میں نہیں جھانکا۔ جس دن محبت کی اس دن مجھے کچے گھڑے پر دریا پار کرنے کی سمجھ آ گئی۔ اس دن مجھے ناخنوں سے نہر کھودنا سمجھ آ گیا۔ اس دن میں نے جانا کہ ہر زہر کا تریاق ضروری نہیں ہوتا۔ اسی دن میں نے من میں جھانکا تو مجھے اللہ مل گیا۔ اس دن میں نے رب کو پالیا میں نے خود فریبی سے خود شناسی تک کا سفر سارے کا سارا چند لمحوں میں طے کرلیا۔ اس دن میں نے جانا کہ فرزانگی سے دیوانگی تک کے سفر کو محبت کہتے ہیں۔

☆......☆......☆

محبت کی آگاہی ہوئی تو علم ہوا کہ محبت کسی وجود کا نام نہیں۔ محبت کسی کی ذات پر تصرف حاصل کر لینے کا بھی نام نہیں۔ محبت تو ان مادی احساسات سے بہت پرے بہت دور کی کائنات ہے۔

محبت وجودیت کا نہیں بلکہ روحانیت کا نام ہے۔ محبت من سے من تک کا ناتا ہے۔ روح سے روح تک کا رشتہ ہے۔

میں نے جس سے محبت کی وہ مجھے بے وفائی کا نام دیا گیا۔ اپنی زندگی سے نفرت ہو چکی ہے۔ میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا تھا۔ جب سے وہ مجھے چھوڑ کر گئی ہے میں نہ زندوں میں ہوں نہ مردوں میں۔ زندگی بوجھ سی لگتی ہے۔ سانس بھی بہت مشکل سے لیتا ہوں کیونکہ وہ ہر سانس کے ساتھ یاد آتی ہے۔ میں اُس کا نام نہیں لے سکتا۔ اُسے بدنام نہیں کرسکتا۔ جب مجھے محبت میں ناکامی ملی تو میں نے جنون اوڑھ لیا۔ دیوانگی پہن لی۔

پتا بھی نہیں چلا کہ میں نے اسی دنیا میں اپنی زندگی کو جہنم بنالیا۔ میں نے خود سے لڑائیاں کیں۔

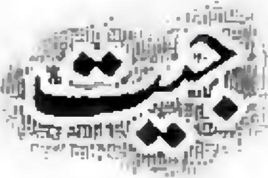
میں اپنی ذات کی کھوج لگاتے لگاتے بچی کھچی شناخت بھی گنوا بیٹھا۔ ایک مدت ہوگئی ہے۔ میں سویا بھی نہیں۔

اب تو میری راتیں کروٹیں بدلتے، چھت تکتے اور گھڑی دیکھتے گزر جاتی ہیں۔

میری تحریریں تو آگہی کے عذاب ہیں۔ جتنا جاننے کی کوشش کریں گے عذاب بڑھتا ہی جائے گا۔ لاعلم ہو تو مست رہو گے۔ ادراک بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میری تحریر تب پڑھیے گا جب آپ میں درد سہنے کا حوصلہ ہو۔ نہیں تو پلٹ جایئے۔ اس صفحے کو بند کر دیں۔

قارئین میں معذرت خواہ ہوں کہ میں کچھ جذباتی سا ہو گیا ہوں۔ بس یہی ہے میری ادھوری کہانی جو نہ جانے کب مکمل ہوگی اور پتا نہیں مکمل ہوگئی بھی یا نہیں۔

☆☆......☆☆



زیبا بدر

اپنوں کے ستم اٹھاتی ملک دشمن عناصر سے نبرد آزما ایک دوشیزہ کے عزم وہمت کی داستان

اور زندگی میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا۔ جو زندگی میں گزارنا چاہتی ہوں، وہ کہیں بہت دور رہ گئی اور آج جو کچھ مجھے ملا اس کی نہ مجھے کوئی خواہش تھی اور نہ چاہا لیکن بے بسی کے آنسوؤں نے مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کر دیا جو شاید میں کبھی نہیں کر پاتی۔

الیکشن جیت کر سب کی مبارکباد وصول کر کے میں گاڑی میں آ بیٹھی تو مجھے گھر کا خیال آیا۔

''کیا آج بھی میں زندگی کی بازی ہار کر جا رہی ہوں۔ کیا وہ سب مجھ سے منہ پھیر لیں گے۔'' میں نے اپنے دکھتے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں فاریہ حسن قومی اسمبلی کا انتخاب جیت کر پتا نہیں کیا کچھ ہاری ہوں۔ ابھی تو مجھے اس کا اندازہ کرنا تھا مگر مسلسل بجتا موبائل مجھے سکون کی سانس لینے نہیں دے رہا تھا۔ موبائل پر کہیں کوئی شناسا نمبر نہیں تھا۔

''میڈم جی گھر آ گیا ہے، گاڑی اندر لے جاؤں یا یہیں انتظار کروں۔'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''تم یہیں رکو۔'' میں نے اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ میرے ماں باپ کا گھر جس کا پھیلا سناٹا مجھے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی ساڑی کی فال درست کی اور اپنی سفید شال کو ٹھیک کرتے ہوئے گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔ موبائل بج رہا تھا مگر میری ساری توجہ گھر کی جانب تھی۔

''کیا آج بھی میں کوئی بُرا کام کر کے آئی ہوں۔ کیا کوئی دعا دینے والے میرے لیے نہیں ہیں۔ کوئی دوڑ کر مبارکباد دینے والا بھی نہیں ہے۔'' میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

میں لمبا کار پورٹیکو پار کر کے صحن تک آئی جہاں امی لیٹا کرتی تھیں، ابا بہت چڑا کرتے تھے کہ آخر تم A/C والے کمرے میں کیوں نہیں سوتی ہو اور ان کی مسکراتی نگاہیں کہتیں کہ اگر میں اندر لیٹ جاؤں تو آپ کی راہ کون تکے گا۔ مجھے اپنے بچے کیسے دکھائی دیں گے۔''

تو ابا ہار مان کر وہیں ناشتا کرنے بیٹھ جاتے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ باہر سب کے لیے باس دی گریٹ ہیں۔ علی گڑھ سے پڑھے ہوئے امریکن پلٹ انجینئر ہیں لیکن ان کی سادہ طبیعت، اپنی بیوی کو مہارانی کا درجہ دے کر وہ اپنا آپ بھول گئے تھے۔ وہ امی سے بہت محبت کرتے تھے اور آج دونوں ہی نہیں ہیں۔''



'یہ میں کن باتوں میں اُلجھ گئی، میں نے گھبرا کر سوچا اور وہیں سے پلٹ گئی۔ میرا کمرا تو اوپر تھا لیکن وہاں جانے تک کیا ہوتا، اس سے بہتر تھا کہ میں گھر سے باہر چلی جاؤں۔

ابھی میں نے یہ سوچا ہی تھا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہیں اٹھائیں تو بڑے بھائی میرے سامنے تھے۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔ میری زبان حسبِ معمول ان کے آگے خاموش رہی۔

''اندر چلو، سب انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر لے آئے۔ میرے قدم رکھتے ہی لائٹس آن ہو گئیں۔ میں ساکت کھڑی رہ گئی۔

یہ سب کہاں سے آ گئے۔ ان لوگوں نے تو کب کا مجھے چھوڑ دیا تھا اور آج یہاں میری بہنیں، کزنز دوست ان سب کے بچے مل کر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے، جن پر قدم رکھ کر چلتے ہوئے میرا دل دکھ سے بوجھل ہو رہا تھا۔ کاش وہ صرف میرے لیے آئے ہوتے، جب مجھے ان کی ضرورت تھی۔ میں اکیلی تھی۔ قدم قدم پر مجھے ان سب کی طلب تھی، جب کوئی بھی نہیں آیا اور آج۔

''ارے فاریہ تم پر ساڑی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔''

''ہاں بھئی بہت گریس فل ہو گئی ہو۔'' تو میں نے حیرت سے اپنی بہنوں کی جانب دیکھا۔ بہنوں نے مجھ پر یہ لباس حرام کر دیا تھا۔ میں اپنے اندر سمٹ گئی۔

''فاریہ اب تم یہیں رہو گی نہ۔ ہم نے تمہارا کمرا سیٹ کر دیا ہے۔''

کسی نے پوچھا تو میرے دل میں کوئی بہت زور سے کرلایا میرے ماں باپ کا گھر سب نے مجھ پر حرام کر دیا تھا۔ میں تو صرف سونے کے لیے آتی تھی۔ میں تو 6 سال سے خالی کارپیٹ پر سو رہی تھی۔

''جی بالکل! ظاہر ہے مجھے کہاں جانا ہے۔'' میں نے سادہ سے انداز میں کہا۔

''اوہ تو پھر ڈرائنگ روم صحیح کرانا پڑے گا اور باہر کا کمرہ تو صاف کرنا پڑے گا۔ وہ تمہارے لیے اچھا آفس بن جائے گا۔'' بھائی نے کہا۔ شاید آج حیرتوں کا دن تھا۔ کیا لوگوں کی محبتیں حاصل کرنے کے لیے سچا ہونا ضروری نہیں بلکہ پاور اور پوزیشن ہونا ضروری ہے۔ میں اپنے اردگرد دیکھ کر سوچ رہی تھی، تب ہی میری نگاہ امی ابا کی تصویر کی جانب گئی اور میں اس تصویر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دیں۔ مجھے پتا ہے آپ کو اچھا نہیں لگا ہو گا میرا سیاست میں جانا لیکن پھر میں کیا کرتی۔ ایک اکیلے کمرے میں مر جاتی۔ اپنی کردار کشی برداشت کرتی رہتی۔ معاف کر دیں مجھے اللہ کے لیے کبھی کبھی دشمنوں سے لڑنے کے لیے تو کبھی اپنوں سے جیتنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔''

میں نے آنکھیں صاف کیں اور مڑ کر موبائل پر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''کریم صاحب آپ نے صدقے کا کھانا بھجوا دیا اور قبرستان گئے تھے آپ۔ ٹھیک ہے آپ نے بہت اچھا کیا۔

گاڑی کھڑی ہے میں بھی جاؤں گی آپ مدرسے کے بچوں کے ساتھ فاتحہ پڑھ لیجیے گا۔ میں چار دیواری کے باہر سے سلام کر لوں گی۔'' میں نے موبائل آف کیا اور باہر جانے کے لیے بڑھی۔

''قبرستان جا رہی ہیں دادا دادی کے پاس، میں بھی چلتا ہوں۔'' سمعان نے کہا تو میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اُف کتنے سال ہو گئے۔ میں ترس کے رہ گئی تھی کہ کوئی تو ہو جو میرے ماں باپ کی خبر مجھ تک لے آئے۔

کوئی تو انہیں یاد کرے اور آج میں نے چاروں طرف دیکھا تو سب جانے کے لیے تیار تھے۔

''یا اللہ یہ کیسی گھڑی ہے۔'' میں نے درد سے آنکھیں مسل ڈالیں اور بغیر کسی کی جانب دیکھے تیز قدموں سے باہر آ گئی۔

''فاریہ جانی رکیں نا میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔'' صوفی نے میرا ہاتھ تھاما۔ وہ امی کا دل تھی تو

میری جان۔
آپی کی بیٹی، جس کے سامنے کچھ بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ سارے بچے مجھے فاریہ جانی کہتے تھے۔ سمعان بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ تو مجھے اپنی دوست مانتا تھا پھر آج اتنے فاصلے کیسے ہوگئے۔ جب میں باہر آئی تو پارٹی کی گاڑی میرا انتظار کررہی تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔
''میں اپنی گاڑی میں جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔
''پولیس موبائل کو کریم صاحب روک دیں۔ ابھی مجھے کوئی نہیں مارے گا۔'' میں نے زخمی سے مسکراہٹ لیے کہا تو وہ خاموش ہوگئے۔ میں گاڑی میں بیٹھی تو صوفی نے میرے ہاتھ میں کچھ دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو وہ امی کا دوپٹا تھا جو میں نے سیف میں سنبھال کر رکھا تھا۔
''شکریہ صوی۔'' میں نے دوپٹے کا حجاب بنالیا۔ حسب معمول سب بچے میری ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ گاڑی رکی تو میں جیسے ہوش میں آگئی۔ مرد لوگ آگے چلے گئے تھے میں چار دیواری کے باہر کھڑی رہ گئی۔ دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو جان نہ پائی کہ مجھے کیا مانگنا چاہیے۔ وہ چاند صورتیں خاک میں مل گئیں تب میں کچھ بھی نہ کرپائی ان کے لیے، سوائے رونے کے تسلی دینے کے۔
''فاریہ کیسے رہے گی میرے بغیر۔'' امی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔
''میرے لیے اتنا درد نہیں اٹھاؤ، رہ لوں گی میں۔''
تم میرے ابا کی مہارانی ہو اور میں تمہیں مجبور نہیں دیکھ سکتی۔ بھول جاؤ فاریہ اکیلی ہے۔ تمہاری دعائیں اس کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔'' میں نے دیوانوں کی طرح سے امی کو چوم ڈالا اور پھر میری ماں سوگئی۔ گہری نیند۔
وہ رات کیسے بھول جاؤں جب زندگی کی سانس رک رہی تھی اور میں گھر میں بیٹھی انتظار کررہی تھی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ بھی نہیں اٹھائے تھے اور پھر صبح کی اذان ہوئی تو مجھے الہام ہوگیا۔ میری ماں چلی گئی ہے۔ میں نے دیوانوں کی طرح سے سڑک پر دوڑ لگائی تھی، اردگرد کی پروا کیے بغیر۔ میرا ملازم ساتھ آرہا تھا اور جب میں پہنچی تو وہ آنکھیں بند کرچکی تھیں۔ بڑے بھائی کا کندھا مجھے اس دن پہلی اور آخری بار نصیب ہوا، اس کے بعد پتا نہیں سارے رشتے کہاں کھوگئے۔
مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے ظاہر ہے سب کے سامنے ان کی اپنی زندگی تھی۔ میں نے تو خود اکیلے رہنا کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں کسی کا کیا قصور تھا۔ میں گرنے لگی تو صوی نے میرا بازو تھام لیا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے لیکن میں معافی نہیں مانگ رہی تھی۔
''صوی اسے اٹھاؤ۔'' گڑیا اسے روکو۔
''فاریہ اٹھ جاؤ وہ لوگ واپس آرہے ہیں۔'' مختلف آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میں نے سامنے دیکھا تو سب واپس آرہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے سہارا دینے کے لیے کسی نے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے جھٹک دیا۔
''مجھے سہاروں کی عادت نہیں رہی ہے۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی جانب مڑگئی۔
''فاریہ ہوش میں رہو۔'' رملہ نے کہا تو میں نے جواب نہیں دیا۔
''یہ تم کہہ رہی ہو، ہوش گم ہوئے تو سات سال گزر گئے اب کیا ہوش میں لاؤ گی۔'' میں زہر بجھے لہجے میں بولی۔
''تمہاری اسی من مانی نے تمہیں اس مقام پر کھڑا کیا ہے۔ افسوس تمہیں ذرا سا بھی پچھتاوا نہیں۔'' رملہ نے کہا۔
''کس مقام پر..... منسٹر قومی اسمبلی فوریہ جمال کی جگہ پر یا ان بربادیوں پر جو میرے اپنوں نے دیں مجھے۔'' میں نے ساڑی سے گرد جھاڑی اور امی کا دوپٹا ہاتھ میں لیا۔
''بربادی تمہاری ماں نے کی تھی، ہم نے نہیں۔ پوچھو اپنی ماں سے، آخر کیا سوچ کر تمہارا فیصلہ کیا

تھا۔'' رملہ نے بولا۔

'' رملہ خاموش ہو جاؤ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' آپی نے اسے روکا۔

'' کہنے دو آپی! وہ میری ہی ماں تھیں' اس کی نہیں، تبھی تو یہ تمہاری ماں کہہ رہی ہے۔ خیر میں بس یہیں ہوں اور تم بھی چلو چل کر یہ سوال ان ہی سے کر لیتے ہیں کہ فیصلہ تو ان کا تھا' ساتھ تم نے کیوں دیا۔'' میں نے قدم آگے بڑھائے۔

'' فاریہ جانو رکیں پلیز۔'' صومی اور گڑیا نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ آپی اور بھابی پہلے ہی رملہ کو لے جا چکے تھے۔

'' فاریہ جانی آج تو ہم کو بھی بھول گئیں۔'' مہوش سونیا میرے سامنے آئیں تو میرے قدم واپس بڑھ گئے۔

'' الوداع امی ابا پتا نہیں اب آپ کی بیٹی کس انداز میں اور کب آپ کے پاس آئے گی لیکن وہ آپ کو بھولے گی نہیں۔'' میں نے سوچا اور گاڑی میں آ بیٹھی۔

'' میڈم پارٹی سے کافی کالز آ چکی ہیں آپ کو فوری جانا پڑے گا۔'' کریم صاحب نے اس کی گاڑی کی کھڑکی سے کہا۔

'' ٹھیک ہے کریم صاحب پندرہ منٹ کی مہلت دے دیں پھر چلتی ہوں۔'' اس نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب چلے گئے اور میں دوسری طرف آ گئی۔ سارے بچے اس میں بیٹھے تھے۔ چاروں لڑکے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں گڑیا، صومی اور سونیا پیچھے بیٹھے تھے۔

'' فاریہ جانی آپ خوش ہیں نا۔'' اویس گیلانی نے مجھے مڑ کر دیکھا۔ میرا سب سے بڑا بھانجا جس سے میں بے حد پیار کرتی تھی۔

'' ہاں کیوں نہیں تم لوگوں کا ساتھ ہو تو خوشی بہت چھوٹی ہو جاتی ہے۔'' میں نے ہنس کر اپنے سیدھے ہاتھ میں پڑی رنگ کو گھمایا جو ڈائمنڈ کے نازک نگینوں سے مزین تھی یہ واحد چیز تھی جو میں نے پہنی ہوئی تھی۔

'' فاریہ پیسے نہیں مل رہے تو یہ میری رنگ بیچ دے۔'' امی کی آواز آئی۔

'' پیسے ہیں میرے پاس آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔'' میں نے بمشکل آنسو ضبط کیے اپنا سیٹ بیچا اور 60 ہزار روپے لا کر امی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

'' کہاں سے آئے ہیں یہ۔'' انہوں نے وحشت زدہ چہرے سے میری جانب دیکھا۔

'' ارے امی کسی سے لیے ہیں۔'' میں نے آنکھیں چرائیں۔

'' ایسے کب تک مجھے زندہ رکھے گی۔ کہیں سے زہر کا انجکشن لے آ۔ وہ لگا دے مجھے۔ میں مر جاؤں گی تو تیری جان بھی چھوٹ جائے گی۔''

'' نہ امی! آپ تو ہماری راجکماری ہیں۔ پہلے ابا نے مہارانی بنا کر رکھا تو اب میں رکھوں گی جب تک میں رکھ سکتی ہوں۔'' میں نے ان کے سینے پر سر رکھا۔ تب ہی گاڑی ایک جھٹکے سے گیٹ پر رکی تو میں ماضی سے باہر آ گئی۔ دروازہ کھول کر اتری تو کتنے ہی لوگ میرے منتظر تھے۔

'' فاریہ باجی آ گئیں۔'' مختلف آوازیں میرے کانوں میں پڑیں تو میں رک کر ان کی جانب آ گئی۔ سکیورٹی الرٹ ہو گئی۔

'' فاریہ باجی یہ پھول آپ کے لیے۔'' لڑکوں کے غول میں سے ایک نے میرے ہاتھ میں ٹیوب روز دیے، پھر میرا گلا پھولوں کے ہاروں سے بھرتا چلا گیا۔

'' آپ سب کی محبتوں کا بہت شکریہ۔'' میں نے ان میں سے ہی ایک ننھی بچی کو گود میں اٹھا کر ہاتھ ہلایا۔ میڈیا کی لائٹس چمک رہی تھیں نوجوان طبقہ میرے قریب آ گیا۔

'' فاریہ باجی کہیں آپ ہمیں بھول تو نہیں جائیں گی۔'' 18 بیس سال کا نوجوان میرے سامنے آیا۔

'' ہرگز نہیں اگر تم لوگ میرے لیے محنت نہ کرتے تو فاریہ باجی کہاں ہوتی۔ میں کوئی وعدہ کوئی بات نہیں بھولی ہوں۔'' مجھے سکیورٹی آہستہ آہستہ اندر جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

''فاریہ باجی اسے گود سے اُتار دیں آپ کے کپڑے خراب ہوجائیں گے۔'' کوئی میرے قریب آیا۔ وہ میری ماسی تھی۔

''چپ کرو تم! بیٹا بھوک لگی ہے آپ کو۔'' میں اس بچی سے پوچھ رہی تھی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ماسی کی گود میں اسے دیا۔

''اندر جاؤ اور کھانا کھلاؤ۔ مگر وہ بھابی.....'' وہ تو کچھ کہنا چاہتی تھی میں نے اسے آنکھوں کی زبان سے خاموش کرا دیا۔

''جاؤ اندر میں آتی ہوں۔'' تو وہ اندر چلی گئی۔ مہمان اویس گیلانی' سمعان' اور فہد گیلانی میرے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔

''میرے عزیز از جان بیٹے بیٹیاں خوشی خوشی اور احتیاط کے ساتھ گھر لوٹ جائیں۔ آپ کی فاریہ باجی دو دن بعد آپ کے روبرو ہوں گی۔ تب میں آپ سب کے مسائل حل کرنے کی بھرپور کوشش کروں گی، ورنہ اپنی مدد آپ کے تحت روزگار ملے تو ملے ورنہ ہاتھ پاؤں تو سلامت ہیں اور اس جنگ میں آپ اکیلے نہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ گھر آباد رکھے اور زندگی کی خوشیوں سے آپ کا دامن بھر جائے۔ آیئے مل کر بولیں۔

'پاکستان ہے تو ہم ہیں، ہم ہیں تو پاکستان ہے۔''

اور ان آوازوں میں چاروں لڑکوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں تو لوگوں کا ہجوم تھا جو بڑھتا جارہا تھا۔ میرے کسی فیملی فرد کو اندر آنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی تب میں اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔ کریم صاحب بھاگتے ہوئے آئے۔'' میں آرہی ہوں لوگوں کو آرام سے جانے دیں اور دیکھیں میرے فیملی ممبرز کو جگہ نہیں مل رہی۔

سکیورٹی والوں کو بتادیں وہ کوئی دشمن نہیں میرے بہن بھائی ہیں۔'' میں دھیمے سے انداز میں مسکرائی بھلا ان سے بڑھ کر مجھ سے دشمنی کون نبھا سکتا تھا۔

''فاریہ جانی سب لوگ کیسے آپ پر نثار ہورہے تھے۔'' سمعان نے کہا۔

''اور تم سمعان۔'' میں نے اسے دیکھا تو وہ آنکھیں چرانے لگا۔

''اچھا جواب میں روم میں جاکر ڈریس تبدیل کرلوں تب تک ذرا اپنے ممی پاپا وغیرہ کو دیکھو۔ وہ لوگ اندر آگئے ہیں۔'' میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا تو وہ چاروں دائیں مڑ گئے میں اپنے کمرے میں آگئی۔

☆☆......☆☆

درد تو گہرا ہے، مگر اسے جاننے میں
صدیاں لگ جائیں گی اس زمانے کو

شاور لے کر میں نے وائٹ نیٹ کی ساڑی نکالی۔ فل آستین کا بلاؤز پہن کر شال اٹھائی جوامی کی تھی۔ وائٹ ڈبل جارجٹ کی شال جس کے چاروں طرف بلیک اور وائٹ موتیوں کا چوڑا بارڈر بنا ہوا تھا۔ کہیں کہیں موتی بھی چھلک رہے تھے۔

''کتنا جھگڑنے کے بعد یہ شال مجھے ملی تھی جو میں نے سنبھال کر رکھی تھی، پرفیوم اسپرے کرکے نیچرل کلر کی لپ اسٹک لگائی اور اپنے لمبے بال سلجھا کر فارغ ہوگئی۔ میں جانے لگی تو مجھے یاد آیا میں کچھ بھول رہی ہوں۔ میں نے پرس اٹھایا اس میں موبائل کے ساتھ امی ابا کی تصویر رکھی تھی۔

نازک سی سینڈل نکال کر پہنی تو مجھے لگا جیسے یہ میں نہیں ہوں یہ تو ان دونوں کی پرچھائیں ہے جو مجھے خوبصورت بنارہی ہے۔ شال کو میں نے پن اپ کرکے اپنے آپ کو کورڈ کرلیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر نیچے آئی تو موبائل بج اٹھا۔

''جی سر میں دراصل آتے ہی قبرستان چلی گئی تھی۔ میرے ماں باپ کو بھی تو حق ہے جاننے کا میرے بارے میں۔ ان سے ملے بغیر اجازت کے بنا تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی اور آپ کو میری فکر لگ گئی۔'' میں ہولے سے مسکرائی۔

''اچھا بس اب جہان عالم آپ کال بند کریں یہاں میرے دیرینہ چاہنے والے آئے ہوئے ہیں۔'' میں سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

''پلیز اپنا خیال رکھنا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''آپ فکر نہ کریں میں مروں گی نہیں۔''
''اچھا بابا بکواس بند کر رہی ہوں اور آپ زیادہ غصے میں نہ آئیں او کے، پھر بات کرتی ہوں۔'' میں نے موبائل آف کیا اور سیڑھیاں اُتر کر ڈرائنگ روم کی جانب آ گئی۔
سب لوگ وہیں بیٹھے تھے جن میں چچی جان بھی شامل تھیں۔
''ارے آپ! میں خود آتی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''یہ تم نے ساڑی کب سے باندھنی شروع کر دی۔'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
''ارے مجھے ایک ساڑی باندھنے کا لائسنس ہی تو ملا ہے۔'' میں نزاکت سے ہنس دی تب ہی موبائل بج اٹھا۔ میں ایک دم الرٹ ہوگئی۔
''پھر ملیں گے بلکہ میں خود آؤں گی۔ ابھی تو مجھے بے حد ارجنٹ جانا ہے۔'' میں الوداعی گلے ملی اور بڑے بھائی کے قریب آ کر رُک گئی بھائی ہوسکتا ہے دیر ہو جائے ویسے ہی میرے اوپر اتنے الزامات لگ چکے ہیں کہ کسی نئے الزام سے آپ کو فرق نہیں پڑے گا اگر آپ کا دل دکھا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' میں نے بے حد آہستگی سے کہا ان کا چہرہ سفید پڑ گیا اور میں باہر نکل آئی۔
''ارے یہ تو سڑکوں پر پھرنے والی لڑکیاں ہیں۔ میں نے خود سڑک پر کھڑے دیکھا ہے۔'' ممانی اور بھابی کے تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونجے کاش کے بڑے بھائی، جان سکتے رات کے دو بجے باہر کھڑا ہونا میری مجبوری تھی کیونکہ میری امی 4 بجے نیچے گر گئی تھیں اور میں انہیں اکیلے اُٹھا نہیں پا رہی تھی۔
سب کے گھر ٹیلیفون کر لیے مگر کوئی بھی نہ تھا تب ہی ایک موٹر سائیکل سوار رُک گیا۔ وہ اندر آیا ہی تھا کہ ممانی کا نوکر آ چکا لیکن میں اور وہ امی کو اُٹھا کر بیڈ پر لٹا چکے تھے امی کی آنکھیں جو مجھ سے التجا کر رہی تھیں۔
''مار دے مجھے۔'' اور میں آنکھیں چرائے پھر رہی تھی گھر کے دروازے بند کر کے میں اندر آئی تو اس شخص کو باہر نکلتے دیکھ کر بڑے بھائی پتا نہیں کیا سمجھے۔ وہ نوابشاہ سے آ رہے تھے امی کے قریب آئے تو پوچھا کچھ نہیں۔ امی نے ڈر کے مارے میری قمیض پکڑ لی۔ میں نے جو سمجھ میں آیا کہہ ڈالا۔ اب نہ جانے انہیں یقین آیا یا نہیں لیکن نہیں آیا ہوگا آخر ممانی کا ملازم بھی تو تھا میں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے سوچ لیا اور امی کے کمرے میں ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر سو گئی۔
''فاریہ جانی جلدی آیئے گا ہم آپ کا انتظار کریں گے۔'' سارے بچے باہر بیٹھے تھے تو میں مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کریم صاحب نے پارٹی کی گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ آگے پیچھے موبائلز تھیں۔ کریم صاحب سیٹ پر بیٹھے تھے۔
''کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟'' انہوں نے پوچھا۔
''پتا نہیں کریم صاحب ابھی تو شروعات ہے دیکھنا یہ ہے کہ میں زندگی سے ہارتی ہوں یا عزت سے جیتی ہوں۔'' میں نے مدہم سے لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہوگئے۔ سرکٹ ہاؤس جگمگا رہا تھا۔ گاڑی سامنے رُکی میں گاڑی سے اتری اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھے پنڈال کی جانب جانے لگی۔
''مس فاریہ جمال بہت مبارک ہو۔'' بہت ساری آوازیں آنے لگیں جو میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں سر ہلاتی آگے بڑھی جہاں راج احمد میرا انتظار کر رہے تھے۔
''Looking Beautiful'' ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
''آپ بھی نہ بس..... موقع دیکھتے ہیں نہ محل اور بس بے جا تعریف کرنے لگتے ہیں۔'' میں نے جبراً مسکرا کر کہا۔
''آؤ میں تمہیں باقی لوگوں سے ملواؤں۔'' انہوں نے کہا تو ان کے پیچھے کسی معمول کی طرح چل پڑی۔ وہ پتا نہیں مجھے کن کن لوگوں سے ملواتے

رہے۔ چونکی تو میں اس وقت جب شاہ بخت کا نام میرے کانوں میں گونجا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو سامنے دیکھا تو وہ کھڑا مسکرا رہا تھا وہ۔

''تمہیں سیاست میں دیکھ کر اچھا لگا۔'' وہ بولا میں نے مدد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''تم اتنی ہی شریف اور معصوم ہو جتنی دکھائی دیتی ہو یا پھر......'' یہی الفاظ مجھے اب تک یاد تھے۔

''کمشنر صاحب کیسے ہیں آپ؟'' میں نے مڑ کر اپنی توجہ ہٹالی۔

''مس فاریہ جمال آپ کے جیتنے کی مجھے بے حد خوشی ہے۔ کم از کم اچھا سوچ اور دماغ رکھنے والے لوگ آئیں گے تو یہ ملک بچے گا۔'' کمشنر صاحب نے کہا۔

''بالکل سر میں بھی وطن کی خاطر مرنے مارنے کے لیے آئی ہوں۔'' فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔

''ایک عورت کچھ نہیں کرسکتی یہ ہم بھی جانتے ہیں اور آپ......'' شاہ بخت درمیان میں بولا۔

''معاف کیجیے گا میں اس وقت اس موضوع پر آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا جواب میں زبان سے نہیں اپنے عمل سے دوں گی۔'' میں نے دھیمے سے انداز میں مسکرا کر کہا اور کمشنر صاحب کے ساتھ پارٹی چیئرمین کے پاس چلی گئی۔ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھی اور پھر گھر جانے کی اجازت لے کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''حلف برداری کے بعد پتا لگے گا کہ پارٹی کس کو کیا قیادت دیتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ارے سر پارٹی کچھ بھی نہیں دے، ہم تو خیر خواہوں میں شامل ہیں اور کام کرنے کے لیے عمل کی اور لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو میں کروا سکتی ہوں۔'' میں جانتی تھی میرے چہرے کی قاتل مسکراہٹ کتنے لوگوں کو تڑپا رہی ہے، اس سے پہلے کہ میں ان کے نرغے میں پھنستی میں باہر نکل آئی۔

''کریم صاحب گاڑی گیٹ پر لگوائیں میں آرہی ہوں۔'' میں نے موبائل پر کہا۔ میرا توازن بگڑ گیا تب میں نے کرسی کا سہارا لیا۔

''سنبھل کے بیٹھو۔ کہو تو چھوڑ آؤں۔'' احمد راج نے کہا۔

''خبردار ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔

''کچھ دن گزرنے تو دو پھر میں بتاؤں گی شریف اور معصوم لڑکیوں کو نیلامی کے بازار میں کھڑا کرنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔''

تب ہی میری نگاہ اس کی گاڑی سے ٹیک لگائے شاہ بخت پر پڑ گئی۔ ایک منٹ کے لیے گاڑی رُک گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا۔

''خوش فہمی کا شکار مت ہو کہ میں یہاں تمہیں دیکھنے کے لیے رُکی ہوں۔ میں تو شاہ بخت کا ڈرائیور دیکھ رہی تھی ویسے Choice واقعی بہت اچھی ہے۔ داد دینی پڑے گی۔'' میں واپس مڑی وہ دم بخود کھڑا تھا۔

''ہاں کوئی کام ہو تو بتانا، ویسے شاہ بخت تمہارے بھائی نے اچھا نہیں کیا تمہارے ساتھ۔ کیا اب بھی بھائی کا پیار باقی ہے۔'' میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''کون تھا یہ میڈم جی!'' کریم صاحب نے پوچھا۔

''میرا کلاس فیلو اور شاہ بخت کا بھائی۔'' میں نے جواب دیا۔

''آئندہ آپ ان لوگوں سے نہیں ملیں گی۔ کوئی بات میڈیا پر آگئی تو آپ کا کیریئر بننے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔'' کریم صاحب نے بڑے شفیق انداز میں کہا۔

''جانتی ہوں مگر کیا کروں کریم صاحب اندر کے زخم کھرچ رہے ہیں۔ خون تو بہے گا ہی اور آپ تو سب جانتے ہیں کیسے کیسے میری زندگی کو تباہ کیا سب نے مل کر۔ یاد رہے نہ، میں آپ کے پاس پیسے مانگنے آئی تھی، آپ گھبرا کر رہ گئے تھے۔ آپ کے دیے ہوئے تین ہزار کی بلڈ ڈرپ لگوائی تھی میں نے امی کے، اور وہ سہہ نہیں پائیں۔ شاید انہیں پتا لگ گیا تھا کہ ان کی بیٹی کے پاس اب فروخت کرنے کے لیے

کچھ باقی نہیں رہا تو انہوں نے اپنی سانسیں ہار دیں۔ یاد ہے نہ کریم صاحب۔ مجھے ہوش نہیں تھا۔ سب لوگ کتنے دور تھے کراچی، آپی لندن، بڑے بھائی سنگاپور اور ماموں اسلام آباد میں بالکل اکیلی تھی۔ میرے پاس ممانی، بھابی اور میری دوست مدحت تھی اور پھر جب رملہ آئی تو گھر آنے کے لیے کھڑی ہوگئی تھی تب میں اسے بخشا نہیں تھا میں نے ارے فاریہ تم نے دیکھا رملہ اور مدحت یٰسین شریف پڑھ رہی تھیں تم تو ڈرتی نہیں نہ اچھا ہے ان کی مشکل آسان ہوگی۔'' میں اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی کوشش کررہی تھی۔

''وہ جو چاہے کریں میں گھر جارہی ہوں۔'' میں نے بمشکل کہا تب ہی جاتے ہوئے میں نے امی کو پیار کیا۔ ان کی پوری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کتنی حسرت تھی اُن آنکھوں میں، بھائی وان کے لبوں سے نکلا۔

''ہاں امی سب آرہے ہیں۔ سب کو آپ کی طلب ہے اور مجھے تو آپ بہت پیاری لگتی ہیں۔'' میں نے اُن کے ماتھے پر پیار کیا انہوں نے پھر کہا تو ان کو زندگی بھر خدمت کرنے والی رانی اُٹھ آؤں۔'' باجی وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ ان کے سامنے نہ آئیں ورنہ وہ جانہیں پائیں گے۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم۔'' میں نے حیران ہوکر کہا تو امی کی آنکھوں میں التجا دکھائی دی۔

''ہاں اگر یہ ذرہ پوری ہونے تک صحیح رہا تو اُمید ہے ورنہ......'' میں گردن ہلاتی باہر آگئی۔

''مدحت میرا ہاتھ تھام کر آؤ تمہیں معلوم ہے بھابی اور ممانی کیا کہہ رہی ہیں کہ امی کو آواز کیسی ہوگئی ہے۔''

''اچھا ہے نہیں بول پارہیں ورنہ پتا نہیں کیا کہہ جاتیں۔'' میں تڑپ گئی وہ اپنے شوہر کے ساتھ مجھے گھر چھوڑ کر واپس ہوسٹل چلی گئی۔ ''بھولی نہیں ہوں کریم صاحب اس رات کا درد اور نہ ہی بھولوں گی۔'' میں نے آہستہ آواز میں کہا تو وہ کچھ پریشان ہوگئے۔

''اتنا اسٹریس نہ لیں آپ فکر نہیں کریں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

بڑے سے لان میں سب میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

''فاریہ جانی آگئیں۔'' صوبی اور گڑیا دوڑتی آئیں میرا ہاتھ تھام کر سب کے قریب لے آئیں۔ میں بچوں میں بیٹھنے لگی۔

''ارے بھئی اِدھر آکر بیٹھو۔'' بڑے بھائی نے اپنے قریب کرسی پر اشارہ کیا تو میں سر جھکا کر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

''چائے پیو گی۔'' بھابی نے پوچھا میں نے سر ہلادیا اور پھر سب چائے پینے لگے۔

''اور فاریہ جانی حلف برداری کے لیے آپ کل جائیں گی۔ کیا پہن کر جائیں گی اور ہاں سب سے پہلا فون آپ کیسے کریں گی۔ ہم انتظار کریں گے۔'' اویس گیلانی نے مجھے مشکل میں ڈالا۔

''میں موبائل ہی نہیں لے جاؤں گی۔ اور کپڑے تو تم لوگ بتاؤ۔'' میں نے ہنس کر کہا تو ایک بڑا سا پیکٹ میری گود میں رکھ دیا۔ سارے بچے میرے گرد گرد اس پر آبیٹھے۔

''پتا ہے یہ ماما اور پاپا جان نے خاص طور پر آپ کے لیے لیا ہے۔'' سمعان نے کہا۔

''اور یہ میری اور تمہارے بہنوئی کی طرف سے۔'' رملہ نے بھی ایک پیکٹ میں میری گود میں رکھا۔

''سب دے چکے تو اب یہ ہماری طرف سے اپنی بہن کے لیے۔'' آپی کے Husband نے کہا تو میں بوکھلا گئی۔

''مجھے ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب واپس لے لیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''کیسے نہیں لوگی تم چلو شاباش انکار نہیں کرو۔'' انہوں نے کہا۔

''ہاں فاریہ جانی کھول کر تو دیکھیں آپ کی آنکھیں چکا چوند ہوجائیں گی۔'' سونیا نے میرے گلے میں ہاتھ ڈالا۔

چکا چوند میں تو بھربھری ریت کی مانند گرتی جارہی ہوں۔ ''یا اللہ میں رونا نہیں چاہتی مجھے حوصلہ دے۔''

میں نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''پلیز فاریہ جانی، بڑا والا پیکٹ۔'' سمعان نے کہا باقی سب لوگ اپنے اپنے پیکٹ سنبھال کر بیٹھ گئے تھے تب ہی موبائل بج اٹھا میں نے اٹھایا۔

''مبارک ہو بھئی۔'' چھوٹی ممانی کا فون تھا۔

''بہت شکریہ۔'' بات کر کے انہوں نے پوچھا۔

''بعد میں کرلوں گی ابھی میں تھوڑا سا بزی ہوں۔ میری طرف سے اسے پیار دیجیے گا۔'' میں نے موبائل آف کردیا۔ شاید آج انہونیوں کا دن تھا، پیکٹ کھول کر دیکھا تھا تو اس میں بے حد نفیس ساڑی رکھی تھی جس کے ساتھ میچنگ شال تھی جس کے بارڈر پر سفید نگوں کا کام تھا۔

''کیسا ہے۔''

''بہت اچھا۔'' میں نے بڑے بھائی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ڈر بھی کیا چیز ہے جو اپنوں سے بھی بس دور کر دیتا ہے۔

''اب یہ والا پیکٹ گڑیا نے رملہ کا پیکٹ میرے سامنے کردیا تو اس میں وائٹ گولڈ کی گھڑی اور چھوٹا سا بروچ تھا۔

آپی کا پیکٹ کھولا تو اس میں میرے لیے ایک لاکھ روپے رکھے تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے سب کچھ واپس کرنا چاہا تو اویس اور صوی شہوار میرے اطراف میں آبیٹھے۔

''ارے واہ فاریہ جانی کے تو مزے آگئے۔ فاریہ جانی یہ ساڑی اور بروج آپ پر بہت جچے گی اور ہاں ان پیسوں سے آپ ہمارے لیے گفٹ خریدو گی بھئی واہ ابو، ماموں آپ لوگوں نے تو دل خوش کردیا بے چاری فاریہ جانی نیچے کارپیٹ پر سو رہی تھیں اب ہم ان کے لیے ایک نیا بیڈ لے آئیں گے۔'' پتا نہیں وہ آگے کیا کہتے۔

''خاموش کرو تم لوگ۔ ہر وقت زبان چلتی رہتی ہے۔'' میں نے اپنا غصہ اُن پر اتارا۔

''فاریہ جانی میں بہت ساری آئس کریم کیسے دوں گی۔'' چھوٹی سونیا نے کہا تو میں ہنس دی۔

''آپ سب لوگوں کا بہت شکریہ۔'' میں نے کہا اور اپنا موبائل آن کرلیا پھر تو اتر سے موبائل بجنے لگا لیکن میں سب کچھ چھوڑ کر بچوں کی باتیں سن رہی تھی۔ چاند اپنا سفر طے کررہا تھا تب ہی میری نگاہ صحن کے ساتھ کھڑے پلنگ پر گئی جو ای کا تھا آخری بار وہی پلنگ میرے ماں باپ کی پناہ گاہ بنا تھا۔

''رملہ یہ پلنگ باہر پڑا ہے۔''

''اچھا لیکن تم ٹھہرو میں کسی کو کہتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''یہ تو باہر اس لیے رکھا ہے کہ جلدی سے بنوائی شروع ہوجائے۔ جب تم آؤ گی تو صحیح ہوچکا ہوگا بھائی نے کہا تو میں خاموش ہوگئی تب ہی ڈور بیل بجی۔ سمعان نے اُٹھ کر انٹر کام اٹھایا پھر ایک دم باہر چلا گیا۔ سب لوگ گھاس پر بیٹھے فنگر چپس کھا رہے تھے۔ پورا لان روشن تھا تب ہی سمعان واپس آیا۔

''فاریہ جانی میرے دوست آئے ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا کہ آپ میری پھوپو ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم نے تو کبھی انہیں دیکھا ہی نہیں اور تم کہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ رہتی ہیں۔'' سمعان کچھ شرمندہ تھا۔

''ارے تو بھئی انہیں اندر بلالو پھر تو یقین آجائے گا مگر پہلے لان کی لائٹس آف کرواؤ۔'' میں نے درزیدہ نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔

''ہاں بھئی یہ لوگ تو انہیں گی نہیں صحیح کہہ رہی ہے فاریہ۔'' بھائی نے بھی تائید کی۔ لائٹس آف ہوئیں تو صوی، شہوار، گڑیا اور سونیا نے دل بھر کر انہیں کوسا۔ میں اُٹھ کر گیٹ کے اندر بنی روش پر آگئی۔ سارے لڑکے اندر آگئے تھے۔ میرے ساتھ سمعان کھڑا تھا، اویس، شان اور فہد بھی آگئے تھے۔

''السلام وعلیکم! دراصل ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ سمعان نے بتایا نہیں تو ہم مذاق سمجھے۔'' ان میں ایک لڑکا بولا۔

''آپ فہد ہونہ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کیسے جانتی ہیں۔'' وہ حیران ہو سب کو جانتی ہوں اور بھئی تمہاری فلک کیسی ہے۔'' میں نے شائل کو دیکھا تو وہ اچھل ہی تو گیا۔

''آپ کو یہ بھی پتا ہے۔''

''اچھا خیر بچوں تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی آتے رہنا۔'' میں نے باری باری سب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اب شاباش گھر جاؤ بہت رات ہوگئی ہے۔ ماں باپ کو پریشان نہیں کرتے۔'' میں نے کہا وہ جانے کے لیے مڑ گئے۔

''ارے یہ سمعان کی پھوپو کتنی گریس فل ہیں۔ واقعی جادو ہے اور اس نے ہمیں کبھی بتایا نہیں۔'' ان کی سرگوشیاں بھی واپس مڑ گئیں۔

''آخر فاریہ جانی کس کی ہیں۔'' اویس گیلانی نے اپنے کالر کھڑے کیے تو میں ہنستی چلی گئی۔ ایسی ہنسی جو میں نے نہ جانے کب سے اپنے اندر گھونٹ رکھی تھی۔

☆☆......☆☆☆

لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ ''فاریہ جانی کتنے بور دوست ہیں نہ اس کے۔'' گڑیا نے کہا۔ ''آپ میری دوستوں سے ملیے گا پھر بڑا مزا آئے گا۔''

''آپ ڈر کر بھاگ جائیں گی۔'' سمعان نے کہا تو سب ہنس پڑے۔

''اسے تنگ نہیں کرو۔'' اتنے میں دوبارہ چائے آئی۔ ''میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔'' میں نے اجازت چاہی اور اوپر کمرے میں آگئی۔ شاور لے کر ڈریس چینج کیا اور نیچے آگئی۔

''یہ کیا پہن لیا۔'' سارے بچے چیخ پڑے۔

''ارے نئے گھر میں سب چلتا ہے۔'' میں نے موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہوگئے۔

''فاریہ میرا خیال ہے اب تمہیں سو جانا چاہیے کل صبح کی فلائٹ ہے۔ تم تھک جاؤ گی۔'' بڑے بھائی نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' یہ کہہ کر میں نے کریم صاحب کو اندر بلوالیا۔

''کتنے بجے کی فلائٹ ہے۔''

''صبح چھ بجے کی۔ سب لوگ وہیں اکٹھے ہوں گے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں چار بجے تیار ہو جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ابھی تو تین بجے ہیں آپ سوئیں گی کب؟'' بچے چیخے۔

''آدھا گھنٹہ بھی بہت ہے میرے لیے اور ہاں کریم صاحب یہ میری فیملی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب بھی آپ کو اپنی فیملی سمجھیں گے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں یہ سب کچھ نہیں کر پاتی۔ آپ نے ابا کے دوست ہونے کا حق ادا کر دیا۔'' میری بات سن کر وہ جھلملاتی آنکھیں لیے باہر چلے گئے۔ میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کے لیے بڑھی تو ایک دم کچھ خیال آنے پر رُک گئی۔

''مجھے آپ لوگوں سے ایک ہی بات کہنا ہے مجھے معاف کر دیں ان تمام گناہوں کے لیے جو میں نے کیے یا نہیں کیے۔'' میں نے کہا اور تیز قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ بند کر کے میں آنکھیں بند کر کے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ کئی خیالات تھے جو دل و دماغ میں گھوم رہے تھے کہ جہاں عالم کی کال آگئی۔

''کیسا لگ رہا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ اس کے اشارے پر تو حکومتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ وہ بزنس ٹائیکون تھا۔

''کل تمہارے لیے میں نئی گاڑی بھیج رہا ہوں۔ تم اس میں آؤ گی۔''

''لیکن......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' اس نے کہا اور کال آف کر دی۔ پتا نہیں جہاں عالم کو بھی مجھ سے ہی ٹکرانا تھا۔ میں اس دن کو یاد کر رہی تھی جب میں نے طیش کے عالم میں دروازہ کھولا تھا اور ایس ایس پی سے لیلیٰ کے لیے جھگڑی تھی کہ آخر اس کو ابھی تک لڑکے کیوں

تنگ کر رہے ہیں۔ کیا وہ روزگار کے لیے گھر سے باہر نکلے یا ان لوٹوں کے ہاتھوں بک جائے۔'' وہ کیا کہتا رہا میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ میں نے جو کہنا تھا وہ میں کہہ کر باہر آ گئی تب میں نے اپنے ساتھ چلتے کسی کو دیکھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بجائے تیز چلنا شروع کر دیا۔

''سنیں آپ کیا ایسے ہی جیٹ طیارے کی طرح سے چلتی ہیں بندہ رُک کر کہیں سانس لے لیتا ہے۔'' کسی نے کہا تو میں رُک گئی۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔'' میں نے فائل کے گرد ہاتھ باندھے وہ جو کوئی بھی تھا اچھا خاصا دوسروں کو ہلانے کی اہلیت رکھتا تھا۔

''آپ کسی لڑکی کا ذکر کر رہی تھیں۔ آپ فکر نہ کریں میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ آپ کو یہاں آنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔'' اس شخص نے کہا۔

''اچھا بہت شکریہ۔'' میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور سیڑھیاں اُترنی شروع کر دیں۔ اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا مگر وہ کوئی توجہ دیے بنا میرے ساتھ چل رہا تھا۔

''ریلیکس اس طرح سے آفس کے چکر نہیں لگانے چاہئیں۔ وہ بھی آپ جیسی خوبصورت لڑکیوں کو۔''

''اوہ تو آپ بھی بھیڑیوں کی قوم سے نکلے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہوش میں ہیں آپ۔'' اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

''تو پھر کیا کہوں۔ مجھے بھی گھومنے کا شوق نہیں ہے لیکن اگر کسی کے لیے میرا بولنا، میری فیملی کا حوالہ کام آ جائے تو میں پیچھے سے ہٹ جاؤں۔ یہ تو آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو فائدہ نقصان سوچ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔'' میں نے آخری سیڑھی پر پیر رکھا اور باہر آ گئی۔

ایک نوکری اور پھر رکشہ نہ ملے تو مزے ہی آ جاتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے دیر ہو گئی تھی۔

''ابھی تو مجھے ہوسٹل جانا ہے جس کی میں انچارج ہوں۔ اوہ گوڈ! بہت دیر ہو گئی ہے۔'' میں نے متلاشی نگاہیں سڑک پر دوڑائیں تو لینڈ کروزر میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی شیشہ نیچے ہوا۔

''آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں جواب دیے بنا دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''تو پھر پیچھے جو گاڑی کھڑی ہے اس میں بیٹھ جائیں وہ لوگ آپ کو بحفاظت چھوڑ آئیں گے۔''

''آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ ایسی ہزاروں گاڑیاں میں نے دیکھی ہیں۔ آج میں سڑک پر کھڑی ہوں تو ساری زندگی یہی مقدر نہیں بنے گا میرا۔'' میں تڑخ کر بولی۔

''جب اتنی گرمی میں کوئی لانے والا نہیں تھا تو آنے کی ضرورت کیا تھی۔''

''اس سے آپ کو کیا؟'' مجھے لگا جیسے اس نے میرے اندر جھانک لیا ہو کہ گھر میں تین تین گاڑیاں کھڑی ہونے کے باوجود رکشے کے انتظار میں کھڑی ہوں۔ گھر میں کسی کو بھی تو میرے آنے جانے سے مطلب نہیں تھا۔ میری اپنی گاڑی کب کی بیچی جا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے خالی رکشہ کو ہاتھ دیا اور اس میں بیٹھ کر یہ جانے بنا کہ وہ دوسری گاڑی میرے تعاقب میں آ رہی تھی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں اٹھی اور دروازہ کھولا تو ساری ینگ پارٹی کھڑی تھی۔

''ارے تم لوگ سوئے نہیں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے جانے کے بعد سوئیں گے اور حلوہ پوری کا ناشتا کریں گے۔ جس کے پیسے آپ دے کر جائیں گی۔'' فہد گیلانی نے کہا۔

''سزا ہے کیا؟'' میں ہنس دی۔

''جی ہاں! آپ لوگ بھی تو ہمیں جدہ بھیج کر حلوہ پوری کا جشن منایا کرتے تھے۔'' صوبی شہوار نے نیند سے جھولتے ہوئے کہا۔

''اچھا بابا ٹھیک ہے۔'' لوگ بھی اندر آ گئے میں نے انہیں ہزار روپے تھمائے اور کہا کہ اب نکلو تم لوگ

مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ اچھلتے کودتے باہر بھاگ گئے۔ کون کہہ سکتا تھا یہ لوگ ڈاکٹر، انجینئر بن رہے ہیں۔ حرکتیں تو میٹرک کلاس والوں کی تھی میں نے سوچا اور ہنستے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ تیار ہو کر میں نیچے اتری تو چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ سب لوگ جاتے ہوئے تھے۔

''باجی چائے پی لیں۔'' ہمارے پرانے ملازم نے پوچھا۔

''جلدی سے لے آؤ اور باقی لوگ۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تم جلدی سے فاریہ کے لیے چائے لے آؤ اور ہماری بعد میں لے آنا۔'' بھابی نے کہا تو میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے آ گئی تو میں نے ایک دو سپ لے کر چھوڑ دی۔ ٹائم نہیں رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر بڑے بھائی سے ہاتھ ملایا۔ دونوں بہنوں کے Husband سے ملی اور آپی رملہ سے گلے مل کر بچوں کے پاس آ گئی۔ میں رملہ کے گلے لگ گئی۔

''ارے تم لوگ بھی جاگے ہوئے ہو۔'' میں نے چھ سالہ طلال اور اس سے بڑی کو گلے سے لگایا۔

''جلدی آ جایئے گا۔'' طلال نے کہا تو میں اسے پیار کر کے کھڑی ہو گئی۔

''اچھا بھئی حلوہ پوری کا ناشتا کرتے ہوئے باقی لوگوں کو مت بھول جانا۔''

''اچھا تو انہوں نے اپنا جگا ٹیکس تم سے وصول کر لیا۔'' آپی نے کہا۔

''ہاں تو اور کیا ایسے ہی جانے دیتے۔ یہ بھی ہمارے جانے پر جشن منایا کرتے تھے۔ نانا نانی کے ساتھ اور ہم ان سب کو یاد کر کے کتنا افسردہ رہتے تھے۔'' صوی نے گڑیا کے اوپر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔

''ٹھیک ہے بھئی اجازت تم لوگوں کی۔'' میں نے بچہ پارٹی کی طرف رخ کیا۔ فہد تو مسلسل سب کی مووی بنانے میں مصروف تھا۔ ہم سب باہر نکل آئے۔

''اگر آپ اجازت دیں تو گاڑی اندر آ جائے۔'' میں نے مڑ کر بڑے بھائی سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گیٹ کھلا اور اندر زیرو میٹر بلیک کرولا داخل ہوئی۔

''واؤ فاریہ جانی یہ کب لی آپ نے۔ یہ وہی والی ہے نا جو آپ کو خریدنا تھی اپنے پیسوں سے۔'' صوی شہوار تو اچھل ہی پڑیں۔

''فاریہ جانی آج تو آپ نے سب پر بجلیاں گرا دیں۔''

''ویسے سنیں جب میرا رشتہ لے کر جائیں تو اپنے جیسی خوبصورت میری مما سے تھوڑی کم اور میرے پاپا سے ذرا کم قیمتی والی گاڑی لے کر جایئے گا۔ یقین مانیں میں تو آپ کا شیدا ہو گیا ہوں۔ کیا چوکا مارا ہے۔'' اویس گیلانی نے مجھے آنکھ ماری۔

''بدتمیز بھانجے ہو میرے۔ ذرا ادب کے دائرے میں رہا کرو اور ہاں سمعان فکر نہ کرو، میں واپس آؤں گی تو سب سے پہلے یہ گاڑی تم ہی چلاؤ گے اور کوئی بھی نہیں۔'' میں نے سمعان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھلا تو مجھے پتا نہیں کیا ہوا، پلٹ کر بڑے بھائی کے کندھے سے لگ گئی۔

''بھائی میرے لیے دعا کیجیے گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گیٹ سے گاڑی باہر نکلی تو آگے پیچھے پولیس موبائل آ گئیں۔ کریم صاحب فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔

☆......☆......☆

میرے قتل میں خود میرا ہاتھ تھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

میں اچھی خاصی جاب کر رہی تھی کالج میں لیکن اندر کا خلا بھرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی نہیں آتا تھا ملنے۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ بات کرو تو سب کے یہی الفاظ تھے۔

''تم آ جاؤ کون سا تمہیں بہت سامان لینا ہے۔ ایک بیگ اٹھاؤ اور آ جاؤ۔'' تب میں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔

صوی شہوار میرے ساتھ تھی۔ وہ اسی کی وجہ سے یہاں آ گئی تھی۔ انہوں نے صوی شہوار سے صرف یہی

کہا تھا۔
ٹیلیفون پر کہ تیرے آنے تک میں شاید نہ رہوں۔"
"نانی غلط باتیں نہیں کریں ابھی تو آپ کے پاس آ کر میں نے فاریہ جانی کی اور ڈھیر ساری باتیں بتانی ہیں۔ وہ آپ کو تنگ کرتی ہیں نا بس مجھے آنے دیں پھر وہ آپ کو تنگ نہیں کریں گی۔" صوی نے کہا۔
"ارے وہ کیا مجھے پریشان کرے گی بلکہ میں نے اس کو تباہ کر دیا۔ اس کی ہنسی چھین لی وعدہ کر د صوی میں رہوں یا نہیں تم یہاں آ ؤ گی، اسے سنبھالو گی۔ کہہ دینا اپنے ماں، باپ سے کہ فاریہ کو اگر اکیلا چھوڑا تو میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اسپیکر فون پر مجھے سب سنائی دے رہا تھا۔
"امی کیا کہہ رہی ہیں۔ بچی ہے وہ ابھی، اسے کیوں مشکل میں ڈالتی ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا تب وہ میٹرک کلاس میں تھی، انٹر کا امتحان دے کر جب وہ پاکستان آنے کا پروگرام بنارہی تھی تو امی چلی گئیں اور پھر اس نے یہیں ایڈمیشن لے لیا۔ زندگی نے اسے بھی وہ رنگ دکھائے کہ وہ حیران رہ گئی۔
"فاریہ جانی آپ شادی کر لیں۔" تو میں بے تحاشا ہنس دی، اتنا ہنسی کہ میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔ تو وہ سامنے سے اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے کانوں میں کسی کے الفاظ گونجے۔
"تمہارے بہن بھائی تم سے اپنے بچے پلوائیں گے۔ وہ کبھی تمہاری شادی نہیں کریں گے۔ ہاں خود چاہو تو کرلو کچھ۔"
عرصے بعد آپی کراچی آ گئیں لیکن صوی میرے پاس رہی۔ ٹرانسفر تو وہ کروا نہیں سکتی تھیں، میں نے زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس جیسی چل رہی تھی اس کو گزرتے دیکھ رہی تھی۔ شاید زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ میں اپنی سوچ میں گم تھی کہ ایک جھٹکے سے گاڑی رُکی۔
"میم! آپ فریش ہو جائیں۔" میرے موبائل پر خوشی کی کال آئی۔ وہ مجھے یاد دہانی کرا رہی تھی۔

میں اُتر کر ریسٹ ہاؤس میں آ گئی۔ فریش اپ ہونے میں بمشکل پانچ منٹ لگائے ہوں گے اور پھر کراچی سے اسلام آباد کے لیے محوِ سفر ہو چکی تھی، جہاں دس بجے تقریب حلف برداری تھی۔
میں پارٹی ممبرز کے ساتھ ہال میں آ گئی۔ اپنی جانب اٹھتی ستائشی نگاہیں مجھے احساس دلا رہی تھیں کہ میرا خوبصورت روپ دکھائی دے رہا ہے۔ تقریب کے فوراً بعد ہی ہم لوگوں کا اجلاس تھا۔ میں نے وزیر قانون برائے انسانی امور کے حلف اٹھایا تھا، جس کی مجھے جتنی مبارکبادیں ملتیں وہ کم تھیں۔ اجلاس میں شریک ہو کر میں نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ میں گاڑی کی طرف بڑھی تو پھر میڈیا نے مجھے گھیر لیا۔
"آپ کو یقین ہے کہ آپ اپنے عہدے سے انصاف کر پائیں گی۔" کسی نے پوچھا۔
"اگر آپ لوگ ساتھ دیں گے تو ضرور۔" میں نے مختصر جواب دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی تب ہی کریم صاحب نے موبائل میری جانب بڑھایا۔
"آپ کا فون ہے۔"
"ہیلو جی! السلام علیکم کیسے ہیں آپ بس۔ ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ سے جارہی ہوں۔ ضروری ہے اچھا ٹھیک ہے۔ میں انتظار کرتی ہوں وہاں۔" میں نے موبائل آف کیا۔
"کریم صاحب جو گھر آپ نے میرے لیے خالی کروایا ہے وہاں چلیں۔ گھر میں دیکھ لوں گی اور مجھے کسی سے ملنا بھی ہے۔ خیال رہے کوئی پریس کی گاڑی ہمارے پیچھے نہ ہو۔" میں نے کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔ میرا موبائل مسلسل بج رہا تھا اور میں بے خیالی سے نمبر دیکھتی رہی۔ اتنے میں گھر آ گیا۔
میں آہستگی سے اُتر کر اندر آ گئی درمیانے درجے کا اچھا گھر تھا۔ ابا کے دوست کا ہی تھا جبھی ڈیکوریٹ اسے کسی اور نے کروایا تھا۔
"میں چائے پیوں گی۔"
"اور میں بھی۔" کسی کی شناسا آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
"اچھا تو آپ آ گئے۔" میں نے مڑ کر کہا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' وہ بکے دیتے ہوئے جھک کر بولا۔

''اچھا اور کچھ۔'' میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''فیری تم آج بھی خوش نہیں ہو کیوں۔'' اس نے حیرانی سے دیکھا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی خوش نہیں ہوں۔ میں اللہ کے بعد آپ کی وجہ سے یہاں تک آ گئی ہوں۔ مگر میں اپنے آپ سے دور ہو گئی ہوں۔ میں نے اس زندگی کے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ میں تو ایک عام سی لڑکی بن کر رہنا چاہتی تھی۔'' اور تبھی میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

''تم عام سی لڑکی نہیں ہو۔ تم ہی تو اتنے مشکل حالات کا سامنا کرنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہوا اور تم نے مجھ سے مدد نہیں مانگی تھی بلکہ میں نے خود تمہیں مجبور کیا تھا کہ تم یہاں آؤ اور جہاں تک ہو سکے سچ کا ساتھ دو۔ بدلہ لینے کے لیے میں ہی کافی تھا لیکن جو بدلہ تم خود لے کر سکون پاتیں اسے میں کیسے چھین لیتا۔ اس لیے میں نے تمہیں Position دی، پاور دی تاکہ تم خود فیصلہ کر سکو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' اس نے کہا تب ہی چائے آ گئی۔ میں نے چائے بنائی اور اس کو دینے کے لیے جھکی تو وہ ہنس دیا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے ہی خیر تم بتاؤ اب تم کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''پتا نہیں کچھ سوچا نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تمہیں گاڑی پسند آئی۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بہت مگر وہ بہت قیمتی ہے۔''

''لیکن تم سے زیادہ تو نہیں۔'' وہ قریب آ گیا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

''میرا تحفہ کہاں ہے۔'' وہ اس کی گھبراہٹ سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔ تو اُس بُوکے میں سے ایک روز نکال کر اسے دے دیا۔

''یہ بھی بہت ہے ہمارے لیے۔'' اس نے جھوم کر کہا۔

''چلیں اب۔'' اس نے قدم بڑھائے۔

''فیری تم میری امانت ہو یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''اچھا بس ہو گیا، چلیں۔'' اس نے گھورا تو وہ ہنستا ہوا اس کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔

''مجھ سے ڈرتی ہو اور دنیا سے کوئی ڈر نہیں۔'' وہ بولا۔

''دنیا سے کیوں ڈروں آپ ہیں نہ اللہ کے بعد سہارا دینے کے لیے۔ اور آپ سے نہیں بلکہ مجھے آپ کے جنون سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں آپ کو بھی نہ کھو دوں۔''

''یہ بے کار کی سوچیں اپنے دماغ سے نکال دو اور خوشی سے خوش ہو جاؤ My Love۔ میں تمہیں زندگی کی ہر جنگ جیتتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ تو وہ گاڑیوں کی سائیڈ پر آ گئی اور وہ وہیں رک گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی تو وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

''کریم صاحب ہم واپس کب تک پہنچ جائیں گے کراچی۔''

''چار بجے تک جہاں سب کے ساتھ آپ کو پریس کانفرنس اٹینڈ کرنی ہے۔''

''ھم!''

''آپ کی مرضی کیوں کہ کل کا دن آپ کا پہلا اور آخری دن بغیر مصروفیت کے گزرے گا پھر تو آپ کو ایک نئے سفر پر نکلنا ہے۔'' کریم صاحب نے کہا۔ اس نے سر سیٹ سے ٹکا لیا۔

☆......☆......☆

چار بجے اس نے پریس کانفرنس اٹینڈ کی جو ایک گھنٹے چلی ریفرشمنٹ کے دوران وہ بہت لوگوں سے ملی۔ میڈیا نے اسے بہت کوریج دی جو اس کی مقبولیت کا ثبوت تھی۔ پریس کانفرنس کے بعد وہ گیٹ پر آئی۔

''اب کہاں چلنا ہے۔'' رخشی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے پوچھا وہ اس کے لباس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کی میم کے ہاتھوں پر کٹ کے نشان ہیں جن پر وہ لوشن لگانا نہیں بھولتی تھی۔ وہ اس

کے بہت قریب تھی۔ رخشی بے سہارا تھی۔ اس نے رخشی کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب تو اس بات کو بھی چار سال گزر گئے تھے۔

''پتا نہیں سوچ کر بتاتی ہوں۔ اتنے میں تم میرے لیے جوس لے آؤ۔'' اس نے کہا تو وہ باہر چلی گئی موبائل بجا۔

''فاریہ جانی کب آئیں گی ہم انتظار کر رہے ہیں۔'' موبائل پر سوار بھی اسپیکر آن تھا۔

''ہاں بھئی جلدی آؤ پھر تو تم مصروف ہو جاؤ گی۔'' بڑے بہنوئی کی آواز آئی۔

''ہاں فاریہ جانی کیا لگ رہی تھیں آپ حلف اٹھاتے ہوئے اور یہاں لوگ ہاتھ مسل رہے تھے۔ کاش وہ زبان چلانے کی بجائے اپنی منہ پر کوئی کریم مسل لیتے۔ ویسے فاریہ جانی میدان مار لیا ہے آپ نے۔'' اویس گیلانی کی آواز میں شرارت کے رنگ بھرپور تھے۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی کب تک آؤں گی لیکن آؤں گی آج ہی' کیونکہ میرے پاس صرف کل کا دن ہے جو میں تم سب کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''فاریہ جانی واپس گاڑی میں آئیں گی۔'' سونیا نے پوچھا تو وہ ہنس دی اور فون بند کر دیا پھر کچھ سوچ کر موبائل پر نمبر ملایا۔

''تو تم لوگ تیار ہو۔ ٹھیک ہے پھر ہم راستے سے پک کرتے جائیں گے۔ دلہن کے استقبال کی پوری تیاری رکھنا۔'' میں نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔

''رخشی!'' وہ میری آواز پر آ گئی۔

''میں ساڑی Change کروں یا یہی ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے دیکھا۔

''ویسے تو یہی اچھی لگ رہی ہے اگر آپ بدلنا چاہیں تو میں دوسری نکال دیتی ہوں۔'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے پھر ایسے ہی چلتے ہیں۔'' میں نے پرس اٹھایا مگر ہاں وہ حیران ہوئی۔

''کریم صاحب موبائل چھوڑ دیں، بس اعتماد کے بندے گاڑی میں بٹھالیں۔'' میں نے کرولا میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور پروگرام تو آپ جانتے ہیں۔'' تو انہوں نے سر ہلا دیا۔ میں خاموشی سے گزرتے راستے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی۔ میں نے ٹائم دیکھا تو 9 بجے رہے تھے۔

''مناسب ٹائم ہے آپ لوگ باہر رکیں کریم صاحب اور رخشی میرے ساتھ اندر جائیں گے۔''

گھر کی بیل بجائی۔

''کون ہے؟'' دروازہ کھلا تو چاروں گارڈز اندر گھستے چلے گئے۔

''یہ کیا طریقہ ہے کون ہو تم لوگ۔'' یہ میری خالہ کے لاڈلے دوسرے نمبر کے بیٹے تھے۔

''آواز بند کروا دو۔'' گارڈز نے ان کی کمر کے ساتھ پسٹل لگا دی۔ تب میں نے اندر قدم رکھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل جل بھی نہ سکے۔ میرے پیچھے کریم صاحب اور رخشی تھے۔ سب ہی لوگ ٹی وی لاؤنج میں باتوں میں مصروف تھے جس میں خاندان بھر کی برائیاں سرفہرست تھیں۔

''کیا حال ہیں آپ لوگوں کے۔ السلام علیکم خالہ، کیسی ہیں آپ۔ ویسے آپ کی بڑی چھوٹی دونوں بہنیں ختم ہو گئیں آپ ابھی تک زندہ ہیں حالانکہ آپ تو بہت پہلے مرنے والی تھیں۔ مری نہیں آپ۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ تو وہ سب پتھر کے بت بن گئے۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو۔'' بڑی بیٹی نے کہا۔

''بالکل ایسے ہی جیسے تمہیں اپنے گھر میں سکون نہیں آتا تو ان لوگوں کا کھانے آ جاتی ہو، پھر ان کے دل ٹھنڈے نہیں کرتی ہو بلکہ بدلے کی آگ اور تیز کر جاتی ہو۔ تم چاہتی ہو اس میں سب جل کر مر جائیں۔ Just Like Me۔ میری زندگی کو تو جلا دیا اور پھر میری ماں کو تم نے فون کیا تھا کہ میں منہ نوچ لوں گی تمہارا۔ کیوں ان کا کیا قصور تھا۔ ساری زندگی انہوں نے تمہیں اپنے گھر سے نہیں نکالا بلکہ اپنا اکلوتا بیٹا تمہارے نام کیا اور تم نے انہیں یہ صلہ دیا۔ اور پھر تمہیں کوئی اور پسند آ گیا تو تم نے میرے بھائی

پر الزام لگایا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتے اور بھاگ کر کراچی آ گئیں۔ شادی کرنے کے لیے چلو بھی وہ شادی ہو گئی پھر اپنی ماں کو ہمارے سر پر چھوڑ دیا کہ میں اپنی بہن سے الگ نہیں رہ سکتی اور پھر تم نے اپنے کمینے بھائی کے ذریعے میری ای کو اتنا بلیک میل کیا کہ وہ مر جائے گا نازیہ کے بغیر۔ ساری دشمنی بھول کر آپ بھی شادی کر دیں۔ ہم تو پھولوں پر بٹھا کر رکھیں گے۔ لیکن کیا کیا تم لوگوں نے میرے ساتھ۔ اپنی دشمنی اپنے بیمار بھائی کے ذریعے پوری کی، جو ازدواجی زندگی گزارنے کے قابل ہی نہیں تھا۔''

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کیا کر ڈالوں۔

''میں نے تو تم لوگوں کو زندگی بھر جانا تھا۔ جب تم لوگوں کے گھر کھانا نہیں پکتا تھا تو میں کھانا نہیں کھاتی تھی کہ جب تک راشن تمہارے گھر نہ آ جائے۔ اپنے عید کے کپڑوں سے پہلے میرے ماں باپ نے تمہارے کپڑے بنوائے اور جس بھائی کی پڑھائی پر تمہیں ناز ہے اس کی پڑھائی میں کتنا پیسہ میرے باپ کا ہے وہ حساب کر دو تو کھڑے کھڑے یہ تمہارا گھر بک جائے۔'' میں نے زہریلے انداز میں کہا۔

''بند کرو یہ بکواس! لڑکا تمہیں کوئی اور پسند تھا اور الزام میرے بھائی پر لگا رہی ہو۔ تم خود الگ سوتی تھیں۔ ہاتھ تک تو لگانے نہیں دیا۔'' میرے سامنے راحت آ گئی۔

''اچھا تمہیں بڑا تجربہ ہے ساتھ سونے کا۔ کہیں زرداد سے کہ اسے ساتھ لگا کر ہاتھ تو لگائیں۔ کریم صاحب ذرا اسے تھامیں تو پھر میں دیکھوں اسے کتنا تجربہ ہے۔'' میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی وہ آگے بڑھا تو فلاح میرے سامنے آ گیا۔

''میرے کیے کی سزا میری بہن کو مت دو۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب بڑی باجی اور میری چال تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سب تمہیں اتنا کیوں چاہتے ہیں اور باجی کو اپنا بدلہ لینا تھا۔ پھر خود تمہارے گھر میں بہت لوگ مل گئے۔ میں واقعی بیمار تھا۔ کسی قابل نہیں تھا۔ تم نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہماری چال ناکام ہو گئی۔ پھر مجھے خود ہی اپنے منہ سے کہنا پڑا۔ میں جانتا ہوں تم یہ بات برداشت نہیں کر پاؤ گی اور وہی ہوا، تم اپنی ضد پر اڑ گئیں۔ تم نے طلاق کے لیے انکار کیا۔ ویسے بھی میری تمہاری شادی جائز تھی ہی نہیں، مگر چھوٹے ماموں نے مجھے کہا تم سے وہ خلع لے لے گی، اس کا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ تمہارے بھائی نے بھی یہی کہا تو میں آرام سے راضی ہو گیا اور میرا ڈیڑھ لاکھ بچ گیا۔ ملزم بھی تم ہی ٹھہرائی گئیں۔''

اس نے کہا تو میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے اپنا جلتا کمرا یاد آ گیا جس میں آگ بھڑک رہی تھی اور مجھے بچانے والا کوئی نہ تھا۔

''بڑے ماموں کے لڑکے سے شادی۔''

''بس چپ کر جاؤ، ایسا نہ ہو کہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں اور اپنے ایک ایک زخم کا حساب لگانے بیٹھ جاؤں جو تم سب نے دیے ہیں۔''

یہ کہہ کر میں کریم صاحب کی طرف گھومی۔

''شان کو اندر بلائیں سارے انتظام کر لیے ہیں نا۔'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ شان اندر آیا لمبا سا ہلکی ہلکی خوبروئی لیے وہ سفید شلوار قمیض میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''شان یہ تمہارے سامنے راحت کھڑی ہے۔ اس کے کردار کی میں گواہی دیتی ہوں۔ تمہیں قبول ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔'' وہ چلائی۔

''مذاق نہیں ہے۔ ابھی اور اسی وقت شان کے ساتھ تمہارا نکاح اور رخصتی ہو رہی ہے۔ جس کو اتنے عرصے سے تمہارے گھر والوں نے مذاق بنا رکھا ہے۔ چاہتے تو کب کی تمہاری شادی کر دیتے لیکن سب نے اپنا فائدہ سوچا، یہاں تک کہ تمہارے چھوٹے بھائی نے بھی۔'' میں نے کہا تو اس نے سر جھکا لیا۔

''مگر تم ہوتی کون ہو میری زندگی کا فیصلہ کرنے والی۔'' وہ زور سے چلائی تو میں نے اس کے گالوں کو سرخ کر دیا۔

''شکر کرو نکاح کر رہی ہوں ورنہ یونہی کسی کے بھی حوالے کر دیتی۔ رہ گئی بات فیصلہ کرنے کی تو میں

نے تمہارا ہمیشہ اچھا سوچا اور تم نے ٹیلیفون پر مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ وہ تو کب کا تمہیں طلاق دے دے مگر اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ارے تم کو رحم نہیں آیا۔ میری ماں کا آخری وقت تھا جب تم لوگ یہ سب باتیں کر رہے تھے۔ فکر مت کرو۔ میں تمہارے جیسی نہیں ہوں میری بات مان جاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ دوسرے کمرے میں جا کے اس نے کپڑے تبدیل کر لیے۔

''رخشی راحت کو تیار کر کے لانا۔'' پھر جب وہ باہر آئی تو گلے میں سونے کا زیور چمک رہا تھا۔ اس نے رخصت ہونے کے لیے پیر باہر نکالا۔

''تم پچھتاؤ گی نہیں کیونکہ شان کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تم اس کے ساتھ اچھا رویہ رکھو گی تو۔'' میں نے کہا اور پیچھے ہٹ گئی۔ وہ چلی گئی۔

''اچھا بھئی اجازت!'' میں نے سب کی طرف دیکھا۔

''فلاح تمہارے بچے کہاں ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ......اچھا یہ تمہارے ہیں بھی شاید......اوہو سوری آخر تمہاری بیوی میری کزن بھی تو ہے اور ہاں کل جب تک راحت نہ آجائے گھر باہر نکلنے یا کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آج کی رات تم سب لاؤنج میں گزار دو۔ کریم صاحب چار گارڈز کو یہیں چھوڑ دیں خوامخواہ کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔'' میں نے اپنی ساڑی درست کی اور کرولا میں بیٹھ گئی۔

''اوہ گوڈ میم! آپ اتنی سخت بھی ہو سکتی ہیں، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔'' رخشی کے منہ سے نکلا۔

''زندگی نے بنا دیا ورنہ ہم بھی کبھی پھولوں اور تتلیوں کی باتیں کرتے تھے۔'' میں نے اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کے لیے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں تو وہ بھی خاموش ہوگئی۔

گھر کے گیٹ میں گاڑی داخل ہوئی تو رات کے تین بج رہے تھے۔

''فاریہ جانی آگئیں۔'' سونیا دوڑتی ہوئی آئی اس کے پیچھے سب لوگ آگئے۔

''بہت مبارک ہو۔'' رملہ نے اسے گلے سے لگایا پھر وہ سب سے ملتی اندر آگئی۔

''میم کیوں نہ اس وقت ایک فیملی فوٹو گراف ہو جائے جو آپ کے کام میں آئے گا۔'' رخشی نے جھک کر کہا تو میں نے سر ہلایا ذرا ہی دیر میں وہ فوٹو کھنچ گیا۔

''چلیں نہ فاریہ جانی اپنے روم میں۔'' فہد اور گڑیا نے بھی گھسیٹا۔

''لیکن کیوں بھئی ابھی مجھے کچھ دیر تو یہاں سب کے پاس بیٹھنے دو۔'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''آپ چلیں نہ پھر کپڑے بدل کر آجایئے گا۔'' فہد اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا تو میں تنگ آکر اُٹھ کھڑی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو رنگ و نور کا سیلاب امنڈ آیا۔ پھولوں کی پتیاں برس رہی تھیں۔ تب ہی اویس گیلانی نے مجھے گود میں اٹھالیا۔

''میں گر جاؤں گی۔ اویس بدتمیزی نہیں کرو۔'' شرم و خفت سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ تب ہی لائٹس آن ہوگئیں۔ میرا کمرا جگمگا رہا تھا۔ شاندار بیڈ شیٹ، دبیز قالین کمرے کی کلر اسکیم بالکل بدلی ہوئی تھی۔ ایک طرف رائٹنگ Chair رکھی ہوئی تھی۔

''یہ میں لے کر آئی ہوں۔'' سونیا نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو سب ہنس پڑے۔ میں آگے بڑھی تو گیلری کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو نئی بنائی گول شیلف اس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی میں گہرا سانس لے کر پلٹی۔

''میری کتابیں کمپیوٹر وہ سب کہاں گیا۔'' میں چیخی۔

''وہ باہر کمرے میں ہے۔'' بھابی نے کہا۔

''ہاں بھئی ان لوگوں نے تو سر کھالیا تھا فاریہ جانی کا روم سیٹ کرنا ہے۔ اپنی ساری جمع پونجی لگا ڈالی ہے۔'' اس نے کہا تو میں بھیگی پلکیں لیے مسکرا دیں۔

''اور رخشی وہ کہاں رہے گی۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ نیچے گیسٹ روم میں۔ جب آپ کو ضرورت ہو تو یہ انٹرکام کس مرض کی دوا ہے۔'' شہوار نے کہا۔

''!Thanks''

''کس بات کا!'' آپ کا کمرا ہر وقت بکھرا رہتا تھا۔ ہم نے تو بس سمیٹا ہے۔ پانچ سال سے خالی کارپٹ پر سو رہی تھیں، ہم نے سوچا اب تو کافی پریکٹس ہوگئی ہے، بھوکا رہنے اور نیچے سونے کی۔ ذرا آپ کو بھی موٹا کر دینا چاہیے۔ ویسے آپی کو دیکھا ہے صحیح سلامت ہیں کہیں کوئی فریکچر تو نہیں ہوا۔'' اویس آگے بڑھا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو۔'' میں نے اُسے گھورا۔ اتنے میں چائے آگئی، سب لوگ چائے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں کپڑے تبدیل کر کے آرام دہ سلیپنگ شلوار قمیض پہن کر آگئی۔

''فاریہ جانی ابھی تو ہم نے آپ کو دیکھنا تھا۔'' گڑیا نے منہ بنایا۔

''بعد میں بھی تو پہنوں گی تب دیکھ لینا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

تب ہی سارے بڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اب تم بھی سو جاؤ بہت تھک گئی ہوگی۔''

''جی یہ تو ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''فاریہ جانی یہ فاؤل ہے۔'' سارے بچے چلائے۔

''رخشی تم کریم صاحب کو بولو آج یہیں سو جائیں پھر کل سے طے کریں گے کہ کیا کرنا ہے اور تم بھی گیسٹ روم میں سو جاؤ۔'' تو وہ وہاں سے چلی گئی۔

''اور تم لوگ بھی یہیں پر آجاؤ۔ صبح جلدی اُٹھ جانا ورنہ پانی کی بالٹیاں ڈال کر اٹھاؤں گی اور یہ تمہارا نیا کارپیٹ ایک ہی دن میں فقیروں جیسی حالت میں آجائے گا۔'' میں نے ان لوگوں کو گھورا تو وہ اچھل پڑے۔

''فاریہ یہ لوگ تمہیں سونے نہیں دیں گے۔'' بھابی نے کہا تو میں ہنس دی۔

''بس بھابی پھر پتا نہیں یہ وقت ملے یا نہ ملے۔ میں خود ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' کمرا صاف ہو چکا تھا۔ میں نے تکیہ اٹھایا اور نیچے لیٹنے لگی تو اویس اور شان نے مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔

''یار بچوں اب عادت نہیں رہی۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ ہم نے ساری جمع پونجی لٹا دی اور آپ کو نیند نہیں آئے گی۔'' سب لوگ چلائے۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

''تمہیں پتا ہے تم لوگوں کے پیار کے لیے میں کتنا ترسی ہوں۔ یہ جو آج پھول تم نے مجھے دیے ہیں، ان سے مجھے اپنے ماں باپ کی مہک آتی ہے۔ اُن کا تڑپنا، سسکنا یاد آتا ہے۔ سب نے کہا فاریہ جانی خراب ہیں اور تم لوگوں بھی مان لیا۔ اور پھر جب وہ گئیں تو میں پاگلوں کی طرح سے انہیں تلاش کرتی رہی۔

''فاریہ جانی کریک ہوگئی ہیں۔'' تم لوگوں میں سے ہی کسی نے کہا تھا لیکن کیا آج تم سب مجھے رونے کی اجازت دو گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں غلط نہیں تھی۔ وقت غلط تھا، حالات غلط تھے۔'' میں دیوار سے ٹیک لگائے گہرے سانس لے رہی تھی تو وہ سب مجھ سے آلپٹے تو میں بے تحاشا رو دی۔

''میں نے کبھی کسی سے دغا نہیں کیا تم لوگ تو مجھے بہت پیارے ہو کیونکہ تم ہی لوگ ہو جو اس گھر کی بنیاد ہو بنیاد ہل جائے تو گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔'' میں بولتے بولتے شاید اپنے حواس کھو بیٹھی تھی وہ لوگ کچھ بولنا چاہتے تھے۔ مگر شہوار نے انہیں روک دیا۔ انہیں رو لینے دو اگر یہ اب بھی نہیں روئیں تو مر جائیں گی۔ وہ ڈاکٹر تھی میری حالت سمجھ رہی تھی۔

سب نے ان کے سامنے اُن کی بیٹی کو ڈرگ ایڈکٹ کہہ دیا۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ کہیں انجکشن کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ ہاں یہ جو کٹ دیکھ رہے ہو نا یہ اُس بے بسی کی نشانی ہے جب میں نے اپنے کردار پر الزام برداشت کیا۔ مجھے مبارکباد ملی تھی کہ میں خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جس نے یہ کارنامہ انجام دیا، خلع لینے کا۔ میں تب بھی نہیں روئی تھی۔ بس میں نے یہی کہا تھا کہ سب اپنی جگہ سے ہل جائے گا اور میری سچائی وقت ثابت کرے گا میں تب بھی نہیں روئی۔ جب امی نے پوچھا تجھے دکھ ہو رہا ہوگا۔ میں نے کہا تھا نہیں۔ میری عدت کو ڈھونگ کہا گیا، میں

نے برداشت کیا۔ مجھے امی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور پھر وہ چلی گئیں میں روئی نہیں بس برداشت کیا۔ اب میں رو سکتی ہوں کوئی میرے آنسوؤں سے خوش تو نہیں ہوگا کوئی باہر جا کر کہے گا تو نہیں کہ میں رو رہی تھی۔ 5 سال پہلے گئی ہوں ماں کو اور باپ کو۔'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر میں نے بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔

''امی آؤ دیکھو میرے گرد چاند ستاروں کی روشنی۔ ابا آپ کے نام کو میں نے خراب نہیں کیا۔ بس مجھے اتنا بتا دیں کیوں چھوڑ کر گئے آپ لوگ مجھے ان بے حس لوگوں کے سہارے! بتائیں نہ مجھے۔'' میں چیخ رہی تھی۔ میں بہت کمزور تھی اور آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ کس کے آسرے پر۔''

''فاریہ جانی، بس کریں۔'' سب میرے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے اور میں بے بسی سے ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔

''فاریہ جانی معاف کر دیں ہمیں پتا نہیں تھا جانے کس کی آواز سن تھی مگر مجھے ہوش بھی نہیں تھا۔ تب ہی مجھے اپنے بازو میں کوئی سوئی چبھتی محسوس ہوئی۔

''مت انجکشن لگاؤ مجھے ورنہ تمہارے ماں باپ مجھ پر ڈرگ ایڈک ہونے کا الزام لگا دیں گے، چھین لیں گے سارا پیار۔ اور تم لوگوں کو بھی مجھ سے دور کر دیں گے۔'' میں پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی اور نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔

''کتنا برا کیا ہے سب نے ان کے ساتھ۔'' اویس نے کہا۔

''مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے انہیں یہ جنگ خود لڑنی ہے۔'' شہوار نے کہا۔

''ہم پیار تو کر سکتے ہیں۔ ان کا ساتھ تو دے سکتے ہیں اور مانگا ہی کیا ہے انہوں نے۔'' فہد گیلانی نے کہا اور پھر سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ پتا نہیں اس رات کوئی سویا بھی تھا یا نہیں۔ اپنی جگہ جاگ رہے تھے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

میں صبح سو کر اٹھی تو دوپہر کے بارہ بجے تھے گڑیا میرے سرہانے بیٹھی تھی۔

''فاریہ جانی آپ اُٹھ گئیں۔'' اس نے پوچھا۔

''اور تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ باقی سب لوگ کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ لوگ نیچے ناشتا کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے چائے منگواؤں۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بھئی ضرور۔'' میں نے کہا اور دوبارہ سے اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ گڑیا نے کچن انٹرکام پر چائے کا کہہ دیا۔

''دیکھا جانی اپنے لندن جانے کا کتنا فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے۔ فاریہ جانی آپ کی آنکھیں سوجھ رہی ہیں۔ آپ منہ دھو لیں۔'' گڑیا نے کہا تو وہ اُٹھ کر واش روم میں آ گئی۔

''کیا رات کو میں نے کچھ کیا تھا؟'' میں نے منہ دھوتے ہوئے سوچا۔

'خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔' میں نے چہرہ صاف کیا اور باہر نکل آئی۔ سارے لوگ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

''آؤ فاریہ آج تو ہمارے ساتھ ناشتا کر لو۔'' بڑے بہنوئی نے کہا تو وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''فاریہ بہت دیکھ بھال کر رہنا، یہاں ذرا سی بات یوں پھیلتی ہے جیسے جنگل میں آگ اور تمہاری ذات کے ساتھ کوئی اسکینڈل بنے تو سب کے لیے مشکل ہو جائے گی۔''

''آپ آخر کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ فکر نہیں کریں، میری ذات سے آپ لوگوں کی زندگیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اطمینان رکھیں۔ مجھے اپنی حدود کا پہلے سے علم ہے اور بدنام کرنے والوں کو میں بھی میری نجی زندگی کے بارے میں اپنی زبان کھولی یا رائے دینے کی کوشش کی تو وہ پھر مجھ سے شکایت نہیں کرے۔ میں کیا کرتی ہوں؟ کیسی ہوں؟ یہ میرے پارٹی والے اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ کسی طور برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی اور میرے بارے میں رائے زنی کرے، چاہے وہ میرے گھر والے ہی

کیوں نہ ہوں۔''

میں نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور پھینک دیا۔

''لیکن ہم تو بس......'' رملہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں سب جانتی ہوں، برائے مہربانی اس موضوع پر بات مت کریں۔ میرا وعدہ ہے کہ آپ لوگوں کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور زیادہ ہی احتیاط کرنی ہے تو باہر والوں کو نہیں بتایئے گا کہ میں آپ سے کوئی رشتہ بھی رکھتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں کن ہواؤں میں اڑنے لگی ہو جب منہ کے بل گرو گی تو پتا لگے گا۔'' رملہ نے کہا۔

''پلیز رملہ وقت کو آواز مت دو۔ منہ کے بل تو میں گر چکی ہوں۔ طلاق یافتہ، بدکردار خاندان کے نام پر دھبہ ہوں۔ جسے بھلانے کی کوشش میں نے بھی نہیں کی اور تم لوگوں نے بھی نہیں کی۔ اپنے بچوں تک کو میری داستانیں سنا دیں تاکہ وہ میرے ہر ملنے والے کو، ہر آنے والے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہیں۔ یاد ہے مجھے، سب یاد ہے بھولی نہیں ہوں میں۔'' میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''سوری میں بھول گئی تھی ہم اور آپ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں۔'' ابھی میں کچھ اور کہتی رخشی آ گئی۔ میم آپ سے کریم صاحب ملنا چاہ رہے تھے میں بغیر کسی کی جانب دیکھے اُٹھ کر باہر آ گئی۔

''جی کریم صاحب!'' میں نے پوچھا۔ میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ یہاں رہیں گی یا جو گھر آپ کو الاٹ کیا جائے گا، وہاں رہیں گی۔''

''کچھ پتا نہیں فی الحال آپ رہیں وہاں جو گیسٹ آئیں گے، وہیں ٹھہریں گے۔ باقی دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات ہوئی ہے بیٹا۔'' کریم صاحب نے پوچھا۔

''ہوئی بھی ہے اور نہیں بھی کریم صاحب یہ لوگ ٹوٹے ہوئے دل کو کتنا مسلیں گے۔ میرا یہاں رہنا مجبوری ہے۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتی اور یہ لوگ مجھ سے یہاں رہنے کی قیمت مجھے اذیت دے کر وصول کر رہے ہیں۔ پتا نہیں مجھے اتنا کمزور ہونا چاہیے یا سب سُن کر بھی مسکرانے کا دستور نبھانا چاہیے۔ سمجھ نہیں آتی کچھ یہ زندگی۔'' میں نے سر ہلایا۔

''کڑے سے کڑا وقت جھیل گئیں، یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ آج کا دن اچھا گزار لیں پھر آپ کو مہینوں فرصت نہیں ملے گی۔'' انہوں نے کہا تو میں واپس اندر آ گئی۔

☆......☆......☆

وہ دن باتوں میں ہنستے مسکراتے گزر گیا۔ جو لوگ ملنے آتے رہے۔ ان سے ملتی بھی رہی اور بچوں کے ساتھ مگن بھی رہی۔ پھر سب جانے لگے اپنی اپنی منزلوں کی طرف، پھر آنے کے لیے۔

''بابا اپنا خیال رکھیے گا۔'' طلال نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا تو میں ہنس دی۔

''ہاں بیٹا ضرور۔'' رملہ اور آپی ساتھ ہی جا رہے تھے۔

''اور آپ ذرا اپنے بڑوں کا خیال رکھیے گا۔ کہیں انہیں آپ کو دیکھ دیکھ کر مستقل ہائی بلڈ پریشر نہیں ہو جائے۔ پتا ہے نہ ہماری والی شکل سب سے زیادہ کس کو پیاری ہے، اس لیے پلیز آپ اپنی شکل سے مظلومیت ہٹا دیجیے۔ یہ کالا دھاگا لایا ہوں دشمنوں کی نظر سے بچنے کے لیے، پہن لیجیے۔'' اویس نے پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ کر کالا دھاگا نکالا تھا۔

''تم بہت ہی......'' میں آگے کچھ کہتی تو وہ میرے ہاتھ میں دھاگا باندھ چکا تھا۔

''فاریہ جانی Be Strong آدھی بازی آپ نے جیت لی ہے باقی بھی جیت لیں گی جہاں کہیں بھی رہوں گا آپ کی محبتوں کے لیے دعاگو رہوں گا۔ ہارنے لگیں تو ایک دفعہ مجھے ضرور آواز دیجیے گا، شاید میں آپ کے کام آ سکوں۔'' اویس نے میرے ہاتھ کو چوما جس میں امی کی رنگ تھی تو میں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا پھر وہ لوگ چلے گئے۔ میں تھکی ہوئی امی کے روم میں لیٹی تھی تب ہی رخشی آئی۔

''میم شان کی کال ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا

چاہتا ہے۔''
''ہاں لاؤ کراؤ بات۔'' میں نے کہا اور چھت پر نگاہیں جما دیں، تب ہی وہ کارڈلیس لے آئی۔
''فاریہ باجی پہلے تو میں نے آپ کے حکم پر سر جھکایا تھا لیکن اب میں بہت خوش ہوں۔ آپ نے میری زندگی کا فیصلہ غلط نہیں کیا بلکہ صحیح کیا ہے۔'' شان نے کہا تو مجھے دلی خوشی ہوئی۔
''ہیلو فاریہ بھی زندگی ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں سمجھی تھی کہ تم نے مجھ سے بدلہ لیا ہے لیکن نہیں، تم نے تو اپنی دوستی کا فرض نبھایا ہے جو میں نہیں نبھا سکی۔ ہم نے تمہارے ساتھ اور بڑی خالہ کے ساتھ بہت برا کیا اور تم نے......'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈھل گئی۔
''فاریہ یقین کرو چھوٹی خالہ تم سے پیار کرتی تھیں۔ مجھے ان سے بولتے ہوئے خیال ہی نہیں رہا اور وہ ہمارے ہاتھوں سے پھسل گئیں۔ سن رہی ہو فاریہ۔ میرے گناہوں کی فہرست لیکن اب رات کچھ نہیں کہے گی۔ سوائے اپنے گناہ کی معافی مانگنے کے علاوہ، پلیز تم بھی مجھے معاف کردو۔'' وہ بولی۔
''راحت میرا صبر ابد تک ہے اس سے آگے ہر حد ختم ہوجاتی ہے۔ مجھے اور مت آزماؤ۔ خوشی خوشی گھر جاؤ۔ ولیمہ تو تمہارا کل ہے، جو اچھا ہوگا تمہاری زندگی کی طرح۔'' میں نے کارڈلیس آف کردیا زندگی بھی کیسے کیسے امتحان لیتی ہے۔
رخشی کمرے میں داخل ہوئی۔
''بات ہوگئی میم۔'' اس نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''میم ایک بات بولوں۔'' وہ میرے سامنے بیٹھی۔
''ہاں کہو۔'' میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
''آپ شادی کب کریں گی۔''
''بس جلدی شاید اسی مہینے اگر میرے سارے کام ہوگئے تو۔'' میں نے اُسے جواب دیا تب ہی دروازہ کھلا اور بھابی اندر داخل ہوئیں۔
''تم آج گھر پر لنچ کروگی۔'' انہوں نے پوچھا میں نے مسکرا کر کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''پھر تم تیار ہو جاؤ اگر یہ بچے اُٹھ گئے تو تمہیں نکلنے نہیں دیں گے۔ پتا نہیں کیا کیا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں سر ہلاتی باہر نکل آئی۔
گاڑی میں بیٹھنے تک میں ابھی تک ان کے لہجے کی مٹھاس کو حلق سے اتار رہی تھی جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنی۔
''کہاں چلیں میڈم!'' ڈرائیور نے پوچھا۔
دماغ کی بساط پر چالیں سیٹ کرنے لگی تب ہی جہان عالم کا فون آ گیا۔
''کیا حال ہیں سرکار!'' وہ شرارتی انداز میں بولا تو میں مسکرا دی۔
''گھر میں سب ٹھیک تھا۔'' اس نے پوچھا۔
''ہاں سب ٹھیک تھا ویسے جہان اگر تم نے مجھے گر تے ہوئے تھاما نہیں ہوتا میں آج ان لوگوں کے سامنے کبھی کھڑی نہیں ہو پاتی۔'' میری آواز میں آنسو جھلملانے لگے۔
''وہی بات فاریہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ہوتا چلا گیا، بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں کب گھر والوں کو تمہارے یہاں بھیجوں۔'' اس نے پوچھا۔
''مگر جہان اب اس عمر...... سب کیا کہیں گے۔'' میں کچھ ہچکچائی۔
''کیوں عمر کو کیا ہوا ہے تمہاری صحیح تو ہے یا پھر تم خود اپنی زندگی کو خوشیوں سے محروم رکھنا چاہتی ہو۔'' جہاں کے لہجے میں خفگی اتر آئی۔
''اچھا ناراض مت ہو، کچھ دن رکو اور ہاں اس دن فنکشن میں کافی ٹینشن تھی مجھے لگ رہا ہے کہ میرے کام کرنے میں وہ مجھے یا میرے گھر والوں کو نشانہ نہ بنالیں۔'' میں نے توجہ ہٹائی۔
''جہان عالم کے ہوتے ہوئے تمہیں ہوا بھی چھو سکتی۔ رہ گئے تمہارے گھر والے تو چھوڑو انہیں، کیوں فکر کرتی ہو۔'' جہان عالم نے جواب دیا۔
''ایسا مت کہو، وہ میرے ماں، باپ کے پیارے ہیں اور میں اُن کو پریشان نہیں دیکھ سکتی، خاص طور پر اپنی وجہ سے۔'' میں تڑپ گئی۔

''اچھا بھئی تم بے کار کے وہم مت پالو اور اپنا کام دل لگا کر کرو، پھر تو یہ دل میرے قبضے میں آ جائے گا۔'' جہان نے شرارت سے کہا اور موبائل آف کر دیا تو میں بھی ہنس دی اور اطمینان سے گاڑی کی سیٹ پر بیٹھ کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی۔

دل کا حال وہی ہے بس جلتے ہوئے الاؤ میں
پیار کی آگ سی بھڑک اٹھی ہے

☆......☆......☆

آفس میں ڈھیروں کام اس کا منتظر تھا۔ لڑکے لڑکیاں انتظار کر رہے تھے۔ میں مسکرائی سب سے ملتی رہی اور اپنا کام بھی مکمل کرتی رہی۔ یہ میرا ایک سخت اور مصروف ترین دن گزر رہا تھا کہ ایک فائل نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ کسی لڑکی کی فائل تھی جس نے اپنی جان پر کھیل کر ان لوگوں کی نشان دہی کرنے کا وعدہ کیا تھا جو ان کو بلیک میل کر کے غلط کاموں میں پھنسا رہے تھے۔ اس نے لکھا تھا۔

''فاریہ باجی یہ میری آخری کوشش ہے اپنی عزت بچانے کی۔ اگر آپ واقعی میں ہمارا درد سمجھتی ہیں تو ہمیں ان لٹیروں سے بچائیں، جو اپنے ہی ملک و مذہب کی لڑکیوں کو لوٹ رہے ہیں اور ہم آج بھی پارٹیشن کے اس دور میں کھڑے ہیں جہاں ایک طرف پاکستان تھا اور دوسری طرف ان کے نام پر مرمٹنے والی لڑکیاں تھیں، جو اپنی عزتیں بچانے کے لیے کنوؤں میں کود گئیں اور یہاں تو ڈوبنے کے لیے کنویں تو کیا دریا بھی میسر نہیں۔ ہو سکے تو ہمیں بچالیں ورنہ ہمیں الزام نہ دیجیے گا کہ پاکستان کی زمین ہمارے ناپاک وجود سے خراب ہو رہی ہے۔''

''یہ خط میرے دماغ کو ہلا گیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے جسم میں بے تحاشا جوش بھر گیا۔

''کیا اب بھی ایسا ممکن ہے اور اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو میں کیسے اپنے آپ سے نظریں ملا پاؤں گی۔''

''جب سب اپنا ہوتا ہے تو اب کیوں نہیں۔'' ماضی کی کوئی شناسا آواز میرے دماغ میں لہرائی۔ میں نے شدت سے مٹھیاں بند کر لیں۔

''اگر ایسا ہوا تو میں ان لوگوں پر کتے چھڑوا دوں گی۔ زندہ زمین میں گاڑ کے'' میرے اندر بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ میں نے ساری فائلیں بند کر کے کریم صاحب کو بلا کر خط ان کے حوالے کیا اور خود بے بسی سے ہاتھ ملتی ہوئی انہیں دیکھنے لگی۔

''میڈم اس کے مطابق تو وہ لوگ بہت طاقتور ہیں اور ایک نہیں پتا نہیں کتنی لڑکیاں ان کے جال میں ہوں گی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم کچھ کر پائیں گے۔'' کریم صاحب نے کہا کہ تو میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایک لڑکی نے بند سلاخوں کے پیچھے سے مجھے پکارا ہے۔ اگر میں انہیں نہیں بچا سکی تو کس کام کی یہ پوزیشن اور یہ پاور۔ میں ریزائن کر دوں گی۔'' میں بے حد ٹھنڈے انداز میں بولی۔

''میڈم پلیز تھوڑا ریلیکس ہوں، میں انکوائری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ باہر چلے گئے تو مجھے فراز کا خیال آیا۔ وہ انتہائی سمجھدار لڑکا تھا۔ ہر چیز میں ماہر، بہترین کھوجی تھا۔ وہ جان سکتا تھا کہ اس خط کی جڑیں کہاں تک گہری ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس لڑکی تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ میں نے پلٹ کر بیل بجائی تو پیون اندر آیا۔

''جی میڈم!'' وہ جھکا۔

''فراز آیا ہے۔'' میں نے پوچھا میرے دماغ میں آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

''جی میڈم وہ آئے ہیں۔''

''اس کو اندر بھیج دو اور جب تک میں اس سے بات نہ کر لوں کوئی کمرے کے قریب بھی نہ آنے پائے۔'' میں اپنی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور فراز اندر داخل ہوا۔

''جی فاریہ باجی آپ نے مجھے یاد کیا۔'' اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، کسی خوف سے نہیں بلکہ ادب و احترام کا اثر تھا کہ وہ نگاہ اٹھا نہیں پا رہا تھا۔

''فراز آج تمہاری باجی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہ مدد اور بندے بھی کر سکتے ہیں لیکن ان پر بھروسا نہیں۔ بات پھیل گئی تو ریت کی طرح سے وقت ہاتھوں سے پھسل جائے گا۔'' میری آواز میں کچھ تھا جو وہ چونک اٹھا۔

’’حکم کریں فاریہ باجی! ایسا کیا مسئلہ ہے جو آپ کو پریشان کر گیا۔‘‘ اس نے ایک لمحے کو نگاہ اٹھائی اور پھر جھکا لی تب ہی کریم صاحب بھی آ گئے۔

’’لو یہ پڑھو۔‘‘ میں نے ان کے ہاتھ سے خط لے کر فراز کے ہاتھ میں دیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا اس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

’’فاریہ باجی میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن رات تک یہ ضرور معلوم کرلوں گا کہ یہ کس نے لکھا ہے اور یہاں تک کیسے پہنچا۔‘‘ فراز نے کہا تو میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا جب تک کریم صاحب کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔

☆......☆......☆

لوگوں کو کام چاہیے تھا۔ میرے پاس بے روزگار نوجوان لڑکے لڑکیوں کی درخواستوں کا ڈھیر لگ گیا۔

’’کریم صاحب ہمیں جلد از جلد چھوٹے چھوٹے اسکول اور ہوسٹل کا انتظام کرنا ہوگا تاکہ یہ لوگ کام کرسکیں ساتھ میں Paper فیکٹری کو بھی Reopen کروادیں۔ بیبیوں کا انتظام میں کرلوں گی۔‘‘ میں نے راکنگ Chair کو گھماتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

’’گھر جارہی ہیں۔‘‘ انہوں نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آج کے دن میں کسی پولیٹیکل پارٹی سے نہیں ملی تھی، نہ ہی میں نے ان کی کوئی کال Attend کی تھی۔ آج کا دن تو لائحہ عمل طے کرنے کا دن تھا۔ ساتھ ہی اس خط کے ایشو نے مجھے اُلجھا دیا تھا۔ کاش اس کا پتا لگ جائے۔ میرا دل بے اختیار دعا کر رہا تھا۔ گھر آنے تک میرا دل بے چین رہا۔ میں کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھی اس کے بعد میں اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

نماز پڑھ کر دعا مانگ کے فارغ ہوئی تھی کہ جہان عالم کی کال آ گئی۔ میں نے اسے سارے دن کی مصروفیات بتائیں تو اس نے بھی میری مدد کا وعدہ کیا اور موبائل آف کر دیا۔ اس پر بھی عجلت پسندی سوار تھی۔ میں تکیوں میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں بس اللہ سے دعا تھی کہ وہی کوئی راستہ دکھائے گا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی۔ شاید یہ بہت دنوں سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ تھی یا تھکن جو میں سوچکی تھی۔

رخشی نے مجھے اٹھایا تو مجھے ایک لمحے تک سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں لیکن پھر ایک دم میں اُٹھ بیٹھی۔

’’خیر تو ہے۔‘‘ میں نے سوالیہ نگاہوں سے رخشی کی جانب دیکھا تو اس نے موبائل میری جانب بڑھا دیا دوسری جانب فراز تھا۔

’’فاریہ باجی میں اس لڑکی تک پہنچ گیا......‘‘ وہ آگے کچھ کہنے لگا تو میں نے اس کو خاموش کرادیا۔

’’تم میرا انتظار کرو میں آتی ہوں۔‘‘ میں نے موبائل آف کیا اور بال سمیٹتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

’’خیریت میڈم کہاں جانا ہے۔‘‘ رخشی نے گھبرا کر پوچھا تو میں نے کوئی جواب دیے بنا واش روم کا دروازہ کھول لیا۔

☆......☆......☆

آفس آنے تک میں گاڑی میں خاموش بیٹھی رہی جبکہ کریم صاحب مجھے بار بار کہتے رہے کہ بغیر سیکیورٹی کے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ ان کی بات کو میں سنی ان سنی کر رہی تھی۔

فراز میرے سامنے آیا تو وہ بہت جوش میں تھا۔

’’فاریہ باجی وہ لڑکی یہ رہی۔ یہ لوگ دراصل جس فیکٹری میں کام کرتی ہیں، وہ کپڑوں کی پیکنگ کے ساتھ منشیات کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ اس کی انہیں بعد میں خبر ہوئی جب انہوں نے آپ کو بتانا چاہا تو شاہ بخت درمیان میں آ گیا۔ یہ فیکٹریاں ان ہی لوگوں کی ملکیت ہیں۔‘‘ فراز نے بتایا تو میں نے گھوم کر اس لڑکی کی جانب نگاہ کی تو میری جان جیسے حلق میں آ گئی ہو۔

’’تم فیروزہ کی بیٹی ہو۔‘‘

’’جی آپ پہچان گئیں۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔

’’کیسے نہیں پہچانتی۔ تمہاری امی کا تو میرے اوپر

بہت بڑا فرض ہے۔ اگر وہ نہیں ہوتیں تو میں اکیلے اپنی امی کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتی تھی۔'' میں شدید اُلجھن کا شکار ہو چکی تھی۔ اگر اس کو کچھ ہو جاتا تو میری اتنی محنت کا کیا فائدہ تھا۔

''جلدی بتاؤ میراں تم اکیلی ہو یا اور بھی لڑکیاں ہیں۔'' میں بے حد بے چین تھی۔

''باجی میرے علاوہ 50 لڑکیاں اور ہیں جو اس دلدل میں ہیں۔ کچھ تو بے بس ہو گئیں اور کچھ میری طرح سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہیں۔ آپ کو میں نے ٹی وی پر دیکھا تو یہی سوچا کہ آپ میری مدد کر سکتی ہیں۔ میرا بچپن آپ کے گھر میں گزرا ہے۔ اماں نے آپ کے بارے میں اور سب کے بارے میں اتنا بتایا ہے کہ ہم آنکھیں بند کر کے آپ کی امی کا پیار اماں کے لیے محسوس کر سکتے ہیں۔ بس اللہ کے بعد یہی آسرا مجھے آپ تک لے آیا کہ آپ ان لوگوں سے ہمیں بچا لیں۔ جنہوں نے گھر بیٹھے لڑکیاں نیلام کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ غربت کے ہاتھوں ہم یہ سب کام کرنے پر مجبور ہیں۔ گھر میں کچھ بتا نہیں سکتے اور بتائیں بھی تو کیا؟ ہمارے کمزور ماں باپ کیا کر سکتے ہیں سوائے ہمیں زہر دینے کے اور فاریہ باجی آپ نے بھی ہار مان لی تو ہم زہر کھا لیں گے اور اس کا ذمہ دار اور کوئی نہیں آپ جیسے لوگ ہوں گے۔ جو باتیں تو بڑی بڑی کرتے ہیں لیکن وقت آنے پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔'' میراں نے کہا۔

''حد میں رہ کر بات کرو۔'' فراز طیش میں آ کر بولا۔

''حد!! کون سی حد جب اللہ کا نام پکارنے میں کوئی مسئلہ نہیں تو مجھے سچ بولنے کے لیے کسی بندش کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ فراز کو نظر انداز کر کے بولی تو میرا جسم کانپ اٹھا۔

'یا اللہ کتنے بڑے امتحان میں تو نے مجھے ڈال دیا ہے۔' میرا دل پکارا' پھر اُٹھ کر میں نے اسے گلے لگایا۔ ابھی آرام سے گھر جاؤ۔ پُرسکون ہو کر کام کرو تمہاری عزتوں کی حفاظت اللہ ہی کرے گا فاریہ باجی تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں یہ میرا وعدہ ہے تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ آج تم چین کی نیند سو جاؤ گی اور ان کا حساب شروع ہوگا۔'' میں نے کہا تو وہ چادر میں منہ چھپا کر واپس مڑ گئی۔

''فراز اس کی حفاظت کرنا اور پل پل کی خبر رکھنا۔ میں تمہیں پھر بلاؤں گی۔'' میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود کریم صاحب سے بات کرنے لگی جو انتہائی پریشان ہو رہے تھے۔

''بیٹا یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے آپ کی جان......'' تو میں بے اختیار ہنس دی۔

''میری جان! اس کی آپ فکر نہ کریں بلکہ ان کے بارے میں سوچیں جواب میرے راستے میں خود بخود آ رہے ہیں۔ میں نہیں بخدا میں نے ان کے بارے میں سوچنا تو درکنار ان کا نام تک اپنی زبان پر نہیں لاتی تھی کہ کہیں وہ ناپاک نہ کر دیں۔'' میں تلخی سے ہنس دی۔

''پھر بھی فاریہ بیٹی ہر قدم سوچ کر اٹھانا چاہیے۔ تم میرے پاس میرے دوست کی امانت ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔'' کریم صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں ہوگا مجھے آپ فکر نہ کریں۔ بس یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان لوگوں کے مخالف لوگ کون ہیں جن سے ہاتھ ملایا جائے۔ تاکہ کوئی ہم پر شک نہ کر سکے۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا لیا۔ ابھی تو منزل بہت دور تھی اور میرے کاندھوں پر بڑی ذمہ داری آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

سب لوگ سو رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے زینہ طے کیا اور کمرے میں آ گئی۔

''تم نے جتنی لڑکیوں کو بچایا ہے اب اس کا خمیازہ تم بھگتو گی۔'' ایک آواز میرے ذہن کے گوشوں سے ٹکرائی۔

''تمہاری اچھائی ہی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے مس فاریہ جمال۔'' یہ بس ایک یاد تھی جو میرے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ کاش یہ سب میں بھول جاؤں اور ان لڑکیوں کو بچا سکوں جن سے میں نے وعدہ کیا

ہے۔

میں بے چین سی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ رات بہت ہوگئی تھی، جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وضو کر کے فجر پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ ''کوئی تو راستہ ہوگا اللہ کے پاس۔'' میں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو بے اختیار روتی چلی گئی۔

☆☆......☆☆☆

پتا نہیں میں کتنی دیر ایسے بیٹھی رہی کہ رخشی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میڈم آپ تھوڑا سا آرام کرلیں صبح ہونے میں تھوڑی دیر باقی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم جاگ رہی تھیں۔''

''آپ جاگیں اور میں سو جاؤں! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' اس نے سر ہلایا تو میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ انتظار میں بیٹھی تھی۔

''آپ لیٹ جائیں۔'' اس کے لہجے کی محبت نے مجھے مجبور کردیا میں بیڈ پر تھی تو وہ لائٹیں آف کر کے باہر چلی گئی اور میں نہ جانے کیا کیا سوچتی ہوئی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح جب میں سو کر اٹھی تو میں نے بستی جانے کا پروگرام بنالیا اور ساتھ میں کچھ ضروریاتِ زندگی کا سامان اور سلائی مشینیں لے لیں تاکہ کسی کو شک نہ ہوسکے۔ کورٹ میں اپنے چیمبر میں بیٹھنے کے بعد میں نے بستی کا رُخ کیا۔ جہان عالم سے میرا رابطہ تھا جو میری جان کے حوالے سے بہت پریشان تھا۔

''جہان عالم کیوں بچوں کی طرح Behave کررہے ہیں۔'' میں نے پوچھا تو اس نے غصے سے موبائل آف کردیا۔ بستی میں مختلف لوگ مجھ سے ملتے رہے میں نے دیکھا سب عورتیں تھیں۔ ان کے ساتھ لڑکیاں نہیں تھی۔

''کیوں اماں جی آپ کی لڑکیاں نہیں ہیں۔'' تو ان کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

''جی ہیں تو مگر وہ فیکٹری میں کام کرنے گئی ہیں۔ شام تک آنا ہوتا ہے۔'' انہوں نے سوچ سمجھ کر کہا۔

''آپ کے یہاں اور کوئی کام کرنے والا نہیں۔'' کریم صاحب نے سوال کیا۔

''نہیں جی وہ بس ایسے ہی مختلف روزگار کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے نگاہ جھکا کر کہا تب ہی کوئی سائرن سے بجنے لگا۔

''آج پھر کوئی اپنی جان سے گیا۔'' کوئی ہلکے سے بولا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہ کیسی آواز ہے۔''

''پاس میں فیکٹریز ہیں کسی ورکر کے چوٹ لگ گئی ہوگی۔'' کسی نے جواب دیا تب ہی فراز بھاگتا ہوا آیا۔

''فاریہ باجی ایک لڑکی اپنی جان سے چلی گئی۔ لوگوں میں بہت خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو میری جان نکل گئی۔

''وہ میراں تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنے خشک ہوتے لبوں سے پوچھا۔

''وہ محفوظ ہے۔''

''اوکے میں فیکٹری جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے راستہ بتاتے ہوئے کہا۔

''مگر فاریہ باجی وہاں آپ کو دیکھ کر یہ لوگ مشکوک ہوجائیں گے۔'' فراز بری طرح گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' لوگوں کو ہٹاتی ہوئی میں آگے بڑھی۔

''وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' کریم صاحب بھی پریشان تھے۔

''میں نے تیزی سے قدم آگے بڑھائے تب ہی کریم صاحب بھی آگئے۔ دس منٹ کا ہی فاصلہ تھا، میں نے گاڑی سے اترتے ہی آنکھوں کو سیاہ گلاسز میں چھپالیا۔ وہاں بے تحاشا ہجوم تھا۔ میں آگے بڑھی تو گارڈز نے میرا راستہ روک لیا۔

''مالک نے کسی کو بھی اندر آنے سے منع کیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''راستے سے ہٹ جاؤ۔'' فراز اور دوسرے لوگوں نے انہیں ایک طرف دھکیلا تو میں اندر چلی گئی۔ کریم صاحب میرے ساتھ ساتھ تھے۔ اندر

لڑکیوں کا شور تھا، چیخیں تھیں جو آسمان کو چھو رہی تھیں۔ میراں نے میری جانب بڑھانا چاہا تو میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں آگے بڑھی وہ لڑکی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''آپ فاریہ باجی ہیں نا'' اس نے پوچھا تو میں نے بمشکل سر ہلایا۔

''باجی میں نے تو زہر کھالیا۔ میں بچوں گی نہیں لیکن آپ ان معصوم لڑکیوں کو بچالیں۔ ہم غلط کام نہیں کرنا چاہتے تو اس کی سزا موت ہے، جو مجھے مل گئی۔ فاریہ باجی ہمارے ہاں لڑکیاں مجبور ہو کر اپنا آپ بیچنے کے لیے تیار ہیں تو پھر کیا اس ملک کا سائبان ہمارے لیے نہیں بنا اور ہمارے ماں باپ کی مجبوریاں ہمیں خود اس تکلیف دہ زندگی کو گزارنے کا مشورہ دیتی ہیں اور ہمارے بھائی نشے کی حالت میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ان کی بہنیں ہیں۔ وہ خود ہمیں یہاں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور جو شادی شدہ ہیں ان کے شوہر چھوڑ کر جاتے ہیں۔ باجی ہم مرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں مارا جارہا ہے اور سب خاموش ہیں۔ آپ اس میں ہمارے لیے کیا کر سکیں گی۔ ہمارے وجود کو روندا جارہا ہے۔'' اس نے ہچکی لی۔

''کریم صاحب اس کو اسپتال تو لے کر جاسکتے ہیں، شاید یہ بچ جائے۔'' میں نے بے بسی سے کہا اور موبائل پر بات کرنا شروع کی۔

لڑکوں نے آناً فاناً اُسے اٹھالیا تاکہ اسپتال جاسکیں تب ہی میں کسی کی آواز پر چونک کر اٹھی۔ سامنے ہی شاہ بخت اور شاہ بخت کھڑے تھے۔ میں نے اطراف میں نگاہ کی تو لڑکیاں ان سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دل تو کر رہا تھا ان دونوں کو ان لڑکیوں کے حوالے کر دوں جو ان کی بوٹیاں بوٹیاں کرنے کو تیار تھیں مگر یہ وقت جوش کا نہیں بلکہ ہوش کا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ تب ہی کسی نے میرے ہاتھ میں ایک پیپر تھمادیا، جسے میں نے ہاتھ میں دبالیا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو۔'' شاہ بخت میری طرف بڑھا۔

''تم نہیں آپ اور شاہ بخت ہم پولیٹیکل لوگ ہیں۔ جہاں بھی دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہو وہاں خود جاتے ہیں۔ ویسے میں تو یوں ہی اس بستی کی طرف آگئی تھی۔ آخر یہاں سے مجھے بڑا ووٹ بینک مل سکتا ہے۔'' میں مسکرائی۔

''کیا تم ہم سے ہاتھ ملانے آئی ہو'' اس کے ماتھے پر پڑے بل اور گہرے ہوگئے۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے مگر فی الحال یہ ہجوم ہٹاؤ۔ دوسری ملاقات میں ہم اچھی طرح سے بات کرسکیں گے۔'' میں نے کہا اور اطمینان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ گاڑی میں بیٹھی تو مجھے اپنے ہاتھ میں دیے پیپر کا ذہن میں آیا۔ کھول کر دیکھا تو ٹیڑھی میڑھی تحریر میرے سامنے آئی۔

''فاریہ باجی جو لڑکی کپڑوں کی سلائی کرتے ہوئے منشیات نہیں رکھتی اس کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے۔ 15 لڑکیوں کو یہ لوگ آج شپ کے ذریعے باہر سپلائی کر دیں گے اور اس میں میراں کا نام بھی شامل ہے۔ ہمارے گھر والوں کو ہماری قیمت خرید دے دی گئی ہے۔ وہ ہمیں ہنسی خوشی جانے دے رہے ہیں۔ ہمیں بچالیں ورنہ آدھی سے زیادہ لڑکیوں نے تو مرنے کی ٹھان لی ہے۔ فاریہ باجی یہ ملکِ خداداد ہے۔ جہاں ایک لڑکی کی پکار پر محمد بن قاسم سندھ آیا تھا اور اب کوئی نہیں آئے گا۔ ہم غربت سے لڑ سکتے ہیں لیکن اپنے گھر والوں سے نہیں، ہے نا حیرت کی بات۔ آج بھی ہم چودہ سو سال پہلے والے دور میں جی رہے ہیں۔ جب اسلام آیا اس نے عورت کو عزت دی اور ہم اسلام کے نام پر نام نہاد نکاح ناموں پر سائن کر کے ہر روز ایک نئی رات سجائیں گے۔ اللہ کے بعد ہمارا آخری سہارا آپ ہیں، ورنہ یقین کریں کہ روزِ قیامت ہم بھی اسی لائن میں کھڑے ہوں گے جس میں آپ کا حساب کتاب ہو رہا ہوگا۔ ہمیں بچالیں۔'' آگے کچھ اور کہنے کی کوشش کی گئی مگر جلدی میں لکھا نہ جاسکا۔

''یہ ڈر نہیں تھا بلکہ میرا امتحان تھا۔ میں A/C گاڑی ہونے کے باوجود پسینے میں بھیگ گئی۔ یا اللہ یہ کیسی آزمائش رکھ دی میرے لیے پہلے ہی اتنی گناہ گار اور اب اتنا بڑا بوجھ میرے اوپر لاد دیا۔ میرے مالک میں یہ سب کیسے کر پاؤں گی۔'' میں کانپ رہی تھی۔

''کریم صاحب یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ آپ تو جانتے ہیں میری زندگی کیسی گزری ہے اور اب یہ سب کچھ...... میں کیا کروں۔'' میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ میں دبا کاغذ انہیں دینے کی بات کی۔

''بیٹے یہ وقت ہمت ہارنے کا نہیں بلکہ کچھ کرنے کا ہے۔ تم نے جہان صاحب سے بات کی۔''

''جی وہ نہیں آ رہے ہیں لیکن ان کے آنے سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ گھر آ گیا۔

☆☆......☆☆

''آپ کہاں گم ہیں ہم ملنے آتے ہیں تو آپ یا تو ہوتی نہیں ہیں یا پھر سو رہی ہوتی ہیں۔''

سونیا دوڑ کر آئی تو میں نے پیار سے اس کا ماتھا چوما اور لان میں ہی بیٹھ گئی پیروں سے سینڈل اُتار کر لان میں بکھری گھاس کی ٹھنڈک محسوس کرنے لگی تب ہی کسی نے میرے پیروں کو نیم گرم پانی کے ٹب میں ڈال دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو رخشی تھی۔

''تمہیں میں نے کتنا منع کیا ہے کہ یہ سب مت کیا کرو، پھر بھی تم باز نہیں آتیں۔'' میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''کرنے دیں نا فاریہ باجی! مجھے آپ کو پُرسکون دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور اگر میں آپ کا خیال نہ رکھوں تو آپ بالکل لاپروا ہو جائیں گی۔ میں جانتی ہوں۔'' وہ ہنس کر بولی تب تک سمعان بھی آ گیا۔ اونچا لمبا خوبصورت سا جو ہمارے گھر کی پہلی خوشی تھا۔

''کہاں ہیں پھوپو جانی۔'' اس نے پوچھا۔

''تم سناؤ تمہارے حالات ٹھیک چل رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل صحیح ہیں۔'' اس نے چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھمایا۔ اتنے میں بھابی، بڑے بھائی بھی آ گئے۔

''اچھا تو چائے کا دور چل رہا ہے۔'' بھابی نے کہا تو میں ہنس دی۔

''آپ سب لوگوں سے مجھے ایک بات کہنی تھی۔'' میں نے چائے کا کپ ختم کرتے ہوئے کہا تو وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔

''کچھ دنوں کے لیے آپ سب آنے جانے میں احتیاط سے کام لیں، خاص طور پر تم تینوں۔'' میں نے سمعان، سونیا اور صوبی کی طرف دیکھا۔

''کیوں کیا کوئی پرابلم ہے۔'' بھابی نے پوچھا۔

''نہیں بس احتیاط اچھی چیز ہے۔ کچھ دنوں تک میں یہاں ہوں تب تک تھوڑا سا خیال کر لیجیے گا کیونکہ کون سجن ہے کون دشمن یہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف ہو اور ہاں شان سے بھی کہہ دینا کہ آنے جانے میں خیال رکھے۔'' میں نے شان کو غائب دیکھا تو خاص طور پر کہا۔

''میں کوشش کروں گی یہاں سے شفٹ ہو جاؤں۔'' میں نے ان سب کی سوالیہ نگاہوں سے بچتے ہوئے کہا۔

''آپ کہیں نہیں جائیں گی بس۔'' سونیا نے میرا ہاتھ تھاما۔

''مجبوری ہے بیٹا۔'' میں نے اس کا سر سہلایا۔

''ایک بات مجھے بھی آپ سب سے کرنا ہے لیکن ابھی نہیں۔ میں اتنا کہوں گی کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں، ان کے رشتے طے کر دینے چاہیں جیسے کہ بچپن میں طے تھے۔'' میں نے اچانک سے کہا۔

''مگر تمہارے بہنوئی مان جائیں گے۔'' بھابی نے کہا۔

''بالکل! کیوں کہ وہ امی کا کہا ٹال نہیں سکتے۔ میرے پاس ان کے لکھے ہوئے خط ہیں جو میں نے کبھی پوسٹ نہیں کیے، بس آپ اپنا مؤقف درست کر لیں تو سب صحیح ہو جائے گا گھر کی بنیادیں مضبوط

ہو جائیں گی۔'' میں نے سکون سے پیر پانی سے نکالے سینڈل پہنے اور انہیں خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

''اگر تم نے سوچا ہے تو بات بھی تم کرو گی میں نہیں اور پہلے وہ لوگ آئیں گے۔'' بڑے بھائی کی آواز نے میرے قدم روک دیے۔

''پہلے وہی آئیں گے۔'' میں نے مڑ کر کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

اُف زندگی بس کیا ہے جو بات پہلے میں کر نہیں سکتی تھی آج کتنے آرام سے کہہ دی اور عمل بھی مجھے ہی کرنا تھا۔'' میں واش روم سے باہر آئی دیکھا تو رخشی میرے لیے چائے بنا رہی تھی۔

''فاریہ باجی آپ ہر بات میں اتنی جلدی کیوں کر رہی ہیں۔ آپ تو ہفتوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام گھنٹوں میں کر رہی ہیں۔ ایسی کیا جلدی ہے آپ کو۔'' وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں جو ہمیشہ کی طرح سے اپنے بالوں کی لٹیں انگلی پر لپیٹتے ہوئے چائے کا کپ اُٹھا رہی تھی۔

''پتا نہیں کتنی زندگی ہے اگر آرام کرنا شروع کر دیا تو بہت سارے وعدے ادھورے رہ جائیں گے۔ اور میں بھی کسی عام پولیٹیشن کی طرح ہو کر رہ جاؤں گی اور کچھ فرائض ہیں جو مجھے نبھانے ہیں۔'' میں نے لمبا چوڑا جواب دیا۔

''اور شادی کب کریں گی۔'' رخشی کی سوئی ایک ہی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

''زندگی رہی تو وہ بھی ہو جائے گی۔'' میں مسکرا دی۔

''پتا نہیں میں کن باتوں میں اُلجھ گئی۔ تم ایسا کرو میرا سادہ سوٹ نکال دو اور ایک بڑی شال بھی نکال دینا۔ مجھے خاص جگہ جانا ہے۔'' میں نے چائے کا کپ عجلت میں ختم کیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کریم صاحب کا فون آئے تو مجھے بتا دینا۔ میں ذرا ایک چکر گھر کا لگا لوں۔'' میں اٹھی اور نیچے آ گئی۔

سب کچھ پہلے جیسا تھا' بدل گیا تھا تو شاید میرا دل میں نے دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹا اور واپس کمرے کی طرف جانے لگی۔ مجھے جہان کے فون کا انتظار تھا۔ وہ جو لڑکیاں ان کے جال میں پھنس گئی تھیں۔ ان کو بھی بچانا تھا۔ کاش مجھے اتنا ٹائم نہ لگتا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ ٹائم تھا کہ تیزی سے گزرتا جا رہا تھا' کہیں بھی سکون نہیں تھا کاش...... تب ہی بیل بجی دوسری طرف جہان عالم تھا۔

''جہان تم کہاں ہو۔ میں کمزور پڑ رہی ہوں۔'' میرا دل خراب ہو رہا تھا۔

''میں آ چکا ہوں مگر میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تم اس چکر میں اُلجھ کیسے گئی ہو۔'' اس کے لہجے میں خفگی اُتر آئی۔

''شاید یہ میرے بدلے کی آگ ہے، جس نے مجھے وہاں تک پہنچا دیا اور میراں کو ذریعہ بنا دیا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اچھا پلیز اب رونا مت، آ گیا ہوں نہ میں۔ اب تم تفصیل اور آرام سے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' اس کی آواز میں دھیما پن آ گیا۔

''اب کیا ہو گا۔'' میں بہت پریشان تھی اس کا موبائل بند ہو گیا۔ میں جانتی تھی کہ اب سب صحیح ہو جائے گا۔

''کریم صاحب!'' آج آپ مل لیں جو بھی آئے میرا یہی بتائیے گا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔''

''مگر......'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں میراں کا مسئلہ حل ہونے تک کچھ نہیں کر پاؤں گی، ویسے بھی باقاعدہ آفس جوائن کرنے میں تو ٹائم ہے تب تک سب معاملات سیٹ ہو جائیں گے۔'' میں نے انہیں سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے میں جب ضد پر اڑ جاتی ہوں تو مجھے کوئی نہیں ہلا سکتا۔

''فاریہ وہ لوگ گرفتار ہو گئے ہیں' بس شاہ بخت نہیں مل سکا۔ تم اس وقت بستی آ سکتی ہو۔'' میں جو جاء نماز پر بیٹھی پتا نہیں کیا کچھ اللہ سے مانگے جا رہی تھی ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''وہ بچیاں حفاظت سے ہیں نہ' انہیں تو کچھ نہیں ہوا۔'' میں بے چین تھی۔

''ہاں وہ لوگ ٹھیک ہیں تم اپنا آپ قابو میں رکھو۔'' جہان کے لہجے میں ناگواری ابھر آئی۔ اُسے میرے آنسو کبھی پسند نہیں آتے تھے۔

''تم نہیں جانتے جہان تم نے کیا کیا ہے میرے لیے۔ پوری دنیا قدموں تلے لا رکھی ہے۔ وہ لڑکیاں اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو میں تو بے موت ختم ہو جاتی۔'' میں نے جاء نماز تہہ کی اور موبائل آف کر کے باہر نکل آئی۔

''میڈم خیر تو ہے۔'' رخشی بھی اُٹھ کر آ گئی۔

''ہاں ہاں ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے اور تم کریم صاحب کو بھی انفارم کر دو کہ بستی چلنا ہے۔''

''کیا!! اس وقت رات کے چار بجے۔'' رخشی حیران ہوئی۔

''ہاں وہ جہان کی کال آئی تھی۔'' میں نے جلدی سے اپنے بال ہاتھوں سے سلجھائے اور شال لپیٹ کر نیچے آ گئی۔

''کہیں جا رہی ہو۔'' پتا نہیں بڑے بھائی کہاں سے نکل آئے۔

''جی وہ ارجنٹ کال ہے۔ میرے ساتھ رخشی، کریم صاحب بھی جا رہے ہیں۔'' میں سولہ برس کی لڑکیوں کی طرح سے گھبرا گئی تو وہ سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بستی پہنچے تو ایک عجیب سی افراتفری کا سماں تھا۔ جہان عالم کا خاص آدمی نادر مجھے دیکھتے ہی قریب آ گیا۔

''میڈم شاہ بخت کے سوا سب لوگ پکڑے گئے' لڑکیاں محفوظ ہیں۔'' اس نے جھک کر بتایا تو میں دوڑتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں گھس گئی، جہاں میراں بھی تھی۔ میں نے اسے لپٹا لیا۔

''شکر ہے اللہ کا تم سلامت ہو، ورنہ میں روزِ قیامت اپنی ماں کو کیا منہ دکھاتی۔'' میں رو رہی تھی۔

''فاریہ باجی آپ ہماری زندگی ہو۔ آپ نے ہمیں بچا لیا، ورنہ ہمارے ماں باپ نے تو ہمیں ان کتوں کے آگے پھینک دیا تھا۔'' میراں میرے گلے سے لگی سسک رہی تھی۔ تب ہی میڈیا کی لائٹیں چمکیں اور سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

☆......☆......☆

صبح کا اُجالا ایک نئی کرن لے کر آ رہا تھا۔ فیکٹریاں سیل ہو گئی تھیں۔ میرے دل کو سکون مل رہا تھا۔ میں نے وہاں جلد ہی نئی فیکٹری شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ لڑکوں نے نشے کے تمام غیر قانونی اڈوں کو توڑ دیا تھا اور میری آواز گونج رہی تھی۔

''آج کے بعد کسی نے بھی لڑکیوں کو ان کی مرضی کے خلاف کام پر مجبور کیا تو آپ اپنی فاریہ باجی کو کبھی آواز مت دیجیے گا۔ یہ لڑکیاں آپ کے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ آپ انہیں گھر کی چار دیواری میں محفوظ رکھیں۔ ہو سکے تو جلد از جلد ان کو اپنے گھروں کا کر دیں تاکہ ان کی عزتیں محفوظ رہیں۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد اجتماعی شادی کا دن ہے ان 25 لڑکیوں کی شادی کا فرض میں پورا کر دوں گی۔ میراں کے لیے فراز اور باقی لڑکیوں کے لیے آپ ان تمام لڑکوں میں مناسب دیکھ کر رشتے طے کر دیں۔'' میں نے کہا تو فراز کے والدین نے میراں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ میں خوش ہو کر گھر کی جانب لوٹ آئی۔

جہان کی کال آئی تو میں بہت خوش تھی۔

درد کی ایک تیز لہر میرے دل میں اُٹھ گئی۔ کاش وقت پلٹ جائے اور میں ان کے قدموں میں پیش کر کے اپنے سارے آنسو بہا دوں۔ انہیں بتاؤں کہ وقت کتنا ظالم ہے۔ اس نے مجھ سے کتنے بڑے امتحان لیے ہیں۔ میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ تب ہی دروازہ کھلا۔

''کیا ہو گیا ہے کوئی بات ہے۔'' بڑے بھائی کی آواز سن کر میرے ہاتھ سے کتاب گر گئی تھی۔ بس ایسے ہی میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

''یہ اویس کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم موبائل نہیں اٹھا رہی ہو۔'' انہوں نے کارڈلیس میری جانب بڑھایا تو میں نے تیزی سے ہاتھ میں لے لیا۔

''کیسے ہو تم اور کہاں تھے۔'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''آپ بس ایسے ہی سوالات کرتی رہیں گی یا

مجھے بھی کچھ بولنے دیں گی۔'' اس کی شوخ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''اور بس میں نے زندگی کی آدھی جنگ جیت لی ہے۔'' میں خوش تھی۔

''ہاں پڑھ چکا ہوں جناب میں آپ کے کارنامے کیا۔ آپ کو اپنا ذرا سا بھی خیال نہیں۔ اگر کچھ ہو جاتا تو ہم لوگ کیسے جی پاتے، یہ نہیں سوچا۔'' وہ ناراض سا بولا۔

''مجھے کیا ہونا ہے ٹھیک ہوں۔'' میں ہنس دی۔

''بہرحال آپ اتنے رسکی کام نہیں کریں گی اور ہاں ان کا کیا حال ہے پورے جہان کا جو خیال رکھتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں شوخی نمایاں تھی۔

''بکواس نہیں کرو۔'' میں نے فون بند کر دیا۔ کچھ عجب سی خوشی میرے اندر اتر آئی تھی۔ میں نیچے آئی تو ڈائننگ ٹیبل پر بڑے بھائی وغیرہ بیٹھے تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''فاریہ جانی آپ خوش ہیں نا اپنے کمرے کی ترتیب دیکھ کر۔'' مہوش نے کہا۔

''اونہو یہ تم الگ کیا ٹاپک لے کر بیٹھ گئے۔'' بھابی نے انہیں ٹوکا تب ہی باہر سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ بے تحاشا فائرنگ، بھاگتے لوگوں کے قدم اس سے پہلے کہ کسی نے آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو انجان سے لوگ اندر داخل ہو گئے۔ سب اپنی جگہ Still ہو گئے۔

''فاریہ ہمارے ساتھ چلو ورنہ ہم۔'' وہ مہوش اور سونیا کی طرف بڑھے۔

''تو تم اتنا گر گئے ہو کہ...... مجھے تم سے امید نہ تھی۔'' انجانے انداز میں کہا اور میں بڑے بھائی سے ہاتھ چھڑایا اور لوگوں کی جانب بڑھ گئی۔ سب کی چیخیں آوازیں مجھے نہیں روک سکیں۔

'رکھا کیا ہے میری جان میں۔' ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا اور گاڑی میں سنجیدگی'' کاش زندگی یہیں ختم ہو جائے۔'' میں بے درد ہو رہی تھی۔ کون ہے جو میرے لیے روئے گا۔ میں ہر محبت کو ٹھکرا رہی تھی۔

گاڑی رکی انجان جگہ تھی مجھ سے اترنے کو کہا میں خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی تھی۔ شاہ بخت سے مجھے ہر امید تھی مگر یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے انتقام لینے کے لیے میری جان لینے پر اتر آئے گا۔ یہی شاہ بخت کبھی محبت تھا میرے لیے میری زندگی تھا اور آج موت بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

میرے اغواء کی خبر پھیل چکی تھی باجی رملہ سب ہی لوگ گھر آ گئے تھے۔ مجھے وہ مجبور کر رہا تھا کہ میں اپنا بیان واپس لوں اور اس سے شادی کر لوں جو کہ ناممکن تھا۔ میں جان عالم کے ساتھ دھوکہ نہیں کر سکتی تھی اور شاہ بخت کی محبت تو میرے دل سے اسی دن ختم ہو گئی تھی۔ جب وہ میری امی کے جانے کا سن کر بھی فون نہ کر سکا تھا۔ تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ کبھی مجھے ملا تو زمین میں گاڑ دوں گی۔ یہی تھا نا جس کی خاطر میں نے سب کی نفرت سہی اور آج تک میرے افسانے ہر بچے کے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ میں کیسے اسے معاف کر سکتی تھی۔''

مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ مجھے قید ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ میں نے بے بسی سے سوچا۔

''ہاں تو پھر کیا سوچا تم نے۔'' شاہ بخت میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے جواب دیے بنا منہ پھیر لیا۔

''تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟'' اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

''دور رہو۔'' میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''فاریہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔'' وہ غلط تیور لیے آگے بڑھا۔

''ہوش ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔'' میں نے غرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔'' وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ تب ہی میں نے بلاؤز کے اندر چھپا ہوا پسٹل نکال لیا، جو استعمال تو کبھی نہیں کیا لیکن جہان کی ہدایت کے مطابق ہمیشہ میری کمر کے ساتھ رہتا تھا ان لوگوں نے میری تلاشی نہیں لی تھی اور یہی بے وقوفی میرے کام آ گئی وہ اور قریب آیا۔ میں نے ساڑی کے پلو

سے اس پر نشانہ لگا دیا گولی اس کے دل میں اتری۔
''فاریہ۔'' وہ جھٹکا کھا کر ہٹا نہ جانے مجھے کیا ہوا وہ مر رہا تھا اور میں اس کے قریب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ ''یہ میری محبت کا قرضہ بھی ہے اور ان تمام لڑکیوں کی آہیں بھی جنہیں تم لوگوں نے برباد کیا۔ ویسے میرے دل کو سکون مل رہا ہے اور تمہارا شکریہ بھی ادا کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اگر تم مجھے مکر و فریب کی دنیا نہ دکھاتے تو آج میں اس مقام پر نہ ہوتی۔ جہاں آج ہوں۔ اس وقت تم نے ایک بزدل سہمی سی لڑکی دیکھی اور آج فاریہ جمال MPA تمہارے سامنے ہے۔ تمہارے جسم سے جو گندا خون بہہ رہا ہے۔ وہ میری ماضی کی ہر کثافت کو دھو رہا ہے۔'' میں اطمینان سے کھڑی تھی غلطی تو وہ کر چکا تھا کمرہ تو ساؤنڈ پروف اور اندر سے لاکڈ تھا اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے اطراف میں دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔
''فاریہ۔'' شاہ بخت کی آواز مجھے متوجہ کر گئی۔
''میں ایسا نہیں تھا میں سچ مجھے تم......''
''آگے ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے یہ سب کہنے کا۔'' میں بولی۔
''میرے دل میں کچھ نہیں ہو رہا تھا اس کا وجود ساکت ہوگیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے شاہ بخت کا موبائل مل گیا۔ میں نے جھپٹ کر موبائل اٹھالیا تیزی سے جہان کا نمبر ڈائل کیا۔
''تم ٹھیک ہونا۔'' وہ بے تابی سے چلایا۔
''ٹھیک ہوں جہان مگر وہ شاہ بخت، تم جلدی سے آؤ مجھے نہیں پتا میں کہاں ہوں۔'' میں رو دینے کو تھی۔
''تم دروازے سے ہٹ جاؤ کسی کونے میں ہو جاؤ ہم لوگ آ چکے ہیں۔ فون بند ہوگیا۔ میں کارنر پر ہوگئی ایک دو لمحے کے بعد دروازہ بجنے لگا اور......
''فاریہ۔'' کوئی میرے قریب آ کر بولا میں نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں تو جہان عالم میرے سامنے تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے گلے لگ جاؤں مگر اس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رُک گئی۔ کریم صاحب رخشی بھی ساتھ تھے۔ رخشی میری جانب آئی۔
''میڈم آپ ٹھیک ہیں نا۔'' وہ پریشان سی مجھ کو ٹٹول رہی تھی۔
''جہان میں نے اِس کو مار ڈالا۔ آج میں پاور میں ہوں۔'' میں بے ربط سے انداز میں بولی۔
''جہان میرا پسٹل ......'' اس نے رخشی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے باہر لے جائے۔ وہ مجھے لے کر گاڑی تک آگئی۔ پولیس ایمبولینس لوگوں کا ہجوم تھا۔
میں رخشی کے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔
''چلیں میڈم۔'' اس نے مجھے سہارا دیا۔ میں نے اترتے ہوئے دیکھنا چاہا تو مجھے چکر آ گیا میں گرنے والی تھی کہ بہت سارے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ سمعان، شان اویس چاروں مجھے اٹھا چکے تھے۔
سب لان میں کھڑے تھے انہوں نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔
''تم ٹھیک ہو نا۔'' بڑے بھائی کا لرزتا ہاتھ میرے سر پر آ ٹھہرا۔ میں نے بے تابی سے انہیں دیکھا میں نے ان کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔
''میں ٹھیک ہوں بس اتنی دیر کے بعد کیوں پوچھا۔ مر جاتی تو کبھی نہ جان پاتی کہ آپ کے دل میں میرے لیے کیا ہے۔'' میں رونے لگی۔
''ایسا کیوں سوچتی ہو تم۔ ہم تو ہمیشہ سے تمہارے لیے فکر مند رہتے تھے۔'' انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا تو میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔ یہ پیار کتنا ظالم ہوتا ہے کبھی تڑپاتا ہے تو کبھی ابر بن کے برس جاتا ہے۔

☆......☆......☆

جب میں ہوش میں آئی تو سب کے چہرے کھل اٹھے۔
''اوہ فاریہ جانی آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔'' شہوار نے میرا ہاتھ پکڑا رملہ اور آپی بھی کھڑی تھی۔
''سوری وہ مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا تھا۔'' میں اٹھنے لگی۔
تو بڑے بھائی میرے پاس آ بیٹھے۔
''کبھی کبھی ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کر دیتے ہیں۔ بس اب معاف کر دو۔''
''بس آگے کچھ نہ بولیں۔ مجھے آپ سے کوئی

شکایت نہیں۔'' میں نے ان کو خاموش کرا دیا۔
''میڈیا والے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' کریم صاحب آئے۔
''میری طرف سے معذرت کرلیں میں کچھ دیر بعد یا کل...... جو آپ کی سمجھ میں آئے وہ کہہ دیں۔ ابھی میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوں۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔
''رخشی تم میرا براؤن بیگ لے آؤ جو تم جانتی ہو۔'' تو وہ سر ہلا کر اندر چلی گئی۔
''تم اتنی دور کیوں ہوگئی تھیں بیٹا ہم سے۔'' باجی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔
''ہاں فاریہ تم نے ہمیں بچانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا۔'' بھابی نے کہا۔ ''اور جو میری گڑیا کو کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتی تھی۔'' میں نے مہوش اور سونیا کو پیار سے دیکھا تب ہی رخشی میرا بیگ لے آئی۔ میں نے اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور اپنے بہنوئی کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پڑھتے گئے۔
''یہ امی کی خواہش تھی جو کبھی دینے کی ہمت نہیں کر سکی لیکن اب آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ ان بچوں کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' میں نے پُر امید نگاہوں سے دیکھا تو وہ بڑے بھائی کے سامنے آ گئے۔
''فاریہ کی جان کے صدقے میں تمہاری امی کی اُمید کو پورا کرنا چاہوں گا۔ کیا تم اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے اویس اور فہد کو قبول کرتے ہو۔'' انہوں نے کہا۔
''کیوں نہیں دل و جان سے مگر درشہوار میرے سمعان کی ہوگی۔ بڑے بھائی نے انہیں گلے سے لگایا۔
''یہ کیا ہے فاریہ جانی! آپ نے تو ہمیں ہتھکڑیاں پہنا دیں اور خود آزاد گھوم رہی ہیں۔'' درشہوار نے زوردار پیار کرتے ہوئے کہا تو میں بے تحاشا ہنس دی۔ تب ہی کریم صاحب نے آپی رملہ اور بڑے بھائی سے کچھ کہا تو انہوں نے ہاں میں سر ہلا دیا تب ہی گیٹ کھلا اور دو بلیک گاڑیاں اندر آ گئیں۔ میں نے پلکیں جھپکتے ہوئے دیکھا۔ جہان عالم اور اس کی امی آ رہے تھے۔ جہان عالم جو آئی ایس پی کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ لینڈ لارڈ تھا۔ وہ میرا سہارا بنا تھا تب ہی تو سیاست کے میدان میں اپنا مقام بنا پائی تھی۔
''رخشی میں اندر جا رہی ہوں۔'' میں گھبرا اٹھی وہ سب سے مل رہا تھا۔ قہقہوں اور ہنسی کی بہار تھی۔ اس کی امی نے ڈائمنڈ رنگ پہنا کر میرا ہاتھ تھاما چوما' جہان کو سب نے دھکیل کر میرے برابر بٹھا دیا۔ چاروں لڑکے دھمال ڈال رہے تھے۔ مہوش سونیا اور درشہوار میرے گرد کھڑی تھیں۔
''بہت اچھا کیا آپ نے۔ انہوں نے ہمیں تو پھنسا دیا تھا اور خود مزے کر رہی تھیں۔'' رملہ کے بچے بھی کود رہے تھے۔
''تم خوش ہونا۔'' بڑے بھائی نے پوچھا تو میں آسودگی سے مسکرا دی۔
''ان بچوں کی رسم ادا کر دیتے ہیں۔'' رملہ نے کہا۔
''کوئی نہیں انہوں نے منگنی کی ہے ایسی بات ہے تو جب یہ نکاح کریں گے تو ہم منگنی کریں گے۔'' چاروں لڑکے بولے۔
رات بہت روشن تھی۔ سال کا سب سے بڑا چاند آسمان پر طلوع ہو رہا تھا اور میری زندگی ایک نئی بہار لے کر آ رہی تھی۔ میں نے نکاح نامے پر سائن کر کے سر اٹھایا تو میڈیا کی لائٹس آن ہوگئیں۔
سب خوش تھے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ میں نے چاند کو دیکھا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ امی اور ابا تو اسی جگہ بیٹھے ہیں جہاں وہ بیٹھے تھے۔ خوشی ان کے چہروں پر تھی میں جیت چکی تھی اور مجھے کامیاب کرانے والا شخص میرا اپنا ہو چکا تھا۔ امی ابا کا گھر آباد ہوگیا تھا۔ چاند سے شعاعیں نکل رہی تھی اور ہم سب خوشیوں کی برسات میں بھیگ کر اپنے مستقبل کو خوبصورت ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یہی پیار جو ہمارے درمیان کبھی گم ہوگیا تھا اب واپس آ گیا تھا۔

☆☆......☆☆

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

سماج سیوا

حمیرا خان

اُس نوجوان کی کہانی، جو لوگوں کی اپنے انوکھے ڈھنگ سے سماج سیوا کر رہا تھا



"امی جی ابھی تک کوئی بھی گھر نہیں آیا۔ فرج میں گوشت بھی ختم ہو گیا ہے اور سبزی بھی کوئی نہیں رکھی، آج دوپہر کے کھانے کا کیا کرنا ہے؟ دال بنا لوں؟" گھر کے کاموں سے فارغ ہوتے ہی عدیلہ کو دوپہر کے کھانے کی فکر ستانے لگی تھی۔ جانتی تھی کہ اس گھر کے سبھی افراد بھوک کے بہت کچے ہیں۔

"خالی دال بھلا کون کھائے گا، ذرا ٹھہرو میں لا دیتی ہوں سبزی گوشت، اور کچھ منگوانا ہے تو وہ بھی پرچی پر لکھ دو۔"

صالحہ ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے بے توجہی سے بولی اور پھر سے ڈرامے میں گم ہو گئی تو عدیلہ بھی منہ بناتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ جانتی تھی کہ ساس صاحبہ کا پسندیدہ ڈرامہ لگا ہے اس لیے سامان کے لیے مزید انتظار کرنا ہوگا۔

"اور دیر ہونے پر پھر شامت بھی میری ہی آئے گی" اس نے جھنجھلا کر سوچا اور ہاتھ میں پکڑے کپڑے بستر پر پٹخ دیے جو آتے ہوئے تار پر سے اتارتی آئی تھی تاکہ استری کر کے الماری میں لٹکا دیے۔

"خدا غارت کرے ان بجلی والوں کو ذرا جو کوئی کام سکون سے کرنے دیں۔ عدیلہ ابھی تک پرچی پر سامان نہیں لکھا تم نے، پھر کہو گی سامان دیر سے آیا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔"

بجلی جانے پر شکر ادا کرتی عدیلہ نے بنا کوئی جواب دیے پرچی ان کے ہاتھ میں تھما دی اور وہ بجلی والوں کو کوستی چادر سنبھالتی باہر کی طرف بڑھ گئیں تو عدیلہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔



"توبہ ہے آج تو گرمی بھی غضب کی پڑ رہی ہے، ایسے میں بھیج دیا مجھ بڑھیا کو یہ سب خریدنے۔ آج وہ منحوس شمشیر بھی تو صبح سے غائب ہے۔ آئے گا شام کو خبر لوں گی اچھی طرح۔"

رکشے کے انتظار میں کھڑی صالحہ گرمی اور سامان کے بوجھ سے گھبرا گئی تھیں مگر رکشے کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔

صالحہ جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تب اس کے شوہر کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور تین بھینسیں تھیں البتہ اس کچے پکے گھر کا صحن کافی بڑا تھا جو صالحہ کے سسر نے اچھے وقتوں میں سستے داموں خرید لیا تھا، صحن کے ایک کونے کو چھوٹی سی چار دیواری

بنا کر باقی کے گھر سے الگ کر دیا گیا تھا اور وہیں پر ان
بھینسوں کو رکھا جاتا تھا' جن کا دودھ بیچنے سے اتنی
آمدنی ہو جاتی تھی کہ گھر کا خرچہ چل جاتا اور سال بھر
کی گندم زمین سے آجاتی سو زندگی پر آسائش نہ سہی مگر



مشکل بھی نہ تھی۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا دیکھتے ہی دیکھتے بھینسوں کی تعداد اتنی ہوگئی کہ ان کے لیے الگ زمین لے کر جگہ بنانا پڑی، بھینسوں کی دیکھ بھال اور دودھ دوہنے کے لیے انہی دنوں شمشیر کو ملازم رکھا گیا تھا نوعمر شمشیر اب بھرپور مرد میں ڈھل گیا تھا مگر اس گھر میں اس کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہی تھی اسی لیے اس کے آنے جانے پر کوئی پابندی بھی نہ تھی۔

گزرتے وقت نے صالحہ کو تین خوبصورت بیٹوں سے نوازا تھا اور اب وہ نہ صرف جوان تھے بلکہ شادی شدہ اور بچوں کے باپ بن گئے تھے۔

رکشے کے انتظار سے مایوس ہو کر وہ پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ پہلی گلی ہی مڑی تھی کہ سامنے سے رجو آتی دکھائی دی۔ رجو اسی محلے میں رہتی تھی جہاں پہلے کبھی صالحہ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اب وہ قدرے بہتر علاقے میں شفٹ ہو گئے تھے تو پرانے ہمسایوں سے کم کم ہی ملنا جلنا ہوا کرتا تھا۔

''ارے صالحہ کیسی ہو تم' بڑے دن سے شکل ہی نہیں دکھائی۔'' رجو ہمیشہ کی طرح اس پر نظر پڑتے ہی بولنا شروع ہوگئی تھی۔ رجو کے دو ہی شوق تھے بولنا اور بہت بولنا۔

''آنٹی لائیے یہ سامان میں اٹھا لیتا ہوں۔''

اس آواز پر صالحہ نے بولنے والے کی طرف دیکھا پینٹ شرٹ میں ملبوس پاؤں میں چمکتے بوٹ اور ہاتھ میں پکڑا بریف کیس۔ وہ کسی دفتر کا بابو دکھائی دے رہا تھا۔ صالحہ نے کچھ جھجکتے ہوئے سامان کے شاپر اس کے ہاتھ میں تھما دیے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چھجا بنا کر دھیان سے اسے دیکھتے ہوئے گویا پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ جب سے اس کے آنکھ میں سفید موتیا اترا تھا اسے لوگوں کو پہچاننے میں مشکل ہونے لگی تھی۔

''ارے کیا دیکھ رہی ہے۔ تو اسے نہیں جانتی۔ یہ امجد ہے حکومت کی طرف سے آیا ہے ہمارے جیسے لوگوں کا بھلا کرنے۔''

بھلے والی بات پر صالحہ کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

''دیکھیے بیگم صاحبہ میں آپ کو پوری بات سمجھاتا ہوں'' صالحہ کو شاید نہیں یقیناً زندگی میں پہلی بار کسی نے اتنے ادب سے بیگم صاحبہ کہہ کر پکارا تھا۔

''آپ مجھے کافی سمجھدار لگ رہی ہیں مجھے پتا ہے آپ جلدی میری بات سمجھ لیں گی۔''

نوجوان نے شہد میں ڈوبا ایک اور تیر چھوڑا جو بالکل نشانے پر لگا اور صالحہ بنا کچھ سنے ہی سب سمجھ جانے والے تاثرات چہرے پر سجائے اسے دیکھنے لگی۔

''بیگم صاحبہ اس طرح گلی میں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔''

''ہاں ہاں بالکل میرا گھر قریب ہی ہے۔ چلو گھر چل کر بات کرتے ہیں'' صالحہ نے فوراً اس اجنبی کو گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔

''جی ضرور مگر ابھی اگر ہم گھر گئے تو اتنے میں دفتر بند ہو جائے گا اور ایسے کاموں میں دیر کرنا مناسب نہیں اس لیے آپ لوگ میرے ساتھ چلیے۔ میں راستے میں آپ کو سب بتا دیتا ہوں۔ یہ رجو صاحبہ تو سب کچھ جانتی ہی ہیں۔'' نوجوان کی بات کے اختتام پر رجو نے زور و شور سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کی بات کی تصدیق کی، کچھ ہی دیر میں وہ نوجوان صالحہ کو اپنی نوکری اور آفر کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا اور مناسب رقم ملنے کے خیال سے صالحہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

☆......☆......☆

عدیلہ کمرے سے گیٹ تک کے کتنے ہی چکر لگا چکی تھی لیکن صالحہ کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ ریاض کا فون بھی بند جا رہا تھا آخری بار چکر لگانے پر اسے ساتھ والوں کا ریحان دکھائی دیا تو آواز دے ڈالی۔

''جی آنٹی کیا کہنا ہے؟'' ہاتھ میں پکڑا کرکٹ بیٹ جھلاتا وہ لاپروائی سے پوچھ رہا تھا۔

''بیٹا ذرا دوڑ کے مجھے کچھ سودا تو لا دو فٹافٹ'' عدیلہ نے شہد ٹپکاتے لہجے میں اپنی بات کہی مگر وہ بھی

اپنا نام کا ایک ہی تھا۔

''سوری آنٹی! میرا تو کرکٹ میچ شروع ہونے والا ہے۔ مجھے فوراً وہاں پہنچنا ہے اور سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' اس نے بد لحاظی سے انکار کرتے ہوئے اپنی راہ لی۔

''سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اونہہ آیا بڑا شاہد آفریدی'' عدیلہ نے اس کی نقل اتارتے ہوئے دروازہ زور سے پٹخا اور اپنے کمرے کا رخ کیا جہاں سے اس کے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

بچے کو بہلا کر آخر اس نے دال چولھے پر چڑھا دی۔

☆......☆......☆

رکشہ مختلف موڑ مڑتا تیزی سے آگے بڑھا چلا جا رہا تھا، رجو اور صالحہ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں مگن اس بات کو فراموش کر گئی تھیں کہ وہ شہر کو پیچھے چھوڑتے ویرانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کو یہ خیال آتا رکشہ ایک عمارت کے سامنے رک گیا۔

''بیگم صاحبہ آپ کے پاس کچھ کھلے پیسے ہوں گے؟'' نوجوان جس نے اپنا نام جمیل بتایا تھا صالحہ بیگم سے مخاطب تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں کتنے چاہئیں۔''

''زیادہ نہیں بس یہ رکشے کا کرایہ......''

صالحہ نے جمیل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رکشے والے سے کرایہ پوچھ کر رقم ادا کر دی رکشہ وہاں سے رخصت ہوا تو جمیل ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''اب میری بات دھیان سے سنیں۔ آپ لوگوں کو ایسا ظاہر کرنا ہے جیسے کہ آپ دونوں بہت غریب ہیں۔ ورنہ وہ آپ کو پیسے نہیں دیں گے کیونکہ حکومت نے صرف غریب لوگوں کی مدد کے لیے یہ پروگرام شروع کیا ہے۔ آپ لوگ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟؟''

''ہاں ہاں پتر ہم سب سمجھ رہے ہیں۔ تو فکر نہ کر جیسا تو کہے گا ہم ویسا ہی کریں گے۔''

صالحہ بیگم کی یقین دہانی پر جمیل مطمئن دکھائی دینے لگا۔

''اب آپ لوگوں کو اندر جانا ہے وہاں کاؤنٹر پر جو لڑکا کھڑا ہوگا اسے اپنا نام اور پتا لکھوا دینا بعد میں سب میں دیکھ لوں گا۔''

''لیکن بیٹا تم ہمارے ساتھ چلتے تو ہمیں آسانی ہو جاتی'' رجو کو سرکاری دفتر میں جانے کا سوچ کر گھبراہٹ ہونے لگی۔ جانے کیا کیا سوال جواب کریں۔''

''بات تو رجو ٹھیک کہہ رہی ہے تم ہمارے ساتھ ہی چلو'' صالحہ نے بھی رجو کی ہاں میں ہاں ملائی تو جمیل نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پایا پھر جب وہ بولا تو لہجہ بے حد اپنائیت بھرا تھا۔

''بیگم صاحبہ آپ تو سمجھدار ہیں۔ دفتر میں سو دوست سو دشمن اگر کسی نے بڑے افسر کو یہ شکایت لگا دی کہ میں نے آپ لوگوں کی سفارش کی ہے تو بس آپ لوگوں کا کام تو پھر بھول ہی جائیں۔ اس معاملے میں اصول بڑے سخت ہیں۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، چلو ہم خود ہی چلے جاتے ہیں'' صالحہ نے عمارت کی طرف قدم بڑھایا تو جمیل نے انہیں روک دیا۔

''ایک منٹ پہلے ایک کام کریں۔ اپنا یہ زیور اتار دیں، زیور دیکھ کر وہ کہہ دیں گے کہ آپ لوگ غریب نہیں اس لیے پیسے نہیں مل سکتے'' ان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں جمیل نے اپنی بات واضح کی۔

دونوں نے ایک لمحہ بھی سوچے بنا زیور اتارنے شروع کر دیے۔ رجو کے پاس تو ایک انگوٹھی اور کانوں کی بالیاں ہی تھیں لیکن صالحہ کے پاس دو انگوٹھیوں اور کانوں میں پہنے جھمکوں کے علاوہ ہاتھوں میں سونے کے بھاری کنگن بھی تھے، جو اس کے بیٹے نے اپنی شادی کے موقع پر ماں کی فرمائش پر بنوا کر دیے تھے۔

''ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا'' اندر آپ لوگوں کی تلاشی بھی لی جائے گی۔ آپ لوگوں کے پاس اگر کوئی پیسے وغیرہ ہیں تو وہ بھی زیور کے ساتھ رکھ دیں کیونکہ اگر آپ لوگوں کے پاس پیسے

نکلے تو پھر سمجھیں آپ کا کام کبھی نہیں ہونا''۔ جمیل کی بات پر رجو نے اپنا چھوٹا سا پرس زیور کے ساتھ رکھ دیا جس میں تقریباً پندرہ سو روپے تھے جو اس نے سوٹ خریدنے کے لیے رکھے ہوئے تھے البتہ صالحہ کی بات الگ تھی۔ اس کے گھر کے حالات بھی رجو سے بہت اچھے تھے۔ گھر میں پیسوں کی کمی نہ تھی اور پھر صالحہ کی گھر بھر پر حکمرانی تھی۔ گھر کے خرچ کے علاوہ بھی اس کے پاس ہمیشہ ہزاروں روپے موجود ہوا کرتے تھے جنہیں وہ اپنے لباس میں ہی رکھا کرتی تھی' شاید اس طرح وہ اپنے محرومیوں بھرے دنوں کو بھولنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جیب میں پڑے پیسے اسے احساس دلاتے رہتے کہ اب وہ اپنی خواہشات پوری کرسکتی ہے' صالحہ نے تقریباً پچیس ہزار کی رقم نکال کر جمیل کے حوالے کی تو ایک لمحے کو وہ بھی حیران رہ گیا۔ یہ رقم اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

''ٹھیک ہے آپ لوگ اندر جائیں میں یہیں کھڑا ہوکر آپ لوگوں کے آنے کا انتظار کرتا ہوا ایک طرف بنے اینٹوں کے چھوٹے سے ڈھیر پر بیٹھتے ہوئے جمیل نے انہیں سامنے بنی عمارت کے اندر جانے کو کہا۔

☆......☆......☆

''کیا کھانے میں اور کچھ نہیں ہے؟''

''ابھی تو یہی ہے شام کو اور کچھ بھی بنا لوں گی'' ریاض کے خراب موڈ کے پیش نظر عدیلہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''وہ اور کچھ اب بھی تو بن سکتا تھا کہ نہیں، تمہیں اچھی طرح خبر ہے مجھے دال کتنی ناپسند ہے۔ اٹھا لو کھانا میرے سامنے سے''۔

''وہ اماں گئی تھیں سامان لینے مگر اتنی دیر ہوگئی لوٹی ہی نہیں تو مجبوراً میں نے دال بنالی۔ گھر میں یہی پڑی تھی'' عدیلہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

''اماں کا کیا ہے مل گئی ہوں گی سہیلیاں راستے میں' محلے بھر کی خبروں کا تبادلہ کرنے میں اور کسی بات کا خیال ہی کہاں رہا ہوگا انہیں'' ریاض اپنی اماں کی عادت سے بخوبی واقف تھا۔

''اچھا دودھ ہی پیتے جائیں'' شوہر کو بھوکے پیٹ جاتے دیکھ کر عدیلہ خوامخواہ احساسِ جرم میں مبتلا ہونے لگی۔ ریاض اس کی بات کا جواب دیے بنا گھر سے جاچکا تھا۔

''یہ اماں بھی نا...... جانے کہاں رہ گئیں' کہا بھی تھا ٹائم تھوڑا ہے'' وہ بڑبڑاتے ہوئے ساس پر غصہ نکالنے لگی۔

☆......☆......☆

جمیل کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر وہ دونوں سامنے بنی عمارت کی طرف چل دیں، کسی قدر جھجک کے ساتھ وہ اندر داخل ہوگئیں۔ کاؤنٹر پر ایک تیس پینتیس سال کی خاتون فون پر بات کرنے میں مصروف تھی۔ وہ دونوں اس کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئیں۔

''جی کیا کام ہے آپ کو؟'' فون سے فارغ ہوکر وہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر صالحہ نے بولنے کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''ہم بہت غریب لوگ ہیں جی۔ حکومت نے جو غریبوں کی مدد کا کام شروع کیا ہے ہم اسی کے لیے آئے ہیں کہ ہمارا بھی کارڈ بنا دیں تاکہ ہمیں بھی ہر مہینے پیسے مل سکیں'' صالحہ نے ایک ہی سانس میں جمیل کا یاد کرایا سبق فرفر دہرادیا۔

''بی بی تمہیں کسی نے غلط پتا بتا دیا ہے۔ یہاں یہ کام نہیں ہوتا'' خاتون ان کے سر پر بم پھوڑ کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''ہمیں جمیل صاحب نے بھیجا ہے انہوں نے کہا تھا ہمارا کام ہوجائے گا۔''

''کون جمیل؟؟؟ یہاں کوئی جمیل کام نہیں کرتا اور نہ ہی یہاں لوگوں کی مدد وغیرہ کا کوئی کام ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا کالج ہے۔ یہاں سے داخلے بھی بھیجے جاتے ہیں آئی سمجھ؟'' خاتون نے آسان الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل وہ دفتر ایک تعلیمی ادارے کا تھا جو دور دراز کے علاقوں کے لوگوں کو فاصلاتی تعلیم کے ذریعے پڑھائی کی سہولت فراہم کرتا تھا۔

وہ دونوں الٹے قدموں باہر کی طرف پلٹیں۔ باہر آکر چاروں طرف دیکھا مگر جمیل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ دونوں چکرا کر رہ گئیں ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ رکشہ لے کر گھر پہنچ سکتیں۔ جیسے تیسے روتے دھوتے گھر پہنچیں مگر صدمے سے برا حال تھا۔ صالحہ تو کئی بار بے ہوش بھی ہو چکی تھی، جمیل کی تلاش میں کئی لوگ نکلے مگر اب یہ تلاش لا حاصل تھی، جمیل ان کی پہنچ سے بہت دور نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

آئینے کی سامنے کھڑا بال سنوارتے ہوئے وہ اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ نئی پینٹ شرٹ جو کہ اس نے کل ہی خریدی تھی اس پر خوب جچ رہی تھی

''کہاں کی تیاری ہے شہزاد ے؟'' اس کے روم میٹ عرفان نے اس کی تیاری پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کہاں جانا ہے یار بس وہی سماج سیوا'' خوب سارا پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے جمیل جس کا اصل نام شہزاد ڈھاڈھنائی سے ہنستے ہوئے بولا۔

''ویسے تجھے یہ آئیڈیا آیا کیسے؟''

''میرے پاس بھی ایسا ہی ایک میسج آیا جیسا کہ آج کل اکثر لوگوں کے پاس آرہا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ انکم سپورٹ پروگرام میں آپ کا نام نکلا ہے اس نمبر پر رابطہ کریں۔'' ''اور تجھے تو پتا ہی ہے کہ اس نمبر پر رابطہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟'' شہزاد نے آئینے سے نظر ہٹا کر عرفان کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

''ہاں جانتا ہوں ان نمبرز پر کال کرتے ہی کال کرنے والے کا سارا بیلنس اس نمبر پر ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔''

''بالکل صحیح، بس اسی میسج سے مجھے آئیڈیا آیا کہ لالچی قسم کے بے وقوف لوگوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہیں، جو دوسروں کا حق کھانے کے چکر میں اپنا بھی سب کچھ گنوانے کو تیار ہو جاتے ہیں'' شہزاد کی بات پوری ہوتے ہی دونوں ہنسنے لگے۔

''او کے یار میں تو چلا'' شہزاد سیٹی بجاتا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ آج اس کا رخ کل والے علاقے کی بالکل مخالف سمت میں تھا' کیونکہ وہ اتنا بے وقوف تو ہرگز نہیں تھا کہ ایک ہی جگہ پر دوسری بار جاتا۔

پیدل چلتے ہوئے اس کی نظریں آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو کھوج رہی تھیں آخر اسے کچھ اور لوگوں کی مدد بھی تو کرنا تھی۔

☆☆......☆☆

موسمی پرندے

ریحانہ تنویر

اُن مردوں کی کہانی جو پَر ملتے ہی ہر رشتہ چھوڑ کر اُڑ گئے

ماموں وقار امی سے دو سال چھوٹے تھے۔ دونوں بہن بھائی میں بہت پیار تھا۔ امی نے بڑے ارمانوں سے ماموں کی شادی کی تھی۔ میری ممانی ہماری برادری کی تھیں۔ اُن کی جوڑی لاکھوں میں ایک تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ایک دوسرے کی ضروریات کا بے حد خیال بھی رکھتے تھے۔ اُن کی شادی ہوئے ابھی چار سال ہی گزرے تھے کہ ان کو بے اولادی کے طعنے ملنے لگے۔ جو تیر بن کر ان کے سینوں میں پیوست ہو جاتے۔ بدقسمتی سے ان طعنوں کی ابتدا ان کے اپنوں سے ہی ہوئی۔ یوں دونوں میاں بیوی ڈاکٹروں کے کلینک کے چکر لگانے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے مختلف ٹیسٹ ہوئے تو ڈاکٹروں نے ان دونوں کو صحت مند قرار دے دیا اور کہا کہ آپ دونوں میں اولاد پیدا کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ بس اللہ سے دعا کرتے رہا کریں۔''

مزید دو برس بیت گئے مگر ان کا دامنِ مراد نہ بھرا تو حساس ممانی نے تعویذ گنڈوں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بات ماموں کے علم میں آئی تو انہوں نے ممانی کو سمجھایا کہ جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو۔'' ممانی کو جلد ہی یہ بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے نماز پڑھ کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ بے اولادی کے طعنوں سے بچنے کے لیے انہوں نے خاندان میں ہونے والی تقریبات میں جانا چھوڑ دیا۔ ماموں پر دوسری شادی کرنے کا دباؤ بھی ڈالا گیا۔ مگر انہوں نے ایسا ظلم ڈھانے سے انکار کر دیا کیونکہ ممانی میں کوئی کمی نہ تھی۔ ماموں بھی اس کمی کو ایک آزمائش سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے رہتے۔ ممانی بھی نماز کے بعد دیر تک سجدے میں رو رو کر اولاد کے لیے دعا مانگتی تھیں۔

بالآخر شادی کے دس سال بعد اُن کی دعائیں قبول ہو گئیں۔ ممانی نے جب ماموں کو اُمید سے ہونے کی خوشخبری دی تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب تو ان کو ہر دن عید اور ہر رات شب برأت لگنے لگی۔

دس سال بعد وہ ایک بیٹے کے والدین بن گئے۔ دو سال مزید گزرے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹا عطا فرما دیا۔ ان کے دونوں بیٹے بہت ہی صحت مند اور خوبصورت تھے۔

ان دنوں میری عمر تین سال تھی۔ دو بیٹوں کا

باپ بن کر ماموں کا سینہ فخر و انبساط سے چوڑا ہوگیا۔ کہ اب کوئی انہیں بے اولادی کے طعنے نہیں دے گا۔ اب ان کے سُونے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں گونجنے لگی تھیں۔ اب ان کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوگئی تھی۔

دو بیٹوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور انہیں معاشرے میں اونچا مقام دلوانا ان کی زندگی کا واحد نصب العین بن گیا۔ دونوں بیٹوں کی شکلیں اور حرکات و سکنات ملتی جلتی تھیں۔ جو چیز ایک کو پسند ہوتی۔ دوسرا بھی اسی کو اٹھالیتا۔ ماموں جان ان کی ہر خواہش پوری کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی پیدائش پر انہوں نے ایسا جشن منایا کہ خاندان والے دنگ رہ گئے۔ انہوں نے تفریحی محفل کے ساتھ ساتھ غریبوں میں کھانا اور دیگر اشیاء تقسیم کرائیں۔ تمام برادری کی شاندار دعوت کی کہ لوگ عرصہ تک اس دعوت کو یاد کرتے رہے۔

☆......☆......☆

پھر ان کی سال گرہ اور اسکول جانے کے سلسلے شروع ہوئے تو ماموں نے اپنے وسائل سے بڑھ کر اُن کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے انہوں نے دن رات ایک کر دیا۔ ان کے بعد ان کی مزید اولاد نہ ہوئی۔ مگر وہ خوش تھے کہ بیٹے باپ کا بازو ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بازو دے دیے تھے۔ جن پر ان کو بہت ہی ناز تھا۔ وہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے۔ ماموں کہا کرتے تھے۔

''میں ان کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر ان کی شادیاں بھی دھوم دھام سے کروں گا۔ پھر ہماری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔''

ان کی اولاد سے اتنی محبت اور دیوانگی دیکھ کر لوگ کہتے کہ ایسا لگتا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کا پیار تمہارے اندر بھرا ہوا ہے۔'' اور یہ حقیقت تھی کہ



انہوں نے ماں بن کر بچوں کے احساسات کا خیال رکھا اور باپ بن کر ان کے مستقبل کو شاندار بنایا۔ وہ دونوں بھی ممانی سے زیادہ ان کو چاہتے تھے اور ان کے آگے پیچھے گھومتے تھے۔ وہ ان کی گھر واپسی کے منتظر رہتے اور ان کا ہر حکم مانتے تھے۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ایک جیسی عادت اور فطرت رکھتے تھے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ غرض یہ کہ وہ ایک جان دو قالب تھے۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو ان کی جان پڑ بن جاتی۔ اُن کا کام پر جانے کو جی نہ چاہتا۔ ماں سے زیادہ اُن کو فکر رہتی۔ وہ ہر وقت اس کے بیڈ سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ اور ان کو کوئی اور چیز اچھی نہ لگتی۔ وہ اسے کبھی ایک ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے اور کبھی دوسرے کے پاس۔ دفتر جاتے تو کام کرنے کو جی نہ چاہتا۔ گھر تین چار دفعہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتے۔ وہ علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہاتے۔ دونوں ہی بے حد لاڈلے اور پیارے تھے۔ ان کو ذرا سی بھی چوٹ لگ جاتی تو وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھالیا کرتے اور ماموں ان کے اس طرح رونے سے بہت ہی لطف اندوز ہوتے اور پھر ان کو سینے سے لگا لیتے۔

☆......☆......☆

جمیل بڑا تھا اور عدیل چھوٹا۔'' مگر ان دونوں کی شکل وصورت اور قد کاٹھ ایک جیسا تھا۔ ان کی جوڑی لاکھوں میں ایک تھی۔ ماموں جان نے جمیل کا اور میرا رشتہ بچپن میں ہی طے کر دیا تھا۔ ماموں مجھ سے بھی بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے بہو بنانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس فیصلہ کا علم بڑوں کو ہی تھا۔ ہم بچوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب جب بچے بڑے ہونے لگے تو ان کی ضروریات بڑھ گئیں۔ ان کے تعلیمی اخراجات بھی بڑھنے لگے۔ اب تو وہ ماموں کے کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ ماموں نے اپنی بساط سے بڑھ کر ان کے تمام اخراجات برداشت کیے۔

وہ دونوں بے حد ذہین تھے اور ان میں فرمانبرداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان دونوں کا نتیجہ بھی بہترین ہوتا اور وہ کلاس میں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتے۔

ایف ایس سی میں دونوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان دونوں کی خواہش ڈاکٹر بننا تھی۔ اچھے نمبروں کی وجہ سے ان کا میڈیکل کالج میں داخلہ آسان تھا۔ چونکہ ان دونوں نے اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لیے ان کی دوستی بھی ایسے لڑکوں کے ساتھ تھی۔ جو پوش علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

انہوں نے ان دونوں کو پٹی پڑھائی کہ پاکستان کے میڈیکل کالجز کی ڈگری باہر کے ممالک میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر بیرون ملک سے ڈاکٹری کی ڈگری لوگے تو ہر جگہ سے نوکری کی پیشکش ہوگی۔ اور تنخواہ بھی کئی گنا زیادہ ملے گی۔''

یہ بات ان کے ذہن میں ایسی بس گئی کہ جب تک ماموں جان نے ان کو باہر بھیجنے کا وعدہ نہ کر لیا۔ انہوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ماموں جان نے کوشش کی جمیل باہر جا کر پڑھے اور عدیل یہاں ہی۔ مگر وہ نہ مانے کیونکہ دونوں کی سوچ ایک تھی۔ پسند ناپسند بھی ایک تھی۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ ماموں کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ ان دونوں کو بیرون ملک پڑھائی کے لیے بھیج سکیں۔ مگر ان دونوں کو اس بات کی پروا نہ تھی۔ ماموں اور ممانی نے ان کو اتنا لاڈ اور پیار دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے تھے۔ ماموں کو احساس تھا کہ قابل اولاد ماں باپ کے لیے فخر اور سرمایہ ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ان کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔

☆......☆......☆

بالآخر ماموں جان نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں باہر بھیجنے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے انہوں نے جمیل کو بھیجا اور پھر ایک سال بعد عدیل بھی چلا گیا۔

ماموں جان نے یہ تمام اخراجات ممانی کے

زیورات بیچ کر اور باقی دوستوں سے قرض لے کر پورے کیے۔ اب ماموں اور ممانی گھر میں اکیلے رہ گئے۔ اور اب ایک بار پھر سے اولاد کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے کا دور شروع ہو گیا۔ مگر اس بار دعاؤں میں ان کی صحت و سلامتی کے ساتھ، ان کو کامیابیوں اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے وسائل پیدا کرنے کی دعائیں بھی شامل تھیں۔ جن میں سے دو تو پوری ہو گئیں یعنی ان کی صحت اور سلامتی کی مگر وسائل کا حصول ان کے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ انہوں نے دونوں کو شہزادوں کی طرح پالا تھا۔ اس لیے ان کا معیارِ زندگی بھی اعلیٰ تھا۔

پانچ سال تک انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اُن کے اخراجات اٹھائے اور انہوں نے بھی کبھی ماموں کو مایوس نہ کیا۔ وہ شاندار انداز میں امتحان پاس کرتے رہے اور ان کو دن میں تین تین بار فون کر کے ان کی تنہائی کا درد دور کرتے رہے۔

ماموں جان قرضوں پر قرض لیتے رہے۔ جمیل اور عدیل کو معلوم تھا کہ ان کی پڑھائی قرض کی رقم سے ہو رہی ہے۔ وہ کہتے تھے۔

''ابو! ہم پاکستان آ کر سارا قرض اتار دیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔ ہم پائی پائی منافع کے ساتھ ادا کریں گے۔''

ماموں جان ان کے یہ الفاظ سُن کر خوشی سے نہال ہو جاتے۔ یوں ہی پانچ سال بیت گئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر تو بن گئے ہیں۔ مگر اب وہ اسپیشلائزیشن کریں گے۔ اس لیے ابھی وہ دو سال وہاں ہی گزاریں گے۔''

☆......☆......☆

وہ دو سال کیسے گزرے۔ وہ ہم ہی جانتے ہیں ممانی جان تو ان کی کامیابی کی دعائیں ہی مانگ سکتی تھیں۔ جبکہ ماموں جان کو ان کی کامیابی کے لیے رقم کا بندوبست کرنا تھا۔ وہ قرضوں کے بوجھ تلے مزید دبتے گئے۔ مگر ان کا دل مطمئن تھا کہ منزل قریب آ رہی ہے۔ ان کی مرادیں پوری ہونے والی ہیں۔

زبان کی اہمیت

ایک مرتبہ قیس بن ساعدہ اور اکثم بن صفی کی ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

''آپ نے آدمی میں کتنے عیب دیکھے؟''

جواب ملا۔ ''اتنے جن کی گنتی نہیں ہو سکتی لیکن میں ایک ایسی خصلت بھی جانتا ہوں جو اگر آدمی میں ہو تو اس کے سارے عیب ڈھکے رہیں۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

جواب ملا۔ ''زبان کی حفاظت۔''

جعفر برمکی بھی عموماً کہا کرتے تھے۔ ''آدمی میں چاہے جتنے عیب ہوں اگر اس میں صرف ایک خوبی ہو تو تمام عیب چھپ جاتے ہیں۔ وہ ہے زبان پر قابو۔''

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان، فیصل آباد

ان کی محنت کا پھل ان کو جلد ملنے والا ہے...... ان کی تمنائیں پوری ہونے والی ہیں۔ ان کے خوابوں کو تعبیر ملنے والی ہے۔

آٹھ سال بعد دونوں بھائی 'ہارٹ اسپیشلسٹ' کی ڈگریاں لیے وطن پہنچے تو ماموں جان کے گھر میں بہاریں اُتر آئیں۔ اس روز بھی وہ اتنے ہی خوش تھے۔ جتنے وہ ان کی پیدائش کے روز ہوئے تھے۔

میں بھی تو خوش تھی کہ میرا ہونے والا شوہر ایک قابل ڈاکٹر بن گیا ہے۔ ہمارے گھر والے بھی ماموں جان کی اس خوشی میں برابر کے شریک تھے۔

ماموں جان نے اس موقع پر بھی ویسا ہی جشن اور خوشی منائی۔ جیسی کہ ان کی پیدائش پر منائی تھی۔ کیونکہ ان کی واپسی ان کا دوسرا جنم بن گئی تھی۔ کیونکہ لوگوں نے ماموں کو ڈرا دیا تھا کہ اب تمہارے بیٹے لوٹ کر پاکستان نہیں آئیں گے۔ لیکن ماموں جان کو یقین تھا کہ وہ ان کو قرضوں کی دلدل سے ضرور نکالیں گے۔ اب وہ واپس آئے تو سارے خدشات دم توڑ گئے تھے۔

☆......☆......☆

چند ماہ خوشیوں کا جھولا جھولتے گزر گئے۔ اس دوران ان کا رابطہ انگلینڈ میں اپنے دوستوں سے فون پر رہتا تھا۔ مگر وہ انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ جو ماموں اور ممانی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ماموں جان اب ان کو سرکاری اسپتال میں ملازمت کرنے کا کہتے۔ تاکہ قرض کا بوجھ اترنا شروع ہوجائے۔ وہ ان کو تسلی دیتے کہ انہوں نے درخواستیں دے رکھی ہیں۔ آج کل میں انٹرویو کی کال آئے گی۔ تو ان کی ملازمت شروع ہوجائے گی۔ جہاں ان کی تنخواہ بھی زیادہ ہوگی۔ لہٰذا چند ماہ میں ہی وہ سارا قرض چکا دیں گے۔'' ایک روز انہوں نے بتایا کہ انہیں ماہرین قلب کی انٹرنیشنل کانفرنس میں مدعو کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کو دو ہفتوں کے لیے لندن جانا ہے۔''

ماموں جان نے ان کو اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ کانفرنس ختم ہونے کے بعد وہ ایک دن بھی مزید وہاں نہیں ٹھہریں گے اور فوراً واپس آجائیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا اور روانہ ہوگئے۔ وہ باقاعدگی سے پندرہ دن روزانہ ہی فون پر ماموں اور ممانی سے بات کرتے رہے۔ ماموں اور ممانی جب بھی ان سے واپس آنے کے بارے میں بات کرتے تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتے۔ اور اس بات کا صحیح جواب نہ دیتے۔ حقیقت یہ تھی کہ جمیل اور عدیل دونوں نے ایکا کیا ہوا تھا۔ وہ نت نئے بہانوں سے ماموں جان کو بہلانے لگے۔

پندرہ روز...... ڈیڑھ سال پر محیط ہوگئے۔ وہ دونوں واپس نہ لوٹے۔ وہ مزید کورسز کرنے کے بہانے بناتے اور کبھی آٹھ لاکھ تنخواہ ملنے کی خبر سناتے۔ اِدھر قرض خواہوں کے تقاضے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ کیونکہ لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ دونوں ڈاکٹر بن کر پاکستان آگئے ہیں۔ ماموں جان منت سماجت کرکے اور مختلف حیلوں بہانوں سے قرض خواہوں کو ٹالتے رہے۔ انہوں نے ان کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتا کر واپس آنے کی درخواست کی۔ تو اس کے بعد وہ ماموں کا فون سننے ہی سے کترانے لگے۔ ماموں کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دونوں وہاں ملازمت کرنے لگے ہیں۔ اور ان سے جھوٹ بول کر واپس آنے کے وعدے کررہے ہیں۔ ماموں جان اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ وہ وہاں ملازمت کرکے شاید قرض اُتارنے کے لیے رقم جمع کررہے ہیں۔ لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہی رہی۔

پھر ایک دن جمیل کا فون آیا۔ اس نے پہلے تو ماموں جان سے ان کی اور اپنی ماں کی خیریت پوچھی۔ اور پھر کہنے لگا۔

''ابو! پلیز ہمیں زیادہ فون نہ کیا کریں، ہم ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ ہم خود ہی مناسب وقت پر آپ کو فون کرلیا کریں گے۔''

ماموں جان کو جمیل کا لہجہ اور لفظ دونوں ہی اجنبی اجنبی سے لگے۔ پھر بھی انہوں نے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا جمیل! تم کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے۔'' تو جمیل بولا کہنے لگا۔

''ابا جان! آج میں آپ کو سچائی بتانے جارہا ہوں۔ جس کو تسلیم کرنا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ دراصل ہم دونوں نے تعلیم کے دوران ہی یہاں کی گوریوں سے شادیاں کرلی تھیں اور جب ہم پاکستان آئے تھے تو ہمارے دو دو بچے ہوچکے تھے۔ ہم اپنی اپنی فیملی یہاں ہی چھوڑ گئے تھے۔ اپنی بیویوں کی وجہ سے ہمیں یہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ پاکستان آنے کے بعد ہم آپ کو یہ بات بتانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی ہمت نہ ہورہی تھی۔ ہم جلد ہی آپ کو پیسے بھجوانا شروع کردیں گے۔ فون کرتے رہیں گے مگر اب واپسی ممکن نہیں رہی۔ آپ اور امی ہمارا انتظار مت کرنا۔''

جمیل کے الفاظ ماموں جان پر بم بن کر گرے تھے۔ یوں لگا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو...... کہ کیا جمیل اور عدیل مجھ جیسے جاں نثار اور محبت کرنے والے باپ کے ساتھ بہیمانہ سلوک بھی کرسکتے ہیں۔

"نہیں......نہیں" جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

"کیا کہہ رہے ہو جمیل بیٹا!" ماموں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اب جمیل کی بجائے عدیل بولا۔ اور معافی مانگتے ہوئے اور اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بولا۔

"ابو! دراصل جمیل شادی کر رہا تھا تو میں بھی نہ رہ سکا۔ تو میں نے بھی شادی کر لی۔ ابو ہم کوشش کریں گے کہ کچھ عرصہ بعد آپ دونوں کو بھی یہاں بلالیں۔" ماموں جانے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹا! میں تو قرضوں کے بوجھ تلے دب چکا ہوں۔ میں بھلا کیسے آسکوں گا۔"

"ابو آپ قرضے کی فکر مت کریں۔ ہم آپ کو رقم بھجواتے رہیں گے۔ اور جب قرض اتر جائے گا تو آپ کو بلوالیں گے تاکہ آپ اپنی بہوؤں اور پوتے پوتیوں کو بھی دیکھ سکیں۔"

☆......☆......☆

مگر جمیل اور عدیل کی ساری تسلیاں اور دلاسے جھوٹے ثابت ہوئے۔ وہ نہ ہی خود آئے اور نہ ہی رقم بھیجی کہ ماموں اپنا لیا ہوا قرض ادا کر سکیں۔ ہفتوں میں ہونے والی ٹیلی فون کا سفر مہینوں میں تبدیل ہوگئیں اور پھر...... ٹیلی فون آنا بھی بند ہوگئے۔ ماموں جان فون کرتے تو رانگ نمبر ملتا۔ انہوں نے اپنے نمبرز ہی بدل لیے تھے۔ ماموں اور ممانی کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

جب قرض خواہ دروازے کھٹکھٹانے لگے اور بینکوں کی طرف سے قرض کی ادائیگی کے نوٹس مع سود کے آنے لگے تو ماموں جان نے بادل نخواستہ اپنی آخری پونجی......یعنی اپنا قیمتی مکان کم قیمت پر فروخت کر ڈالا۔ یوں قرض کا بوجھ اُتر گیا۔ ممانی جان نے خاموش وفاداری دکھائی وہ بیٹوں کی جدائی اور بے وفائی کا دکھ چپ چاپ سہتی رہیں اور ایک صبح خاموشی سے دنیا چھوڑ گئیں۔ انہوں نے ماموں جان پر بیماری اور تیمارداری کا بوجھ بھی نہ ڈالا۔

ممانی کی موت پر ماموں جان ٹوٹ کر رہ گئے۔ اب ان کا کوئی بھی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ ان کی حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی پرندے کے دونوں بازو کاٹ کر اسے جینے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ امی جان بھائی کا دکھ نہ دیکھ سکیں اور ان کو اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔

ماموں جان جب ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھا تو مجھے سینے سے لگا کر دیر تک روتے رہے اور یہی کہتے رہے۔

"نادیہ بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنا عہد نہیں نبھا سکا۔" ان کو روتا دیکھ کر میں بھی رو پڑی تھی۔ وہ ہمارے گھر میں چند ہی دن مہمان بن کر رہے۔ اب وہ بالکل خاموش ہوگئے۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتے اور خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ پھر ایک دن وہ بھی دنیا چھوڑ گئے۔ مرتے وقت ان کے لبوں پر 'جمیل اور عدیل' کے نام تھے۔

☆......☆......☆

ماموں جان کو اس دنیا سے گئے ایک سال بیت گیا ہے۔ اُن کی برسی قریب آرہی ہے۔ اس موقع پر میں جمیل اور عدیل سے مخاطب ہوں۔

"تم دونوں ہی موسمی پرندے ہو۔ تم نے ایک ساتھ پرواز کی اور اُڑ گئے۔ تم نے ماں باپ کی قدر نہ کی، ان کو بے بال و پر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تم کیا جانو ماں اور باپ کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ جب اولاد ماں کو ناراض کرتی، اسے دکھ دیتی ہے تو عرش کانپ اٹھتا ہے۔ باپ کو ناراض کرتی اور اسے دکھ دیتی ہے تو پہاڑ کانپ اٹھتے ہیں۔ ماں کو ناراض کرنے والوں کو کلمہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ نہ جانے آخری وقت تمہارا کیا بنے گا۔ تمہاری جان کیسے نکلے گی۔ تم نے تو معافی تلافی کا وقت اور موقع بھی گنوا دیا تھا۔ کاش......کاش تم ماں باپ کی قدر کرتے اور دولت کے پیچھے نہ بھاگتے۔ تم بدبخت ہو۔ بدنصیب ہو، کہ اپنی جنت جیتے جی گنوا بیٹھے ہو، الوداع موسمی پرندوں......الوداع۔

☆☆......☆☆

تیسری مرد کہانی

ڈھونڈو گے ہمیں...

نصرت سرفراز

اللہ والے ہاتھ کہاں آتے ہیں، وہ بھی ایک ایسی ہی روحانی شخصیت تھے جو......

یہ سچی داستان میری امی کے نانا سے متعلق ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل یو پی پرتاب گڑھ سے تعلق رکھنے والے ہمارے پرنانا کا خاندان بڑے امراء و زمینداروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ ہزاروں مربع زمینوں کے مالک تھے۔ اناج کا شمار نہیں تھا۔ پھلوں کے وسیع باغات ایسی فراوانی اور افراطِ زر میں تو لوگ رعونت اور جاہ و جلال کے شیدائی ہوجاتے ہیں کہ تاتاری بھی اُن کو دیکھ کر شرمندہ ہوجائیں۔ گردن اس طرح اکڑ جاتی ہے کہ اپنے سامنے بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا سر جھکا کر نیچے کسی کو دیکھنا تو در کنار ہی ہوتا تھا لیکن ایسے ہی پیسوں کی ریل پیل میں پل کر جوان ہوئے میر عبدالرحمٰن اس قدر منکسر المزاج، غریبوں کے ہمدرد، اللہ والے پنج وقتہ نمازی تہجد گزار ہر سال کا اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کے اس قدر پابند تھے کہ اللہ کا بندہ ہونے کا پورا حق ادا کردیتے تھے۔

جب میری پرنانی کی اُن سے شادی ہوئی تو اُن کی عمر محض چوبیس سال تھی اور ان کی نصف بہتر صرف 15 سال کی، جیسا کہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ شادی انتہائی کم عمری میں ہی کردی جاتی تھی اور پھر اولاد کا سلسلہ......اس جوڑے کو بھی اللہ تعالیٰ نے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ انسان کو دو طرح سے آزماتا ہے، مال دے کر آزمائش میں ڈالتا ہے اور اولاد کی نعمت عطا کر کے آزمائش سے گزارتا ہے۔

میر عبدالرحمٰن مال کی آزمائش سے تو گزر گئے کہ پورا سال ہی ان کے در سے حاجت مند اپنی حاجتیں پوری کرتے اور اپنی مرادیں سمیٹتے دعائیں دیتے نہ تھکتے لیکن اولاد نے انہیں آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

میر عبدالرحمٰن کا معمول تھا کہ ہر مہینے کچھ دن کے لیے عبادت کے لیے وقف تھے۔ اس دوران وہ اپنے عبادت کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں چلے جاتے اور کسی کو ایسی دوران اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ تقریباً 2 سے 3 دن بعد وہ خود ہی کمرے سے باہر آجاتے اور دیگر امورِ زندگی نمٹاتے۔

ہر بار اس عمل سے گزرنے کے بعد جب وہ باہر آتے تو چہرہ معمول سے زیادہ پُرنور اور روحانیت سے معمور نظر آتا۔

گھر والوں میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ ہوتی کہ یا حضرت آپ نے یہ تین دن بغیر کھائے پیے کس طرح کمرے میں بسر کیے۔

جیسے جیسے میر عبدالرحمٰن کی عمر بڑھتی جارہی تھی ان کے تخلیوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پرنانی جان ویسے تو شروع ہی سے نماز روزے اور صدقہ خیرات کی عادی تھیں مگر مجازی خدا کے مزاج سے واقفیت کے بعد اس زہد و تقویٰ میں گزرتے وقت کے ساتھ مزید اضافہ ہوگیا

تھا۔ ہماری بڑی نانی بتاتی تھیں ویسے تو نانا جان اپنے تمام ہی بچوں کے ساتھ بہت شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آتے اور تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی نہ آنے دیتے مگر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے زین العابدین کے لیے ان کی چاہت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ لاڈلا ہونے کا ثبوت دیتے اور اُن سے کچھ ایسی باتیں منوا لیتے جو ان کے دیگر بہن بھائی ہرگز نہ منوا سکتے۔ ایسی ہی ایک باتوں میں اُن کا اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا مطالبہ بھی تھا (یاد رہے کہ یہ داستان قیام پاکستان سے قبل کی ہے) اور مسلمان اعلیٰ تعلیم لکھنؤ دہلی اور امرتسر کی یونیورسٹیوں سے حاصل کرتے تھے۔

کافی عرصہ ٹال مٹول سے کام لینے کے بعد بالآخر وہ اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے اور ان کو تعلیم کے حصول کی خاطر لکھنؤ بھیجنے پر رضامند ہو گئے لیکن ان کو باور کرا دیا گیا کہ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے ان پر کس قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔ گھر کے ایک نمک خوار ملازم دینو بابا کو بھی ان کے ہمراہ بھیجا گیا کہ وہاں یہ ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں۔

اسی دوران میر عبدالرحمٰن مزید گوشہ نشین ہو گئے۔ ایک بار جب کہ وہ اپنے مخصوص عبادت والے کمرے میں مقید تھے کہ نانی محترمہ کو کسی ضروری چیز کے لیے اُس کمرے میں جانا پڑا تو جو منظر اُنہوں نے وہاں پر دیکھا وہ منظر بتاتے ہوئے بھی اُن کے رگ و پے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ انہوں نے دیکھا نانا جان چت لیٹے قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے (وہ



حافظِ قرآن بھی تھے) اور ان کے سینے کے اندر دھڑکتا دل ایسے نظر آرہا تھا جیسے شفاف شیشے کے پار کوئی چیز نظر آتی ہے یعنی اُن کا سینہ شفاف شیشے کی مانند تھا اور تلاوت کی ہر اللہ اللہ ہر دل دھڑک دھڑک کر اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ نانی محترمہ ڈر کر بنا وہ چیز لیے ہی باہر آگئیں اور دروازہ برابر کر دیا اپنے محرم زاد کے اس راز سے وہ کب واقف تھیں اور نانا جان کی زندگی تک انہوں نے یہ راز اپنے سینے میں ہی مدفون رکھا۔ بعد میں کئی بار نانا جان دو دو تین ہفتوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتے یعنی کہیں چلے جاتے اور پھر خود ہی واپس آجاتے۔ اِسی دوران کئی ایسے واقعات ہوئے جو ناقابلِ یقین تھے اور اُن کے روحانیت کے اعلیٰ عہدے پر قائم ہونے کی دلیل تھے۔

ایک مرتبہ اُن کے منجھلے بیٹے کی شادی تھی اور اُن کا بلاوا آگیا۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے ایک پُرانے وفادار ملازم بوڑھے دینو بابا کو بلایا اور کہا کہ میرے بیٹے کی شادی جو اگلے ہفتے ہے وہ لڑکی اس کی قسمت میں نہیں لکھی۔ تم یہ خط اپنے پاس رکھ لو جب رخصتی ملتوی ہو جائے تو تم یہ خط بی بی جی کو دے دینا۔'' پھر وہ گھر سے چلے گئے یہ کہہ کر کہ یہ بات کسی اور کو نہیں بتانا۔ دینو بابا حیران پریشان ہکا بکا رہ گیا پورا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور میر عبدالرحمٰن کہہ رہے تھے کہ یہ لڑکی میرے بیٹے کی قسمت میں نہیں لکھی۔

بہرحال ہوا کچھ یوں کہ اُن کا کہا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوگیا۔ بارات اپنی پوری شان و شوکت اور سج دھج کے ساتھ تیار ہوئی۔ دلہن کا گھر کئی میل کے فاصلے پر ایک دوسرے گاؤں میں تھا جہاں بارات لے کر جانا تھی۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں وہ پُرانا دور تھا۔ سیل فون اور وائبر وغیرہ تو دور کی بات لینڈ لائن بھی کوسوں دور کہیں کہیں پائی جاتی تھی ملاقات کا واحد ذریعہ طویل سفر کے بعد ہی میسر ہوتا تھا۔

بہرحال سجی دھجی بارات کافی طویل سفر کر کے جب دلہن کے گاؤں پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہاں تو ماتم برپا ہے۔ گزری رات دلہن کے والد کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ صبح ہونے تک دم توڑ گیا تھا۔

لڑکی والوں نے جہالت، توہم پرستی اور ضعیف العقیدگی کی انتہا کرتے ہوئے دلہا کو منحوس اور اپنے گھرانے کے لیے بدقسمت اور بدشگن قرار دیتے ہوئے اس شادی سے انکار کر دیا۔ دلہے کی والدہ نے خود جا کر دلہن کی ماں سے تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اُن کے غم میں برابر کی شریک ہیں اور اس شادی کو ابھی ملتوی کر دیتے ہیں۔ جب آپ کہیں دوبارہ تاریخ دے دیں مگر انہوں نے نہ ماننا تھا نہ مانیں کہ دلہا بدشگن نہیں اس کام کے لیے قدرت نے یہی وقت مقرر کر رکھا ہے اور یہی مشیت ایزدی تھی۔

دلہا کی ماں ابھی بیٹے کے پاس آکر بیٹھی تھیں کہ دینو بابا اُن کے پاس آئے اور کہا کہ میر صاحب نے آپ کے لیے یہ خط دیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا عارفین (دلہے کا نام) کی شادی پر میں موجود نہیں ہوں گا مگر مجھے معلوم ہے یہ لڑکی میرے گھر نہیں آئے گی مجھے معلوم ہے یہ لڑکی میرے بیٹے کے ہاتھوں پر نہیں لکھی لہٰذا جب یہ شادی کینسل ہو جائے تو تم یہ خط بی بی جی کو دے دینا۔

وہ اپنے مجازی خدا کے مزاج اور روحانیت کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہونے کی چشم دید گواہ بھی تھیں مگر اس بار وہ حیران رہ گئیں کہ یہ شادی جس میں دونوں گھروں کی رضا مندی شامل تھی اور بارات دھوم دھام سے آئی تھی لیکن ایک ضعیف العقیدگی کی نظر ہوگئی تھی اور اب انہوں نے بارات کی واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا تو ان کے مجازی خدا کا یہ خط اور انکشاف کہ ان کو معلوم تھا یہ شادی نہ ہو پائے گی اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسی گاؤں کے ایک غریب اور مفلس خاندان کی بیٹی ہاتھوں میں مہندی لگائے ڈولی میں بٹھائے جانے کی منتظر تھی کہ اچانک دلہا کے گھر والوں کی طرف سے جہیز کے مطالبے کے بعد بارات واپس جا چکی ہے۔ اور دلہن کے گھر میں ماتم کا سماں تھا۔ ایسے میں عارفین کی والدہ اپنے شوہر کے خط ملنے کے بعد اُن کے گھر گئیں اور کچھ ہی دیر میں تمام معاملات طے پا گئے اور ان کے لاڈلے بیٹے کا نکاح اُس مفلس مگر شریف خاندان کی انتہائی خوبصورت بیٹی کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔ قدرت کس وقت کس کو کس طرح نوازتی ہے۔ پل میں بڑے سے بڑے فیصلے کس طرح سے مشیت الٰہی کے آگے تبدیل ہو جاتے ہیں اس راز سے کوئی آشنا نہیں۔ ہوسکتا ہاں اللہ کے کچھ برگزیدہ انسان ہیں جو روحانیت کے اس عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ جہاں ایک عام

انسان کی فہم وفراست دنگ رہ جاتی ہے اور اُسے یہ تمام واقعات ماورائے عقل لگتے ہیں

بہر حال دُلہن جس کی قسمت میں ایک آرام دہ اور عالیشان گھر، محبت کرنے والا شوہر، بے حد نرم دل اور شفیق ساس اور ایک روحانی باپ لکھا تھا اس گھر میں آ چکی تھی اور دوسری جانب ایک خاندان اپنی ضعیف العقیدہ ہونے کے باعث اپنے سروں پر کلہاڑی مار چکا تھا۔

☆☆......☆☆

سسر کی روحانی سفر سے واپسی کے کچھ عرصے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک شام وہ اپنے مہمان خانے میں بیٹھے سائلین کی داد رسی کر رہے تھے کہ اچانک اپنی جگہ پر سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے دینو بابا کو کہا کہ جاؤ بازار سے ایک نئی چارپائی خرید کر لاؤ۔'' دینو بابا چارپائی لائے تو میر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس چارپائی کے اوپر آبِ زم زم کا چھڑکاؤ کیا اور عرقِ گلاب چھڑک کر دالان میں دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ کل تک اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے جب اس کی ضرورت پڑے گی تو خود پتا چل جائے گا۔

یہ واقعہ اُن دنوں کا ہے جب اپنے پیاروں کی میتوں کو ایدھی کے مردہ خانوں میں غسل دینے کا رواج نہ تھا بلکہ اپنے گھر میں لوگ خود یہ کارِ ثواب سرانجام دیا کرتے تھے کس کو معلوم تھا عرقِ گلاب اور آبِ زم زم سے تر یہ چارپائی کس کام آنے والی ہے۔

پچھلے سال حج کے دوران انہوں نے اپنا کفن لے کر مکہ مدینہ کی مٹی سے لگا کر اور زم زم میں ڈبو کر خشک کر کے محفوظ کر لیا تھا۔

رات زین العابدین کے بارے میں اطلاع آئی کہ وہاں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور اپنے تعلقات اور دولت کا استعمال کرتے ہوئے ہر قسم کے الزام سے بری الذمہ ہو چکے ہیں۔ میر صاحب نے واقعے کی تحقیقات کیں۔ معلوم ہوا کہ واقعی ان کا بیٹا قصور وار ہے۔ سخت افسردہ اور ملول ہوئے۔ اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ رات بھر سجدے میں پڑے خدا سے معافی کے طلبگار رہے کہ یا خدا کہاں غلطی ہو گئی۔ اولاد کی تربیت میں کہاں اور کیسے کمی رہ گئی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی نعمت کی صحیح تربیت کیوں نہ کر پائے۔ اتنا بڑا واقعہ کس طرح رونما ہو گیا واقعی

آگ ہے دردِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یہ امتحان ہی تو تھا۔ اپنی نصف بہتر کو بلایا اور کہا کہ زین العابدین کو کہنا اُس لڑکی کو اپنی شریکِ حیات بنا کر، ہماری عزت بنا کر اس گھر میں لے آئے۔ یہ ہماری وصیت بھی ہے اور ہمارا حکم بھی۔ میرے اُس کے ناجائز مطالبات مان لینے اور بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔ واقعی اولاد آزمائش ہے، امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دے۔ ہمارا بلاوا آ چکا ہے۔''

بیگم میر سمجھیں کہ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے روحانی دورے پر نکل جائیں گے اور کچھ عرصے بعد واپس آ جائیں گے۔ مگر اس بار ان کے روحانی وجود سے جسمانی وجود علیحدہ ہو چکا تھا۔ روح پرواز کر چکی تھی اور جسدِ خاکی کو پیوندِ خاک ہونا تھا۔

وہی چارپائی جسے گذشتہ شام انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ ان کا جسدِ خاکی رکھا ہوا تھا۔ باپ کے سفید کفن ڈھکے وجود کے سامنے ماں نے زین العابدین سے وعدہ لیا کہ وہ اسی لڑکی سے نکاح کریں گے جس کی عزت ان کے ہاتھوں پامال ہوئی ہے۔

سوئم کے بعد زین العابدین کا نکاح وہیں کر دیا گیا اور چالیسویں کے بعد وہ اُسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آئے۔

دنیا میں ایسے واقعات کم ہی ہوتے ہیں کہ جہاں ایک انسان ہر قسم کے الزامات سے بری ہونے کے بعد اپنے کیے کا اعتراف کرتے اور اس کا مداوا کرے۔

اور ایسے والدین بھی کم ہی ہوتے ہیں جو اپنے لختِ جگر کی غلطی مان کر اُسے صراطِ مستقیم کی طرف راغب کریں اور اپنی غلطی کا مداوا کرنے کی تلقین کریں۔ آفرین ہے ایسے ماں باپ پر۔

میری نانی یہ واقعہ دہراتے ہوئے آج بھی آب دیدہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آج کے والدین کو بھی اپنی اولاد کی بے جا طرف داری اور جانبداری کے رویے سے محفوظ فرمائے آجکل کی اولادوں کو بے جا آزادی، طرف داری اور نمود و نمائش کے اظہار کی اجازت دینے کی وجہ ہی سے شاہ رُخ کے قتل جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

مفرور



جاوید راہی

دو بہنوں کا قاتل بھائی جو مفرور ہو کر بھی قانون کو جُل نہ دے سکا

داخلی آبادی کرم والا کے سرفراز نے پے درپے فائرنگ کرتے اپنی دونوں بہنوں صائمہ اور صوبیہ کو قتل کر دیا اور موقع واردات سے فرار ہو گیا۔ اس دوہرے قتل کی واردات سنتے ہی ڈی پی او محمد فیصل رانا اپنے منصب کی بجا آوری کو سامنے رکھتے مقتول خواتین کے گھر پہنچ گئے۔ انسپکٹر عزیز احمد چیمہ تھانہ گوگیرہ کو ملزم سرفراز 48 گھنٹوں کے اندر اندر گرفتار کرنے کا عندیہ دیا اور قتل ہونے والی دونوں بہنوں کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔

غیرت کے نام پر صدیوں پہلے بیٹی پیدا ہوتے زندہ درگور کرنے کا رواج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آپؐ سرکار کی تعلیمات کی روشنی میں یہ رواج آہستہ آہستہ دم توڑ گیا مگر حوا کی بیٹی تا حال کبھی اپنی کسی غلطی سے اور کبھی اپنے حقیقی رشتوں کی اَنا کی تسکین کی سولی چڑھتی ہی آ رہی ہے۔

عورت ہمیشہ اس وقت کوئی راست قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے جب اپنے گھر کے تماشوں، اپنی مرضی کی نفی وغیرہ وغیرہ، نسوانی آزادی کے محرکات کو ترقی پذیر معاشرہ ٹھہرایا جاتا ہے ترقی کے اس دور میں سرفراز جیسے افراد کی کمی نہیں۔ رہتی دنیا تک شاید ایسے روح فرسا واقعات جاری رہیں۔

صائمہ اور صوبیہ اپنے کمرے میں پریشانی کے عالم میں بیٹھیں ایک دوسرے کو سرفراز کی بدلتی صورتحال کے بارے میں ڈس کس کرتے اس بات کا خدشہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آج بلا وجہ اس نے دونوں کو ڈانٹا تھا اور گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔

''صوبیہ! اگر یہ ایسا کرے گا تو ہم اپنے راستے تبدیل کر دیں گی کیا؟''

''صائمہ ہمیں اس کا کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا ناں'' صوبیہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

دوسرے روز جو فیصلہ ہوا وہ بڑا ہی خوفناک تھا۔ وہ دونوں گھر سے اپنے اپنے راستے پر ہو گئیں تو والدین نے اغوا کا مقدمہ دائر کروا دیا۔

اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ شروع ہو گئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا جن پر شبہ نہیں بلکہ یقین تھا ان کے لواحقین تک رسائی کی گئی علاقہ کے معتبر لوگوں کے ڈیرے پر صائمہ اور صوبیہ کی واپسی بارے پنچائتیں ہوئیں تو دونوں کی واپسی کا وعدہ ہو گیا اور آخر کار دونوں بہنیں واپس گھر آ گئیں۔

سرفراز کو ان کے اقدام پر دِلی رنج تھا وہ دونوں کو شیر کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور اپنے گھر والوں کو بار بار اس بارے میں دھمکا رہا تھا کہ وہ ان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

دونوں بہنوں کی حفاظت کے حوالے سے ان کا والد عبدالغفور ولد محمد سلیم قوم آرائیں دونوں کو لے کر شیخوشریف اپنے بھائی غلام مرتضیٰ کے گھر چھوڑ گیا۔ کچھ دِنوں بعد عبدالغفور اور اس کی بیوی زبیدہ ان کو

احمد چیمہ کو آ کر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ پولیس نے ابتدائی کاروائی کے بعد دونوں لاشیں اٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال پہنچائیں اور قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی۔

گرفتاری کے بعد قاتل سرفراز نے گفتگو کے دوران بتایا کہ

''میری دونوں بہنوں کی آزادانہ حرکات میرے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھیں جب انہوں نے گھر کی



لینے کی غرض سے شیخوشریف گئے۔ رات بھائی کے گھر رہے صبح تیار ہو کر واپس اپنے گاؤں چاہ کرم والا داخلی کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ سرفراز اسلحہ لہراتا آیا اور دونوں بہنوں کو فائرنگ کر کے بے دردی سے قتل کر دیا اور موقع واردات سے فرار ہو گیا۔ پورا علاقہ اس لرزہ خیز واردات سے خوفزدہ ہو گیا۔ صائمہ اور صوبیہ کی لاشیں خون میں ڈوبی اپنے سگے بھائی کی سفاکی پر ماتم کناں تھیں۔

عبدالغفور نے گوگیرہ تھانہ کے انچارج انسپکٹر عزیز

دہلیز پار کی تو میری ندامت نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ ہر وقت میں لوگوں کی نظروں سے بچتا اِدھر اُدھر پڑا رہتا اور ہر پل دِل میں ان دونوں کے لیے نفرت کا الاؤ دہکتا رہتا۔

مار تو میں ان کو اسی رات ہی ڈالتا مگر گھر والے ان کی سخت نگرانی میں ہوتے تھے۔ میرے رویئے کو دیکھتے ہوئے دونوں کو میرے چچا کے گھر بھجوا دیا گیا تھا اور مجھے ان کی غلطی معاف کر دینے کی تلقین کرنے میں لگے رہتے۔

میں بہت کوشش کرتا کہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال لوں مگر جگ ہنسائی کا زخم ہر پل میرے جسم کو لپیٹے رکھتا۔ اگر میرے والدان دونوں کو چچا کے گھر میں ہی رہنے دیتے اور اودھر ہی سے ان کو رخصت کر دیتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی مگر میرے والدین بھی ان دونوں کی طرفداری کرتے اور میرے جذبات کی ان کو سرے سے پرواہی نہیں تھی۔

جب وہ ان کو واپس لانے کیلئے جارہے تھے تو میں نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر ان کو میرے کہنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے 30 بور کے ریوالور کا پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا جسے میں سنبھالتے ہوئے اپنے چچا کے گھر شیخو شریف چل پڑا' جہاں صائمہ اور صوبیہ نے میرے خوف سے پناہ لے رکھی تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو وہ لوگ واپس اپنے گھر کیلئے تیار تھے مجھ پر نگاہ پڑتے ہی سارے لوگ گھبرا گئے۔ میں نے صائمہ اور صوبیہ کو نظر بھر کر دیکھا لمحہ بھر کیلئے تو میرے اندر بھی بھائی کا پیار کروٹ لے کر جاگ اُٹھا مگر نفرت کی پھوار نے سارا منظر دھواں دھواں کر ڈالا ۔ میرے ریوالور نے آگ برسانا شروع کر دی میرے سامنے میری دونوں بہنیں زمین پر گرتے تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گئیں۔ میرے پورے وجود پر جیسے برف کی بڑی بڑی سلیں رکھ دی گئی ہوں۔ میرے ہاتھ میں لہراتے ریوالور کے خوف سے گھر کے سارے لوگ سہمے ہوئے تھے میں نے آخری نگاہ اپنی بہنوں کی لاشوں پر ڈالی اور حسرت سے اپنی والدہ اور والد کو دیکھتا ہوا چچا کے گھر کی چوکھٹ پار کر آیا۔

میرا رُخ گاؤں سے باہر جانے والی سڑک کی جانب تھا اور میں تقریباً بھاگنے والے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا جب خاصا راستہ میں نے عبور کر لیا تو قریب سے گزرنے والے ایک موٹر سائیکل سوار کو ہاتھ کے اشارہ سے روکنے کا کہا۔ وہ کوئی خدا ترس بندہ تھا مجھے بغیر کسی بھی سوال جواب کے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا مگر کوئی بھی خاص بات نظر نہیں آرہی تھی۔ میں چاروں جانب دیکھ کر کوئی معقول جگہ دیکھنا چاہتا تھا تا کہ اِدھر اُدھر ہو جاؤں۔ آخر کار ایک گنجان درختوں کا جھنڈ نظر پڑا جو درمیان میں پڑتی نہر کے دوسری جانب تھا اور یہ علاقہ غیر آباد سا دِکھائی دیا۔ سڑک سے خاصے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے مجھے محفوظ بھی لگا۔ میں نے موٹر سائیکل والے سے روکنے کا کہا اس نے بریک لگاتے مجھے اُتارا اور سلام دعا کے بعد آگے بڑھ گیا۔

مجھے درختوں کے جھنڈ میں مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے بھوک اور پیاس کی شدت نڈھال کر رہی تھی۔ دور دور تک کسی بھی جاندار پر نظر نہیں جارہی تھی جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سطح اونچائی پر تھی چاروں جانب اونچے نیچے ٹیلے اور گھاس کے میدان تھے۔ جدھر بھی دیکھتا ویرانی اور گہری خاموشی کے ڈیرے تھے میں اپنے آپ کو گھسیٹتے ایک طرف آگے بڑھ رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت کو چاروں جانب سے چلنے والی ہوائیں قدرے کم کر رہی تھیں۔ پیچھے مڑ کر جائزہ لیا تو ڈھلوان کا نشیبی فاصلہ کافی نیچے کی جانب جارہا تھا جب وہ راستہ ختم ہوا تو دور سے دریا کی چمکتی ریت دِکھائی دی اور اِدھر اُدھر چرتے گھومتے ڈھور ڈنگر ساتھ میں کچھ انسانی وجود بھی متحرک نظر آئے۔ مجھے ان کو دیکھ کر اپنے اندر توانائی کا احساس ہوا۔ میری رفتار ان کی طرف تیز ہوگئی قریب پہنچ کر سلام دعا ہوئی اور میں نے پانی مانگا۔ ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا کہ'' دودھ ہے؟''

''ہاں''۔ اس نے اپنے پیچھے لٹکتی پوٹلی میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے بوتل نکالی جس میں ایک چوتھائی دودھ موجود تھا۔ میں نے بے صبری سے پکڑتے ایک دو سانسوں میں بوتل خالی کر دی اور واپس دیتے شکریہ ادا کیا۔ ان کے چہروں پر میرے لئے حیرانی تھی کہ میں اِدھر کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ آخر کار پوچھنے پر میں نے بتایا کہ میں کھنڈ بوڑ جا رہا ہوں شاید غلط راستہ اختیار کر لیا ہے؟

''نہیں، راستہ تو ٹھیک ہے دریا آگے جا کر خاصا تنگ ہو جائے گا۔ تم دوسری طرف ہو جانا۔ درختوں

کے جھنڈ نظر آئیں گے جدھر سے بھی جاؤ کھنڈ بوڑ ہی جا نکلو گے''۔

دونوں نے مجھے تسلی سے سمجھایا میں ان کا پھر سے شکریہ ادا کرتے اس طرف چل پڑا ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ پیچھے سے انہوں نے آواز دی۔ میں رُک کر گھوما تو وہ پوٹلی والا میری ہی طرف آ رہا تھا۔

''جی بھائی''!؟ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ رکھ لو بھوک لگے تو کھا لینا اس نے دو روٹیاں جن پر اچار رکھا ہوا تھا میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میرے لئے یہ دو روٹیاں دو ماہ کے راشن کی حیثیت کے برابر تھیں۔

آدھی روٹی میں نے چلتے چلتے کھالی اور بقایا لپیٹ کر اپنی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیں۔ دودھ اور روٹی نے میری نقاہت قدرے کم کر ڈالی تھی اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا دریا کی کنڈی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک جگہ دوسری طرف جانے کا راستہ بنا ہوا تھا میں نے ٹٹول کر پاؤں کی مدد سے گہرائی دیکھی جب یقین ہو گیا کہ پانی تھوڑا تھوڑا ہے تو میں خدا کا نام لے کر دریا میں اُتر گیا۔ واقعی پانی کی گہرائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ دریا کہیں سے خشک اور کہیں سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا صدیوں سے بہہ رہا تھا۔ جب بارشیں یا اوپر سے پانی کا بند ٹوٹ جاتا تو چاروں جانب دریا ہی دریا بن جاتا تھا۔ دوسری جانب آ کر میں نے اپنے کپڑے درست کئے اور درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑا جو دریا کے اس کنارے کے ساتھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

چلتے چلتے میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور میرا پورا وجود پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے خود کو نیچے گرا دیا اور سیدھا چت لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ چاروں جانب ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا اور درختوں پر اُلٹے لٹکے بڑے بڑے چمگادڑ جاگ اُٹھے تھے اور اِدھر اُدھر پھڑ پھڑاتے خوفناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

مستقبل کے معمار

ایک بچہ جس کی امی تعریف کرتی تھیں۔ ایک دن اپنے شوہر سے کہنے لگیں۔

''میرا بچہ بہت ذہین ہے۔ جب یہ چلتا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بڑا آفیسر چل رہا ہو۔ ضدی اتنا ہے جیسے یہ مستقبل کا وزیر اعظم ہوگا۔ سمجھدار اتنا ہے کہ جیسے یہ مستقبل میں وزیر اطلاعات ونشریات بنے گا اور ذہین اتنا ہے جیسے یہ حزب اختلاف کا قائد بھی بن سکتا ہے۔''

شوہر نے چیختے ہوئے کہا۔

''بس کرو بیگم' مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا ہو کر ہمیں جیل بھجوائے گا۔''

(مرسلہ: عمیر شبیر۔ کراچی)

دونوں بہنوں کو قتل کر کے دل کو سفلی تسلی تو ہوئی تھی مگر میرے دل کے ہی کسی کونے میں چھپا ان کا پیار بھی اُمڈ رہا تھا۔ دونوں کو یاد کر کے میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ کافی دیر یونہی پڑا رہا جب دل کا بوجھ ذرا کم ہوا تو دوبارہ اُٹھ کر ایک سمت کو چل پڑا''۔

☆......☆......☆

ڈی پی او محمد فیصل رانا نے انسپکٹر عزیز احمد چیمہ کو جو ٹاسک دے رکھا تھا اس کے مطابق میرا رابطہ مسلسل ان سے تھا۔ ڈی ایس پی صدر فاروق احمد خان اس سلسلہ میں خودنگرانی پر مامور تھے میرا جب بھی ان سے پوچھنے کا اتفاق ہوا وہ بڑی اپنائیت سے کہتے بس تھوڑا انتظار۔ میں ان کی طرح داری پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتا۔

پھر ایک رات مجھے انسپکٹر عزیز احمد چیمہ کا فون آیا جو مجھے سرفراز کو گرفتار کرنے کی خوشخبری سنا رہے تھے اور صبح تھانہ کوگیرہ آنے کا کہا۔

کوگیرہ پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگے ٹوٹی پھوٹی سڑک اور جگہ جگہ بنے کھڈے کافی صبر آزما سفر تھا۔

آخر کار تھانہ گوگیرہ کے صدر دفتر جا پہنچا۔عمارت کا ایک حصہ سال خوردہ تھا جس کی پیشانی پر 1857ء کندہ تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسی زمانے میں ضلع تھا اور یہاں برکلے نامی انگریز ڈپٹی کمشنر تھا جس کا راج چاروں جانب چلتا تھا۔علاقہ کو کنٹرول کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسی دور میں محمد خان کھرل جو ہیرو تھا راوی کا اس کے احکام کو ریت کی دیوار کی مانند ٹھوکر مارتے زمین بوس کر ڈالتا، یہ تذکرہ پھر کبھی۔

چیمہ صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بٹھاتے دوہرے قتل کے ملزم سرفراز کو بلوایا جو سامنے حوالات میں بند تھا۔تھوڑی دیر بعد سرفراز ہتھکڑی میں جکڑا پولیس ملازم کے ہمراہ آفس میں داخل ہوا۔

میں نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے چیمہ صاحب سے گفتگو کرنے کی اجازت مانگی جو انہوں نے اُسے مخاطب کرتے کہا کہ جو بھی یہ سوال کریں اس کا جواب ٹھیک ٹھیک دینا۔ سرفراز نے نظریں نیچے کرتے اپنے سر کو جنبش دی۔

''سرفراز یہ انتہائی اقدام اُٹھانے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آئی؟''

''بس جی غیرت کے ہاتھوں مجبور ہوکر''۔

''کیا تمہاری بہنیں اغوا ہوئی تھیں یا اپنی مرضی سے اپنے آشناؤں کے ساتھ گھر سے نکل گئی تھیں؟''

''وہ اپنی مرضی سے گئیں یا وہ لوگ بھگا کر لے گئے دونوں صورتوں میں جنازہ تو میری غیرت کا نکلا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں'' اس نے بڑے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے''!میں نے چیمہ صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے ملازم کو لے جانے کا اشارہ کیا۔ سرفراز سلام کرتا ان کے آفس سے باہر نکل گیا۔

''جی جناب!تو کس طرح ہاتھ آیا یہ؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''ڈی پی او صاحب اور ڈی ایس پی صدر فاروق احمد خان چونکہ اس سلسلہ میں ذاتی طور پر رابطے میں تھے اور میں نے بھی چاروں جانب بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ جال بچھا دیا تھا ریکی کرنے والوں کا۔ رات گئے مجھے اپنے سورسز سے اطلاع ملی کہ ایک آدمی رات کے اندھیرے میں دریا کے ساتھ والے ذخیرہ میں نقل وحرکت کرتے دیکھا گیا ہے۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی قیادت میں پولیس پارٹی کے جو شیلے ملازموں کا انتخاب کیا اور دو جیپوں پر سرفراز کا تعاقب شروع کر دیا۔

جو راستہ میں نے اختیار کیا تھا وہ خاصا پُر پیچ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی تھا۔ایک دو بار تو مرتے مرتے بچے جیپ یکدم دریا کی طرف گھوم گئی یہ تو خدا کی قدرت تھی کہ ڈرائیور نے فل بریک لگا لئے ورنہ ڈوبنا یقینی تھا۔

جیپیں چھوڑ کر ہم لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ فون کر کے قریبی گاؤں کے نمبردار کو گھوڑے لانے کا کہا رات کے ساڑھے تین کا عمل چل رہا تھا اور ہم ٹارچوں کی روشنی میں دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ اتنے میں گھوڑے بھی پہنچ گئے ۔نمبردار اس علاقہ کو جانتا تھا اس لئے اس کی رہنمائی کام آگئی اور ہم گھوڑوں کے ذریعے دریا عبور کرتے درختوں کے بیچوں وبیچ چاروں جانب پھیلے ہوئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا گہری مایوسی کا سامنا میرے لئے پریشان کن مرحلہ ثابت ہوا اور ہم سب تھک ہار کر واپس آگئے۔

رات بھر کا میں تھکا ماندا' بستر پر پڑتے ہی آنکھ لگ گئی کہ وائرلیس پر ڈی پی او صاحب کا میسج آگیا جو مجھ سے سرفراز کی گرفتاری بارے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔میں نے گزری رات کی ساری کاروائی ان کے گوش گزار کی تو انہوں نے نہایت شفقت کا مظاہرہ کرتے میری ہمت بڑھائی اور کہا کہ

''عزیز احمد تم یہ کر سکتے ہو۔تم نے پانچ لاکھ انعام کے مفرور کو گرفتار کر لیا تھا یہ تو معمولی ہاؤس کرمنل ہے۔ اُٹھو اور مجھے خوشخبری دو اس کی گرفتاری کی''۔

''جی سر بہتر'' میں احتراماً جواب دیا اور اُٹھ کر دو نفل نماز شکرانہ دعا جزی ادا کی اور پولیس پارٹی تیار کر

کے دریا کی جانب چل پڑا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ سرفراز اِدھر ہی روپوش ہے۔ اگر تھوڑا وقت اور گزر جاتا تو اس کا اِدھر اُدھر ہو جانا ممکن ہو جاتا۔ دریا کے کٹاؤ کی طرف آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میرا خیال بار بار اس طرف جا رہا تھا آخر کار میں نے ڈرائیور کو اس طرف چلنے کا کہا۔ کافی سفر کے بعد مجھے خانہ بدوش جھگیوں والے نظر آئے جو اپنی بھیڑ بکریوں کی نگرانی میں پیچھے چل رہے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کا کہا اور خود اُتر کر ان کی طرف چل پڑا۔ اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ سہم گئے مگر میری تسلی آمیز باتوں سے ان کا ڈر خوف جاتا رہا تو میں نے ان سے سرفراز کے بارے میں پوچھا۔ چند لمحوں کے بعد جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

''ہاں جناب کل تقریباً شام پانچ بجے جب ہم اپنا ریوڑ واپس لا رہے تھے ایک دُبلا پتلا آدمی ہم نے درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر دریا کی نشیبی جانب جاتے دیکھا تھا''۔

جو حلیہ ان کی زبانی معلوم ہوا وہ سرفراز کا ہی تھا میں نے وقت ضائع کئے بغیر اپنے ساتھیوں کو راستہ بدلنے کا کہا اور ہم دریا کے بہاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کوئی بندہ اور نہ بندے کی ذات۔ پتا نہیں میں کیوں پھر بھی آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے پروردگار میری خود راہنمائی فرما رہے ہوں۔ دن کی روشنی میں ڈرائیور گاڑی بھی بڑی احتیاط سے چلا رہا تھا۔ ایک دو جگہ نرم ریت میں ٹائر پھنسے مگر میرے جوان دھکا لگا کر گاڑی نکال کر لے جاتے۔

اب درختوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا تھا اور مال ڈنگر چرانے والوں کے سوا کسی سے واسطہ نہ پڑا جس سے پوچھا یہ جواب ملا کہ نہیں ہم نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

اسی اثناء میں مجھے اپنے چھوڑے ہوئے دوستوں میں سے ایک کا فون موصول ہوا کہ سرفراز کو کسی نے فتح پور کی طرف جاتے دیکھا ہے جو شاید راوی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر گاڑیاں اس طرف موڑنے کا کہا اور ہم سرفراز کے تعاقب میں چل پڑے۔

ٹول پلازہ سے تھوڑا پیچھے میں نے رُک وہاں ایک دو ڈیرہ داروں سے گھوڑے لئے اور دریا کی طرف چل پڑے۔

گھوڑے ریت اُڑاتے آگے بڑھ رہے تھے کہ ہمیں دور سے ایک اکیلا آدمی درخت کے نیچے لیٹا دکھائی دیا۔ شاید پڑا سو رہا تھا جب گھوڑوں کے بھاگنے اور ہمارے شور کو سُنا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور ہمیں دیکھتے ایک طرف سرپٹ بھاگ اُٹھا اور بھاگتے دو تین فائر ہماری طرف داغ دیے۔

میں نے فائر اس انداز سے کرنے کا کہا کہ وہ ڈر کر ہتھیار ڈال دے اور ہماری گولیوں سے اس کی موت نہ واقع ہو جائے۔ جس انداز میں ہم اس کی طرف بڑھ رہے تھے وہ خود بخود ہمارے قابو میں آ رہا تھا۔ آخر کار وہ رُک گیا اور اپنا ریوالور زمین پر گراتے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔

میں نے گھوڑا اس کے عین سر پر آن روکا اور اسے للکارا کہ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو اِدھر اُدھر کر دوں گا۔ جواب میں اس نے خود کو زمین پر اوندھے منہ گرا دیا۔ پولیس اہلکاروں نے اسے قابو کرتے دونوں بازو اس کی قمیض سے پیچھے کی طرف باندھتے اٹھایا اور دریا کے کنارے کنارے واپسی کے لیے چل پڑے۔

سرفراز کی گرفتاری پر اور پانچ لاکھ سر کی قیمت والے ڈکیت کو گرفتار کرنے پر جناب آئی جی صاحب نے -/25000 روپے نقد اور سرٹیفکیٹ سے نوازا۔ سرفراز کے خلاف زیر دفعہ 302 ت پ 319/15 رپٹ نمبر 13 مورخہ 15-08-01 مقدمہ درج کرتے جیل بھیج دیا ہے''۔

بتا کر انسپکٹر عزیز احمد چیمہ خاموش ہو گئے اور میں اپنے وطن کے اس غیور انسپکٹر کو دل میں سراہتا اگلی کہانی کی تلاش میں تھانے سے باہر نکل گیا۔

☆☆......☆☆

پلیٹ فارم

ٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں..........
جن میں جدائی اور ملن کی دھوپ چھاؤں بھی شامل ہے

قُلی سے افسر تک



ممتاز احمد

انسان کا نصیب اُسے فرش سے عرش تک پہنچا دیتا ہے ایک قلی کے افسر بننے کی داستان

وہ سردیوں کی ایک شام تھی جب آخری ٹرین ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر رُکی تھی۔ ٹرین سے اُترنے والے مسافروں میں ایک بوڑھی عورت جس کے ساتھ ایک خوبرو جوان لڑکی جس کی عمر اندازاً بیس یا بائیس سال ہوگی اور دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اُن کے چہروں کی تھکن بتا رہی تھی کہ وہ لمبے سفر سے آئی ہیں۔ بوڑھی عورت نے کسی قلی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ جب میں پاس گیا تو وہ کہنے لگیں۔

''ہمارا سامان گاڑی کے ڈبے سے اُتار کر ریلوے اسٹیشن کے باہر تک پہنچا دو۔'' چنانچہ مزدوری طے کر کے میں نے اُن کا سامان جس میں تین جستی ٹرنک، دو اٹیچی کیس، بیگ اور گٹھڑی جس میں کمبل اور گدے وغیرہ بندھے تھے۔ پہلے ٹرین سے اُتار کر پلیٹ فارم پر رکھے اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن کے باہر پہنچائے۔ انہوں نے اپنے گھر جانے کے لیے ایک تانگہ کروایا۔ تانگے کا کوچوان ایک انتہائی بوڑھا ضعیف العمر شخص تھا۔ میں نے اُن کا سارا سامان تانگے میں رکھ دیا۔

جب وہ چلنے لگے تو بوڑھی عورت نے کہا۔

''بیٹا ایسا ہے کہ تم ہمارے ساتھ آ جاؤ اور یہ سارا سامان تانگے سے اُتار کر ہمارے گھر جو کہ بالائی منزل پر ہے میں پہنچا دینا، کیونکہ یہ کوچوان بہت کمزور اور ضعیف ہے۔ تمہیں اس کام کے الگ سے پیسے دے دوں گی۔''

اب چونکہ اس کے بعد اور کوئی ٹرین نہیں آنی تھی اور اب میں نے ویسے بھی اپنے ٹھکانے پر جانا تھا تو سوچا چلو چار پیسے اور مل جائیں گے، کیا حرج ہے۔ میں نے حامی بھر لی اور اُن کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔

کوئی بیس یا پچیس منٹ کی مسافت کے بعد اُن کا گھر آ گیا۔ میں نے سارا سامان تانگے سے اُتار کر نیچے رکھا تو کوچوان اپنا کرایہ لے کر چلا گیا۔

بوڑھی عورت نے ایک گیٹ کا تالا کھولا تو آگے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ چنانچہ اُن کے اوپر جانے کے بعد ایک ایک کر کے اُن کا سارا سامان اوپر پہنچا دیا۔ جب اُن کا سارا سامان اُن کے کمرے میں رکھ چکا اور واپسی کی اجازت چاہی تو بوڑھی عورت نے میرا شکریہ ادا کیا اور بڑی شفقت اور پیار سے کہا کہ

بیٹا اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو ہمارا ایک اور کام کر دو گے؟'' میں نے کہا۔

''ماں جی آپ بتائیں کیا کام ہے؟''

تو ماں جی نے مجھے کچھ روپے دیے اور کہنے لگیں۔

''بیٹا گھر میں ہر چیز ختم ہے ہمیں بھوک لگی ہے تو ایسا کرو ہوٹل سے کھانا، دودھ اور کسی دکان سے چینی، پتی اور میڈیکل اسٹور سے میری یہ دوائی لا دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔'' میں نے اُن کی مجبوری کو دل سے محسوس کیا تھا۔ خاموشی سے پیسے لے کر پیدل بازار گیا اور اُن کی مطلوبہ اشیاء لے کر واپس آ گیا مگر تین چار میڈیکل اسٹور پر جانے کے بعد بھی اُن کی ایک میڈیسن نہ ملی تھی۔ جب میں کھانا، دودھ چینی، پتی وغیرہ اُن کو دے کر واپس جانے لگا تو ماں جی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا بیٹا تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

میں نے کہا کہ ماں جی مجھے بیٹا بھی کہہ رہی ہیں اور شکریہ بھی ادا کر رہی ہیں۔'' تو اس پر ماں جی نے کہا۔

''اچھا بیٹا اب کھانا کھا کر جانا۔''

میں نے انکار کیا تو ماں جی نے اسرار کے ساتھ کہا کہ مجھے ماں بھی کہتے ہو اور ماں کی بات سے انکار بھی کر رہے ہو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ چنانچہ میں کھانے کے لیے رک گیا۔ اصل میں مجھے بھی بھوک لگی تھی۔

ماں جی نے اُس جوان لڑکی جس کا نام زبیدہ تھا سے کہا بیٹی یہ لو کھانا اور برتن میں ڈال کر لے آؤ۔ چنانچہ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر زبیدہ چائے بنا کر لے آئی میں نے نوٹ کیا کہ زبیدہ کے چہرے پر اُداس اور ویرانی تھی۔ میں جتنی دیر وہاں رہا زبیدہ بالکل خاموش رہی۔ اور اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ چائے پی کر میں وہاں سے آ گیا اور ماں جی سے کہا کہ آپ کی جو دوائی نہیں ملی کل وہ بڑے بازار کے میڈیکل اسٹور سے آپ کو لا دوں گا۔''

چنانچہ اگلے روز میں ماں جی کی دوائی لے کر اُن کے گھر گیا۔ تو وہ بہت پُرتپاک طریقے سے ملیں۔ میں



ماں جی کے پاس اُن کے کمرے میں بیٹھ گیا تو انہوں نے زبیدہ کو آواز دی کہ چائے بنا کر لے آؤ۔''

زبیدہ دو کپ چائے دے کر اپنے بچے کو دودھ پلانے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے باتوں باتوں میں ماں جی سے زبیدہ کے بارے میں پوچھا۔

''یہ آپ کی بہو ہے؟'' ماں جی نے بتایا کہ یہ اُن کی بیٹی ہے۔ چار سال پہلے اس کی شادی رحیم یار خان کی تھی۔ اس کا خاوند بہت اچھا تھا مگر چھ ماہ پہلے اُس کا انتقال ہوگیا۔ زبیدہ کی عدت جیسے ہی پوری ہوئی تو اس کے سسرال والوں نے اپنی نظریں پھیر لیں اور مجھے پیغام بھیجا کہ وہ بہت غریب ہیں۔ زبیدہ اور اُس کے دو بچوں کو نہیں پال سکتے۔ آ کر اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔ تو بیٹا میں پانچ دن پہلے رحیم یار خان گئی تھی اور کل اس کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔ زبیدہ بے چاری بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی ہے۔ اس کا اب میرے سوا کوئی نہیں ہے۔''

زبیدہ کے چہرے پر خوبصورتی کے ساتھ بہت معصومیت اور سادگی تھی۔ پھر ماں جی نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے اُن کو اپنے بارے میں بتانا شروع کیا تو زبیدہ بھی آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے بتایا کہ بچپن میں ہی میرے والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے تو میرا چچا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری چچی بہت اچھی عورت تھی۔ اُس نے نہ صرف مجھے ماں کا پیار دیا بلکہ ماں بن کر پالا۔ اصل میں چچا اور چچی بے اولاد تھے تو چچا اور چچی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میرے لاڈ اٹھاتے۔ چچا اکثر چچی سے کہتا کہ نیک بخت میرے یتیم بھتیجے کا خیال رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو میں اللہ کی رحمت سے دور ہو جاؤں اور قیامت کے دن اپنے بھائی بھابی سے شرمندہ ہوں۔ الغرض میں چچا چچی کے زیر سایہ پلنے لگا۔ مجھے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میں ساتویں کلاس میں پڑھ رہا تھا کہ چچی کو ہیضے کا مرض لاحق ہوگیا اور آناً فاناً چچی کا انتقال ہوگیا۔ چچی کی موت پر میں بہت رویا کیونکہ ایک بار میں پھر ماں کی ممتا سے محروم ہوگیا تھا۔

چچا کا بڑا سا گھر تھا۔ ایک دو بھینسیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ تو چچی کی وفات کے بعد گھر کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ چنانچہ گھر کو سنبھالنے کے لیے چچا کو مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی۔ جس عورت سے چچا نے دوسری شادی کی وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ اُس کے دو بچے تھے اور بے سہارا عورت تھی۔ تو چچا نے اُس سے نکاح کر لیا۔ شروع شروع میں تو میری نئی چچی کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک رہا پھر آہستہ آہستہ چچی جس کا نام سلطانہ تھا بدلنا شروع ہوگئی۔

چچا سارا دن کھیتوں میں کھیتی باڑی میں مصروف رہتا جبکہ اسکول سے واپس آنے کے بعد بھینسوں کی دیکھ بھال، اُن کو نہلانا، چارہ کاٹ کر لانا اور بھینسوں کے آگے ڈالنا دودھ دوہنا اُن کا گوبر ہٹانا وغیرہ سب میرے ذمے لگا دیا۔ اس کے علاوہ دیگر کام بھی میرے ذمے تھے۔ چچی سلطانہ مجھ پر خوب حکم چلاتی جبکہ اپنے بچوں کو شہزادوں کی طرح رکھتی۔ بات بات پر چچی سلطانہ مجھے گالیاں دیتی اور میری کسی بھی معمولی غلطی پر بہت مارتی۔ چھڑی سے میری پٹائی کرتی۔ اب روزانہ مار میرا مقدر تھی۔ انہی حالات میں میں نے مڈل کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اب میں آگے پڑھنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا تو ایک روز کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے چچا کو سانپ نے ڈس لیا۔ جس سے اُن کی موت واقع ہوگئی۔ چچا کی موت کے بعد میری زندگی انتہائی دشوار ہوگئی۔ میرا آگے پڑھنے کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ اب میں صبح سے لے کر رات تک نوکروں کی طرح کام کرتا کیونکہ اب کھیتی باڑی کا کام بھی میرے سپرد ہوگیا۔ مگر بدلے میں مجھے گالیاں اور مار پڑتی۔ یہاں تک کہ میری کسی معمولی سی غلطی پر مار لگ پڑتی اور سارا سارا دن چچی کھانے کو بھی کچھ نہ دیتی۔ ایک دن چچی سلطانہ کا بیٹا کسی بات پر مجھ سے لڑ پڑا۔

اُس نے مجھ پر دو تین پتھر برسائے جو مجھ کو نہ

لگے۔ پھر وہ مجھے ماں کی گالیاں دینے لگا تو مجھے غصہ آ گیا۔ پھر ہم دونوں کی خوب لڑائی ہوئی تو میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پتھر آ گیا جو کہ میں نے اُسے مارا جس سے اُس کا سر پھٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا چچی نے مجھ پر اتنا تشدد کیا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو چچی نے ایک بار پھر مجھے مارنا شروع کر دیا اور پھر مجھے گھر سے نکال دیا اور کہا اب اگر اس گھر تو کیا گاؤں میں بھی دوبارہ قدم رکھا تو تیری ٹانگیں اور ہاتھ پاؤں توڑ دوں گی، دفع ہو جاؤ میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے۔''

میں گرتا پڑتا گاؤں سے شہر جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگ گیا۔ کافی آگے جا کر ایک سڑک آ گئی۔ مجھے بہت سخت بھوک اور پیاس لگی تھی تو سڑک کی ایک سائیڈ پر لگے نلکے سے پانی پیا تو اسی اثناء میں ایک ٹریکٹر ٹرالی جس پر سبزی لدی ہوئی تھی، چند منٹ کے لیے ڈرائیور نے ٹریکٹر ٹرالی روکی تو میں چپکے سے اُس سے چوری ٹرالی میں سوار ہو گیا۔ اور بھوک مٹانے کے لیے کچی سبزیاں گاجریں اور شلجم وغیرہ کھانے لگا۔ ٹریکٹر ٹرالی ایک گھنٹہ چلتی رہی اور شہر آیا اور ایک جگہ ٹرالی رُکی تو میں نیچے اُتر گیا۔ شہر آ کر بہت دھکے کھائے اور پھر بالآخر ریلوے اسٹیشن پر قلی بن گیا۔''

میری داستان سن کر ماں جی اور زبیدہ کافی رنجیدہ ہوئیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ میرا اُن کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ میں نے ماں جی کو سگی ماں کا درجہ دیا اور میں اُن کے بہت سارے کام کر دیتا۔ میں نے زبیدہ کو ہمیشہ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا۔ میری آنکھوں میں شرم و حیا کے ساتھ شرافت اور حسنِ اخلاق کا وصف بھی ہے۔ میں جب بھی اُن کے گھر جاتا تو زبیدہ کے بچوں کے لیے ٹافیاں، بسکٹ، چاکلیٹ وغیرہ لے کر جاتا کہ یتیم بچے ہیں تو وہ یہ چیزیں لے کر بہت خوش ہوتے اور میری آمد کے منتظر رہتے۔

اب زبیدہ بھی مجھ سے دو چار باتیں کر لیتی۔ ایک دن باتوں باتوں میں زبیدہ نے مجھ سے کہا۔

''اشرف کوئی مستقل اور بہتر اپنے کام کا ذریعہ بناؤ۔'' تو میں سنجیدگی سے زبیدہ کی اس بات پر غور کرنے لگا۔

☆......☆......☆

مجھے ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ میری عمر اب اُنیس سال ہو گئی تھی۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ محکمہ ریلوے میں نائب قاصد (چپڑاسی) کی کچھ آسامیاں خالی ہیں اور بھرتی کے لیے اشتہار آیا ہوا ہے۔ تو میں نے اللہ کا نام لے کر درخواست جمع کروا دی۔ اور تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد اپنا مڈل کا سرٹیفکیٹ بھی نکلوا لیا اور اپنا شناختی کارڈ بھی بنوا لیا۔ کافی سارے امیدواروں نے درخواستیں جمع کروائی تھیں اور یہ بھی سُننے میں آیا کہ ایم این اے، ایم پی اے اور وزیروں کی سفارشیں بھی چل رہی ہیں۔ تو میں مایوس ہو گیا کیونکہ میرے پاس تو کوئی سفارش نہیں تھی۔

ریلوے کے جس افسر نے بھرتی کرنی تھی تو اُن کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ اُن کو اپنے باپ سے بہت پیار تھا اور دو یا تین ماہ پہلے اُن کے والد صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ وہ اپنے والد کو یاد کر کے بہت روتے تھے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اُن کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ اُس افسر کے والد صاحب اُن کے آبائی شہر کے ایک قبرستان میں دفن ہیں۔ چنانچہ اگلے دن میں اُن کے آبائی شہر گیا جو کہ زیادہ دور نہیں تھا اور قبرستان جا کر اُن کی قبر تلاش کی اور فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس آ گیا۔ دو دن کے بعد بھرتی کے لیے انٹرویو شروع ہو گئے۔ جب انٹرویو کے لیے میری باری آئی تو میں نے جا کر اُس افسر کو بڑے ادب سے سلام کیا اور اپنی جیب سے ایک پُڑیا نکال کر اُن کی ٹیبل پر رکھ دی۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟''

تو میں نے کہا۔ ''سر یہ میری سفارش ہے۔''

جس پر وہ بولے کہ کیا مطلب؟ اس میں کیا ہے؟''

میں نے بڑے احترام سے کہا سر آپ ایک بار کھول کر دیکھ تو لیں۔''

جس پر انہوں نے پڑیا کھول کر دیکھی تو اُس میں تھوڑی سی مٹی تھی۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے اور پوچھنے لگے کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ کیسی مٹی ہے؟''

تو میں نے کہا کہ سر یہ آپ کے والد محترم کی قبر کی مٹی ہے اور یہی میری سفارش ہے۔ آپ کے والد صاحب کا تین ماہ پہلے انتقال ہوا ہے تو میں اُن کی قبر سے یہ مٹی لے کر آیا ہوں۔ پلیز اس مٹی کو میری سفارش سمجھیں۔'' اس پر اُس افسر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے مجھ سے اپنے والد صاحب کے بارے میں تفصیل پوچھی تو میں نے بتایا کہ فلاں شہر آپ کا آبائی شہر ہے۔ آپ کے والد صاحب فلاں کام کرتے تھے اور فلاں تاریخ کو اُن کی وفات ہوئی وغیرہ وغیرہ اور وہ فلاں قبرستان میں دفن ہیں۔

پھر میں نے اُن کو ساری نشانیاں بتائیں تو وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے۔

''مسٹر اشرف مجھے اپنے والد صاحب سے بے پناہ پیار تھا۔ میں نے پوری زندگی اُن کی ہر بات مانی ہے۔ کبھی کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ اب تم اُن کی قبر کی مٹی بطور سفارش لے کر آئے ہو تو میں اس سفارش کو قبول کرتا ہوں اور تمہیں اس مٹی کے صدقے بھرتی کر لیتا ہوں۔ بس تم خاموشی سے جاؤ اور کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کرنا۔''

چند دنوں کے بعد مجھے نائب قاصد کی تقرری کا لیٹر مل گیا۔ میں بہت خوش ہوا اور اُس افسر کے گھر جا کر اُن کا شکریہ ادا کیا۔

آج مجھے بہت بڑی خوشی ملی تھی مگر میری اس خوشی کو منانے والا، سیلیبریٹ کرنے والا کوئی اپنا نہ تھا۔

میں اُسی وقت بازار گیا۔ ماں جی کے لیے ایک سوٹ، زبیدہ کے لیے ایک شال، اُس کے بچوں کے لیے کھلونے اور مٹھائی کا ڈبہ لیا اور سیدھا ماں جی کے گھر چلا گیا اور اُن کو بتایا کہ مجھے سرکاری پکی نوکری مل گئی ہے۔ جس پر ماں جی نے مجھے بہت پیار کیا۔ مبارکباد کے ساتھ ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ پھر زبیدہ نے بھی مجھے مبارکباد دی۔

جب میں نے ماں جی کو سوٹ اور زبیدہ کو شال دی تو زبیدہ بہت خوش ہوئی ماں جی نے کہا۔

''بیٹا اِس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' تو میں نے کہا۔ ''ماں جی میرا آپ کے سوا اور کون ہے۔ آپ کو اپنی ماں کہتا ہوں تو بیٹا ہونے کے ناتے نوکری ملنے کی خوشی میں آپ کے لیے لایا ہوں۔''

پھر میں نے نائب قاصد کی ڈیوٹی شروع کر دی۔ میں اپنے فرائض ذمہ داری سے سرانجام دیتا۔ سب کی عزت کرتا، ہر کسی کے ساتھ احترام سے پیش آتا تو سارے افسران، کلرک صاحبان اور دوسرا عملہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ میرا آنا جانا ماں جی اور زبیدہ کے گھر جاری رہا۔

اب میں نے محسوس کیا کہ جب بھی میں اُن کے گھر جاتا تو زبیدہ کے چہرے پر رونق اور چمک سی آ جاتی اور وہ خوش ہو جاتی۔

ایک دن میں اُن کے گھر گیا اور ماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا تو زبیدہ چائے اور کچھ لوازمات لے کر آ گئی اور ہماری باتوں میں شامل ہو گئی۔ اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''اشرف اگر میں کچھ کہوں تو میری بات مانو گے۔''

میں نے کہا اگر ماننے والی ہوئی تو ضرور مانوں گا۔''

جس پر زبیدہ نے کہا کہ بات بالکل ماننے والی ہے اور تمہارے فائدے کی ہے۔'' چنانچہ میں نے حامی بھرلی تو زبیدہ نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ہر حال میں اُس کی بات مانوں گا۔''

زبیدہ نے کہا کہ ''اشرف آپ کو نائب قاصد کی نوکری مل گئی ہے تو کیا ساری زندگی نائب قاصد ہی رہو گے؟'' میں اُس کی بات سن کر خاموش رہا پھر زبیدہ نے کہا۔

''آپ آٹھ جماعتیں پاس ہو تو ایسا کرو نوکری کے ساتھ پرائیویٹ میٹرک کی تیاری کرو۔ آپ ذہین

اور لائق ہو تو آپ اچھے نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کرلو گے۔''

ماں جی نے بھی زبیدہ کی اس بات کی تائید کی اور مجھے بھی یہ بات بھلی لگی۔

ماں جی اور زبیدہ کے اصرار اور زور دینے پر میں نے میٹرک کی کتابیں لے کر امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ ایک ٹیچر کے پاس ٹیوشن بھی رکھ لی اور ایک سال کی تیاری کے بعد میٹرک کا امتحان دے دیا اور پھر جب رزلٹ آیا تو میں نے سیکنڈ ڈویژن میں امتحان پاس کرلیا۔ مجھے تو خوشی ہوئی سو ہوئی مگر خاص طور پر زبیدہ کے چہرے پر جو خوشی تھی، وہ میں بتا نہیں سکتا۔

پھر اسی طرح میں نے ایک ایوننگ کوچنگ سینٹر میں ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔

☆......☆......☆

ایک دن ماں جی کے پاس بیٹھا تھا تو اُس روز ماں جی بہت سنجیدہ تھیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اشرف بیٹا بات یہ ہے کہ میں اب بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ کئی بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ کوئی پتا نہیں کب اللہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں سوچتی ہوں کہ میرے بعد میری جوان بیوہ بیٹی اور یتیم نواسوں کا کیا بنے گا۔ زبیدہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ یہ گھر بھی کرائے کا ہے۔ میرے خاوند سرکاری ملازم تھے تو دوران سروس اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد پنشن مل رہی ہے جس سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ میرے مرنے کے بعد یہ پنشن بھی بند ہو جائے گی تو زبیدہ بے چاری بے آسرا ہو جائے گی۔ یہی سوچ مجھے دن رات کھائے جا رہی ہے۔''

ماں جی کی بات سو فیصد درست تھی۔ پھر ماں جی نے مجھ سے کہا کہ اشرف بیٹا میں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم زبیدہ سے نکاح کرلو کیونکہ تم بہت اچھے ہو، شریف اور خوش اخلاق ہو۔ تمہارا کردار بہت اچھا ہے۔ تم سے اچھا انسان نہیں مل سکتا جو زبیدہ کا سہارا بن سکے۔ تم زبیدہ کو اپنا لو۔''

غریبی کا مزا

گاؤں میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ پورا گاؤں پریشانی میں گھرا ہوا تھا۔ کچھ لوگ مویشیوں کو محفوظ مقام کی طرف ہانک رہے تھے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں و دیگر ضروریات زندگی اور بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو لے کر بلند مقام کی طرف جا رہے تھے۔ غرض کہ افراتفری کا عالم تھا۔

ایسے میں ایک میراثی گاؤں کے چوہدری صاحب کے پاس بیٹھ کر مزے سے حقہ پی رہا تھا۔ چوہدری نے میراثی سے کہا۔ ''اے اللہ کے بندے! تم بھی اپنے گھر جاؤ اور گھر والوں اور مال و اسباب کو سنبھالو۔''

میراثی نے جواب دیا۔ ''چوہدری صاحب! آج ہی تو غریبی نے مزا دیا ہے نہ کچھ تھا اور نہ سنبھالنا پڑا ہے۔''

(مرسلہ: سلمان عمرانی۔ سجاول)

گو کہ زبیدہ مجھ سے چار پانچ سال بڑی تھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دوسرا اچھی بات یہ ہے کہ زبیدہ بھی مجھے اچھی لگتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شرم و حیا کا پیکر اور باکردار تھی۔ پانچ وقت کی نمازی اور پرہیز گار تھی۔ روزانہ نماز فجر کے بعد باقاعدگی سے قرآنِ پاک کی تلاوت کرتی۔ اُس کے دونوں بچے مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ میری آمد پر بہت خوش ہوتے۔ مجھے ان پر ترس بھی آتا کہ یتیم ہیں۔ میں اُن سے پیار بھی کرتا تھا اور سب سے اہم بات وہ یہ کہ زبیدہ مجھے پسند کرتی تھی۔

ماں جی کی بات ہر لحاظ سے معقول تھی تو تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے ماں جی سے کہا کہ آپ کو سگی ماں کا درجہ دیا ہے تو، مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔'' جس پر ماں جی بہت خوش ہوئیں اور میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

بس پھر کیا تھا ایک مہینے کے بعد میرا نکاح زبیدہ سے ہوگیا۔ میں نے بھی اُسی مکان میں رہائش رکھ لی جس میں ماں جی اور زبیدہ رہ رہی تھیں۔ دو کمروں پر مشتمل مکان تھا۔ زبیدہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ اُس کے کہنے اور زور دینے پر میں نے بھی پانچ وقت کی نماز ادا کرنی شروع کردی۔ قریبی مسجد میں نماز عصر کے بعد مولوی صاحب سے قرآن پاک پڑھنا شروع کردیا۔

میں اپنی پوری تنخواہ اور دیگر الاؤنسز لا کر زبیدہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ جس سے وہ نہ صرف پورا گھر خوش اسلوبی سے چلا رہی تھی بلکہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرلیتی۔

☆......☆......☆

اسی طرح ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا اللہ پاک نے اپنی رحمت سے نوازا اور زبیدہ نے مجھے ایک پیاری سی بیٹی کا خوبصورت تحفہ دیا۔ میں پوری دلجمعی اور محنت سے ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر اللہ رب العزت کی مہربانی اور کرم سے ایف اے کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کرلیا۔ زبیدہ تو خوشی سے نہال تھی۔

اسی اثنا میں محکمہ ریلوے میں سینئر کلرک کی خالی آسامیوں میں بھرتی کا اشتہار آیا تو میں نے بھی اپلائی کردیا۔ ماں جی اور زبیدہ میری کامیابی کے لیے دن رات دعائیں مانگتیں۔ میں نے تحریری امتحان اور انٹرویو دیا تو اللہ کے فضل و کرم سے میرٹ پر میری سلیکشن بطور سینئر کلرک ہوگئی۔ جس روز میں اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر گھر آیا تو زبیدہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور مبارکباد دی۔ پھر ماں بیٹی نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ میری سینئر کلرک کی جاب دوسرے شہر میں لگی جہاں جا کر میں نے ڈیوٹی جوائن کرلی۔ اب میں ہفتے بعد گھر آتا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے سینئر کلرک کی پوسٹ پر کام کرتے ہوئے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ ایک ویک اینڈ پر گھر آیا تو ماں جی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ فوراً اُن کو لے کر اسپتال گیا جہاں اُن کو داخل کرلیا گیا اور علاج شروع ہوگیا۔ مگر دو دن کے بعد ماں جی اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ماں جی کی وفات کے بعد زبیدہ بالکل اکیلی ہوگئی تو میں نے کچھ دنوں کی چھٹی لے لی۔ پھر اپنی پوسٹنگ والے شہر آیا اور اپنے افسران سے ملا اُن کو اپنے حالات بتائے اور ریلوے کالونی میں کوارٹر کے لیے درخواست دے دی کیونکہ تنخواہ کم تھی اگر کوئی پرائیویٹ مکان کرائے پر لیتا تو اُس کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا جو کہ میں ادا نہیں کرسکتا تھا۔ پھر اللہ نے کرم کیا، افسران کی مہربانی سے میرے حالات کو بدنظر رکھتے ہوئے بطور اسپیشل کیس مجھے ریلوے کالونی میں ایک کوارٹر الاٹ کردیا گیا۔ میں اگلے روز ہی زبیدہ اور بچوں کے ساتھ سامان لے آیا اور کوارٹر میں رہائش رکھ لی۔ پھر ڈیوٹی کے ساتھ ایوننگ کوچنگ سینٹر میں بی اے کی تیاری جاری رکھی۔ اس بار بھی اللہ نے اپنے خاص فضل سے نوازا اور بی اے کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ اسی طرح ایم اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔

زبیدہ نے قدم قدم پر میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں ڈیوٹی سے گھر آتا تو دوپہر کا کھانا تیار ملتا۔ پھر میں کوچنگ سینٹر چلا جاتا۔ وہاں سے رات آٹھ بجے واپسی ہوتی اور جب رات پڑھنے بیٹھتا تو زبیدہ مجھے چائے بنا بنا کر پلاتی۔ اُس نے کبھی مجھے ڈسٹرب نہیں کیا۔ گھر کا سارا راشن وہ خود لے کر آتی۔ بچوں کو اسکول چھوڑ کر آتی پھر خود ہی اسکول سے لے کر آتی گھر کا سارا کام خود کرتی۔

وہ کہتی اشرف بس آپ توجہ سے اپنی پڑھائی کرو چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میں نے آرام اور سکون سے ایم اے کرلیا۔

☆......☆......☆

ماہ و سال گزرتے رہے۔ اللہ نے دو بچے اور عطا کردیے تھے تو اس طرح ہمارے پانچ بچے ہوگئے۔ میں نے محکمانہ پروموشن امتحان بھی پاس کرلیا تھا تو مجھے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی مل گئی تھی پھر اسی طرح میں نے مزید کچھ کورسز کیے اور محکمانہ امتحان دینے کا

سلسلہ جاری رکھا اور پھر وہ وقت آیا کہ پاک پروردگار کے لُطف و کرم اور اُس کی عطا سے میں گریڈ سترہ کا آفیسر بن گیا۔

اب مجھے آفیسرز کالونی میں بہت بڑا بنگلہ الاٹ کر دیا گیا تو اس طرح ہم کوٹھی میں شفٹ ہو گئے۔ سرکاری گاڑی بھی مل گئی۔

زبیدہ بہت خوش تھی۔ وہ ہر دم رب کا شکر بجالاتی اور سچ تو یہ ہے کہ آج میں جس مقام پر تھا وہ صرف زبیدہ کی وجہ سے ہی تھا۔ اگر زبیدہ مجھے مزید پڑھنے کا مشورہ نہ دیتی تو آج تک شاید میں نائب قاصد ہی ہوتا مگر زبیدہ کا اصرار اور لگن کے ساتھ ساتھ دعائیں کرنا اور ہر ممکن تعاون سے ہی مجھے یہ مقام مرتبہ ملا تھا۔

☆......☆......☆

ایک دن میں دفتر سے گھر آیا تو زبیدہ نے کہا کہ آج ایک بے سہارا عورت کسی کوٹھی میں کام کی تلاش کے لیے آئی تھی تو میں نے اُسے بتایا کہ ہماری کوٹھی میں تو سرکاری طور پر کام کرنے والے ملازمین ہیں۔ لہٰذا ہمیں کسی کام والی ماسی کی ضرورت نہیں ہے تو وہ رونے لگی اور خدا کے واسطے دینے لگی کہ مجھے کہیں رکھوا دیں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے تو میں نے اُسے شام کو بلایا ہے۔ آپ اُسے کسی کے ہاں گھر کے کام کاج کی ملازمت دلوا دیں۔ وہ بے چاری بہت دکھی اور مجبور ہے۔''

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے زبیدہ بیگم تمہارا حکم ہے تو میں کسی کے ذمے لگا دیتا ہوں اور جلد ہی کسی کوٹھی یا گھر میں اُسے کام پر لگوا دوں گا۔''

دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا تو عصر کی نماز کے وقت مجھے زبیدہ نے جگایا کہ نماز ادا کر لیں اور وہ بے سہارا عورت آئی ہے تو اُسے بھی مل لیں۔''

میں جب نماز ادا کر کے باہر لان میں آیا تو وہ عورت بیٹھی زبیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ جیسے ہی میں اُس کے قریب آیا تو اُسے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گیا اور حیران پریشان ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ وہ کوئی اور نہیں چچی سلطانہ تھی۔

اُسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں غصے اور نفرت کی لہر دوڑ گئی اور تیز تند لہجے میں کہا کہ کیا کوئی کسر رہ گئی تھی جواب پوری کرنے آئی ہو؟''

وہ حیرانگی اور پریشانی سے میرا منہ دیکھے جا رہی تھی تو زبیدہ نے مداخلت کی اور مجھ سے پوچھا کہ اشرف کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟''

''ہاں زبیدہ یہی وہ عورت ہے، چچی سلطانہ! جس کے ظلم و ستم میں سہتا رہا اور اِسی نے مجھے میرے چچا کے گھر سے مار مار کر نکالا تھا۔''

اب چچی سلطانہ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اور وہ رونے لگی اور مجھ سے معافیاں مانگنے لگی۔ تو میں نے کہا چچی چلی جاؤ اب مجھ میں اور سکت نہیں ہے تمہارے ظلم سہنے کی۔''

پھر میں نے طنزاً پوچھا کہ کدھر گئے تمہارے وہ لاڈلے شہزادے بیٹے جن کی وجہ سے تم مجھے روز مارتی تھیں، ذلیل کرتی تھیں اور پھر مجھے گھر سے ہی نکال دیا تھا۔'' تو چچی سلطانہ روتے اور سسکتے ہوئے بولی۔

''اشرف بیٹا اُن دونوں کی وجہ سے ہی تو میں آج در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ اُن دونوں کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہوں۔ ہاں اشرف میں تمہاری مجرم ہوں۔'' میں کچھ بولنے کے لیے منہ کھولنے ہی لگا تھا کہ زبیدہ نے التجائیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو میں چپ ہو گیا۔ پھر زبیدہ نے چچی سلطانہ کو پانی کا گلاس پلایا اور تسلی دی پھر پوچھا چچی آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا۔''

چچی سلطانہ تھوڑی دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے بتایا کہ جب اشرف کو گھر سے نکال دیا تو اُس کے دونوں بیٹے کھیتی باڑی کے بہانے کھیتوں پر جانے لگے اور بجائے کھیتی باڑی کے سارا سارا دن آوارہ گردی کرتے اور غلط دوستوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ بڑے بیٹے کو نشے کی لت پڑ گئی اور نشہ کرتے کرتے وہ مر گیا۔ دوسرا بیٹا بہت سارے غلط کاموں میں مشغول ہو گیا۔ پہلے تو وہ دوستوں کے ساتھ مل کر چوریاں کرنے لگا پھر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔ ایک دن ایک گھر میں ڈاکہ ڈالنے گیا تو اُن گھر والوں نے مزاحمت

کی تو اُس نے فائرنگ شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں ایک بندہ قتل ہو گیا دوسرا شدید زخمی ہوا۔ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی تو پولیس نے اُسے موقع واردات پر رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ اُس پر قتل ڈکیتی اور کئی مقدمے بنا دیے گئے۔ میں نے اُس کا مقدمہ لڑنے کے لیے زمین، بھینسیں اور گھر سب کچھ بیچ دیا مگر پھر بھی وہ بچ نہ سکا اور اُسے سزائے موت ہو گئی۔ اب میرے پاس نہ تو کوئی رہنے کا ٹھکانہ ہے اور نہ ہی کوئی اپنا، تو در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوں۔ بھیک مانگ کر گزارا کیا۔ اب کسی نے بتایا کہ شہر میں کوٹھیوں میں کام بھی مل جاتا ہے اور رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی تو اِسی آس پر کئی کوٹھیوں میں کام کے لیے گئی مگر جان پہچان اور ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے کہیں بھی کام نہیں ملا۔''

اتنا بتا کر چچی سلطانہ زار و قطار رونے لگی۔ تو زبیدہ نے اُٹھ کر چچی سلطانہ کو حوصلہ دیا کہ چچی آپ بالکل نہ گھبرائیں اشرف بھی تو آپ کا بیٹا ہی ہے۔''

چچی سلطانہ کی داستان سن کر میرے دل کو چوٹ لگی اور دُکھ ہوا۔ چچی سلطانہ کی حالت بہت خستہ تھی تو زبیدہ نے اُن کو ساتھ لیا اور جا کر اپنا ایک دُھلا اور استری کیا ہوا سوٹ نکال کر دیا کہ پہلے آپ واش روم میں نہا کر کپڑے تبدیل کر لیں۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔''

زبیدہ کچن میں چائے رکھ کر باہر لان میں آ گئی۔ جہاں میں گم صم بیٹھا تھا۔ زبیدہ میرے ساتھ بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

''اشرف میری بات سنیں۔'' تو میں نے کہا ہاں بولو تو وہ کہنے لگی پلیز اب آپ چچی سلطانہ سے کوئی سخت بات نہیں کریں گے۔ وہ بے چاری پہلے ہی لُٹی پٹی، دکھوں کی ماری بے سہارا ہیں۔ اچھوں کے ساتھ تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں، مگر انسانی عظمت تو یہ ہے کہ بُرے کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرو۔ ہماری شریعت اور مذہب بھی بڑوں کا ادب ایثار قربانی کا درس دیتا ہے۔ ہمارے پیارے آقا ﷺ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ جن لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے تو جواب میں انہوں نے اُن کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگیں اور فتح مکہ کے موقع پر سب کو معاف کر دیا۔ تو اشرف آپ بھی چچی سلطانہ کو معاف کر دیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر آپ غور کریں تو ایک لحاظ سے چچی سلطانہ آپ کی محسن ہیں۔''

''میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ وہ کس طرح......؟''

تو زبیدہ کہنے لگی کہ ذرا سوچیں اگر چچی سلطانہ آپ کو گھر سے نہ نکالتیں تو آپ آج تک گاؤں میں بھینسوں کا گوبر ہٹا رہے ہوتے۔ آپ کا شہر آنا اور پھر تعلیم حاصل کر کے بڑا افسر بن جانا اور میری خوش قسمتی یا میری کسی نیکی کا صلہ کہ آپ میرے خاوند ہیں۔ اللہ پاک نے ہم کو بہت نوازا ہے۔ ہماری اوقات سے بڑھ کر ہمیں اتنا کچھ دیا ہے۔ آپ سرکاری افسر ہیں۔ سرکاری کوٹھی، گاڑی، نوکر چاکر، عزت مقام، مرتبہ یہ سب اللہ کا کرم ہی تو ہے۔ آپ شہر نہ آتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

زبیدہ کی حقائق پر مبنی یہ باتیں میرے دل کو چھو گئیں تو شکرانے کے طور پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسی اثناء میں چچی سلطانہ نہا کر کپڑے بدل کر باہر لان میں آ گئیں۔ زبیدہ اُن کے لیے چائے اور لوازمات لے آئی تو میں نے آگے بڑھ کر چچی سلطانہ کے آگے اپنا سر جھکایا تو انہوں نے میرا سر چوم کر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر وہ مجھے اپنے گلے لگا کر رونے لگیں۔ تو میں نے چچی کو چپ کروایا اور کہا بس اب نہیں رونا۔ آپ اپنے بیٹے کے گھر آ گئی ہیں۔ آپ میری ماں ہیں اور یہ آپ کی بہو اور سب آپ کے پوتے پوتیاں ہیں۔''

تو اُس وقت چچی سلطانہ اپنے پوتے پوتیوں کو پیار کرنے لگیں اور اُن کی آنکھوں میں اب تشکر کے آنسو تھے جبکہ زبیدہ اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 8

صنوبر نے اپنے سامنے جسے دیکھا تھا۔ اسی کے لیے وہ اتنے دن سے اداس تھی۔ اسی اداسی کا کھوج سلمان لگانا چاہتا تھا اور اب تک نہیں لگا سکا تھا۔ وہ مارے خوشی کے جیسے چیخ ہی تو پڑی۔

''شرجیل تم......؟''

شرجیل نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے اشارے سے اسے اپنے ہونے کا یقین دلایا۔ کوئی اور موقع یا جگہ ہوتی تو وہ اسے گلے سے لگا کر اپنے ہونے کا احساس کراتا مگر یہ اس کا اسکول تھا اور یہاں اس قسم کی وارفتگی کو اگر کوئی دیکھ لیتا تو خوامخواہ بات کا بتنگڑ بن جاتا اس لیے شرجیل نے بھی اپنے جذبات پر قابو رکھا ہوا تھا۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ یہ تم ہو شرجیل کیا تم واقعی واپس آ چکے ہو؟''

صنوبر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے حقیقت کیسے مان لیتی اس نے شرجیل کو سوتے جاگتے خوابوں میں کتنی ہی بار اپنے قریب اور اپنے سامنے دیکھا تھا اور جب وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتی تو اسے پتا چلتا تھا کہ یہ سب اس کا وہم اور اس کے خواب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شرجیل نے اسے یقین دلانے کے لیے کہا۔

''لو یہ میں ہی ہوں صنوبر۔ میں لوٹ آیا ہوں۔ صبح کی فلائٹ سے میری واپسی ہوئی ہے۔ جتنی دیر بھی گھر پر رہا تم سے ملنے کی بے قراری کی وجہ سے نہ تو تھکن کا احساس ہوا اور نہ ہی مجھے نیند آئی۔ صبح ہوتے ہی میں یہاں آ پہنچا۔ دیکھ لو اب تمہارے سامنے ہوں۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا سارا اسکول چھان مارا تب سوچا تم یہاں ہو گی کیونکہ مجھے یقین تھا تم میرے وجہ سے اداس ہو گی۔ خود کو اکیلا محسوس کر رہی ہو گی۔ اور میں جانتا ہوں تم جب بھی ایسا محسوس کرتی ہو یہاں اس ویرانے میں چلی آتی ہو۔ میں نے کتنی ہی بار تمہیں اس ویرانے میں بیٹھے دیکھا ہے۔''

ایسا لگتا تھا جیسے دونوں طرف جذبات کا بہاؤ بلا خیز اور طوفان کی لہروں کی طرح تند و تیز تھا۔

''اچھا ٹھہرو مجھے یقین کر لینے دو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیشہ کی طرح یہ کوئی سپنا نہ ہو اور میں حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹوں تو تم ہمیشہ کی طرح غائب نہ ہو جاؤ۔''



یہ کہہ کر صنوبر نے دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس وقت اس کے حلق سے پھر ایک چیخ بلند ہوئی جب اس نے شرجیل کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو وہ خون کی گرمی اور حدت سے تپ رہا تھا۔ وہ اسی کا ہاتھ تھا گوشت پوست کا نرم و ملائم ہاتھ۔ جس کی انگلیوں میں وہ ہی فسوں خیز احساس ہلکورے لے رہا تھا جو کسی بھی باکمال مصور کے جوش جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔

شرجیل بہت ہی غیر معمولی حسن کا مالک تھا۔ اس کے والد آصف کریم سے بھی زیادہ حسین اور خوبصورت۔ اس کی نشے کے پانیوں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں اب بھی وہ ہی مخموریت تھی۔ اتنے مہینوں بعد وہ اسے ملا تھا لیکن اس کا چہرہ اسی معصومیت اور ملاحت کا نظارہ پیش کر رہا تھا جو فرشتوں کو شرمایا کرتا تھا۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے کی بے چین اور ہجرتوں کے خمار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر صنوبر نے ہی اس جادواں سکوت کو توڑا۔

''مجھے یقین آچکا ہے یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ تم واقعی میرے سامنے موجود ہو۔ جیتے جاگتے میرے اپنے شرجیل کی طرح۔ مجھے اس غیر متوقع خوشی کے ملنے پر بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہو۔ مگر میں اپنے حواسوں میں ہوں تو اس کی بس ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے شرجیل میں نے تمہیں اپنے خوابوں اور خیالوں میں اتنی بار دیکھا ہے کہ شاید اب تک بھی مجھے پوری طرح یقین نہیں آرہا کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو اور یہ تم ہی ہو۔ میرے اپنے شرجیل! میری محبت' میرے ہونے کی گواہی، میرے وجود کا مقصد''

صنوبر کی بے قراری نے شرجیل کو جیسے بے خود کر دیا اور اس نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں حقیقت میں لوٹ آیا ہوں اپنی صنوبر کے پاس''

صنوبر کے چہرے کا رنگ یکا یک ایک نامعلوم احساس کی وجہ سے تبدیل ہونا شروع ہوا اور اس کی آنکھوں میں اداسی کے رنگ ڈولنے لگے۔

''تم آگئے ہو مجھے یقین آچکا ہے لیکن کیا یہ آنا ایسا تو نہیں کہ پل بھر کی خوشی ہو اور تم پھر مجھے اسی جدائی اور اسی رنج و الم کی دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ۔ جیسے پہلے چلے گئے تھے۔ تم نے پلٹ کر کبھی میری خبر تک نہیں لی۔ ایک فون تک نہیں کیا۔ تمہیں میری ذرا سی بھی یاد نہیں آئی۔ کیا تم نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارے اس طرح چلے جانے سے میرے دل پر کیا گزرے گی۔ میں زندہ ہوں تو صرف اس لیے کہ میں تمہارا انتظار کرنا چاہتی تھی جاننا چاہتی تھی کہ تم اس طرح بنا کچھ بھی بتائے مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ اپنے دل سے مجبور ہو کر میں تمہارے گھر بھی گئی تھی مگر وہاں سے صرف اتنا پتا چل سکا کہ تم اب یہاں نہیں رہتے' ہمیشہ کے لیے یہ ملک اور یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے تمہارے گھر کے چوکیدار کو بھی تمہارے بارے میں بتانے سے منع کیا گیا تھا یا واقعی اسے تمہارے متعلق کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے اس سے بہت پوچھا۔ میرے بار بار وہاں جانے اور میری بے قراری کو محسوس کرنے کے بعد کئی دنوں کے بعد اس نے صرف اتنا بتایا کہ تم پڑھنے کے لیے امریکا چلے گئے ہو۔ وہ ڈر رہا تھا۔ کہتا تھا یہ بات کہ اس نے مجھے تمہارے امریکا جانے کے بارے میں بتایا ہے میں کسی کو نہ بتاؤں کیونکہ اسے تمہارے بارے بتانے سے منع کیا گیا تھا۔ اس کی نوکری چھین لینے کی دھمکی دی گئی تھی۔''

کچھ دیر کو وہ رکی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا خاموش سیلاب آچکا تھا۔ اس کے نرم اور چمکتے ہوئے رخسار آنسوؤں کی لکیروں سے بھیگنے لگے تو شرجیل جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مت رو صنوبر پلیز مت رو۔'' وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم روتی ہو تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے' یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے جس چیز نے تمہارا دل دکھایا ہے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا

ڈالوں۔ اس وقت میرا دل یہ چاہ رہا ہے کہ میں خود کو سزا دوں، اپنے آپ کو مٹا دوں کیونکہ یہ آنسو میری ہی وجہ سے تمہاری آنکھوں سے بہہ جانا چاہتے ہیں۔ یہ میں ہی ہوں جس نے تمہیں اتنا دکھ دیا ہے کہ میں خود کو چاہوں بھی تو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے شرجیل کی آنکھیں بھی بھیگ سی گئیں۔ صنوبر نے جیسے ہی یہ محسوس کیا کہ شرجیل خود کو سزا دے سکتا ہے تو اس کے آنسو خود بخود رک گئے اور اس نے اپنی ہتھیلی سے انہیں صاف کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔



''نہیں.. نہیں شرجیل ایسا مت سوچو میں تو بس یونہی....'' اس سے آگے وہ کچھ اور نہیں کہہ سکی اور پھر ساری حدود کو توڑتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ شرجیل کو اسے سینے سے لگا کر کس قدر مسرت انگیز احساس ہوا یہ لفظوں میں بیان کر دینے کی صلاحیت دنیا کے کسی داستان گو میں نہیں ہو سکتی تھی۔

''میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ وہ سب جس کی وجہ سے میں تمہیں دکھ دینے پر مجبور ہوا۔ میں کتنا بے بس تھا یہ میں تمہیں اپنا سینا چیر کے دکھاؤں تب ہی تم میری محرومی اور میری بے بسی کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ مجھے پتا ہے میرے فراق میں میری جدائی میں تم کتنا روئی ہو کتنا تڑپی ہو۔ تڑپا میں بھی ہوں۔ رویا میں بھی ہوں لیکن اس وقت اگر میں تمہیں اپنے دکھ کے بارے میں ایک لفظ بھی بتا دیتا تو تم دہرے غموں کی آگ میں جلنے لگتیں اس لیے میں نے تمہیں اب دکھوں سے ان عذابوں سے بچانے کے لیے خود کو تم سے دور کر لیا تھا۔'' وہ رکا اور پھر بولا۔

''اب تو میں آ گیا ہوں۔ اس خوشگوار لمحے کو ہمیں یوں رو دھو کر اپنے لیے بار نہیں بنانا چاہیے۔ بس اب ہنس دو... جیسے ہی ہم پھر ملیں گے تو میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا کہ کیوں مجھے تم سے دور جانا پڑا تھا اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

''میں بہت بے قرار ہوں یہ جاننے کے لیے تم جس پر مجھے اپنے خدا کی طرح یقین تھا وہ مجھے اس طرح اکیلے چھوڑ کر کیسے چلا گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ مجھے کچھ بتایا تک نہیں۔ کوئی تسلی کوئی دلاسا کوئی اطلاع تک نہیں دی۔ لیکن میں جانتی ہوں میرا شرجیل بے وفا نہیں ہے۔ اسی لیے میں تمہارا انتظار کرتی رہی اور خدا نے میری سچائی میرے یقین کی لاج رکھ لی اور تم لوٹ آئے۔''

اس سے پہلے کہ شرجیل کچھ اور کہتا سامنے سے صنوبر کی دو کلاس میٹ آتی ہوئی نظر آئیں۔ صنوبر نے جلدی سے اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور ان کی باتوں ان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

''ارے صنوبر تم یہاں بیٹھی ہو اور ہم سمجھے تم آج اسکول ہی نہیں آئیں۔ کلاس میں کیوں نہیں آئیں میڈم تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔'' یہ نیلوفر تھی صنوبر کی کلاس میٹ اس سے پہلے کہ صنوبر کوئی جواب دیتی۔ اس کی دوسری کلاس میٹ فاطمہ کی نظر شرجیل پر پڑی اور وہ ایک دم ہی چونکتے ہوئے بولی۔

''ارے یہ تو شرجیل ہے... شرجیل تم تو اسکول چھوڑ کر امریکا چلے گئے تھے۔ ہم نے تو سنا تھا تم اب کبھی واپس نہیں آؤ گے۔ کم سے کم میڈم سلطانہ نے تو ہمیں یہی بتایا تھا۔'' فاطمہ نے جلدی جلدی بولنے کی عادت کی وجہ سے ایک ہی سانس میں کئی باتیں کر ڈالیں۔

''بتاتا ہوں... بتاتا ہوں تھوڑا سانس تو لے لو...'' شرجیل نے دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور وہ دونوں وہیں سامنے کی بینچ پر ان کے مقابل بیٹھ گئیں۔ فاطمہ ببل گم چبا رہی تھی اور نیلوفر کے منہ میں کوئی ٹافی تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد اکثر لڑکیاں سب سے پہلے اسی طرح کی چیزیں کھانے میں جت جاتی ہیں کیونکہ کلاس میں کچھ بھی کھانے کی پرمیشن نہیں دی جاتی۔

''اب کچھ بولو گے یا یونہی خاموش بیٹھے رہو گے'' نیلوفر کو شرجیل کی خاموشی سے الجھن سی ہونے لگی۔ صنوبر سر نیچے کیے شرجیل کی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اصل میں میرے والد نے میڈم اکبر کو فون کر کے اس طرح کی بات کی ہوگی۔ ورنہ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا'' شرجیل کی بات سن کر ان دونوں لڑکیوں سے زیادہ صنوبر حیران ہوئی تھی۔

''تمہارے والد نے ایسا کیوں کیا شرجیل۔ کیا انہیں تمہارا یہاں پڑھنا پسند نہیں ہے؟'' فاطمہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بس ایسا ہی سمجھ لو۔ کوئی بھی شہر کا بڑا بزنس مین خاندان اپنے بیٹے کو پینٹر بنانا نہیں چاہتا۔ یہ تو میں صنوبر کی وجہ سے......'' بولتے بولتے وہ رکا اسے احساس ہو گیا کہ اگر اس نے یہ بات کہہ دی کہ وہ صنوبر کی وجہ سے اس پینٹنگ

اسکول میں داخل ہوا تھا تو سارے اسکول میں یہ بات کسی اسکینڈل کی طرح پھیل جائے گی۔
''صنوبر کی وجہ سے کیا... تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟'' فاطمہ نے اپنے تجسس کو اور ہوا دی۔
''نہیں... میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ صنوبر کی مصوری نے مجھے اتنا ایمپریس کیا کہ میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ میں بھی مصور بنوں گا۔ میرے پاپا کو یہ بات شروع سے ہی پسند نہیں تھی لیکن میری ضد کی وجہ سے وہ خاموش تھے۔ پھر انھیں ایک نئی سوجھی...''
''سوجھی....'' نیلوفر نے جیسے تصدیق چاہی کہ وہ یہ بول رہا ہے۔
''ہاں ہاں سوجھی... کہ مجھے یہاں کے بجائے امریکا میں جا کے پڑھنا چاہیے۔ اب میں نے یہاں داخلہ لیا ہوا تھا اور کتنا ہی کچھ یہاں پڑھ چکا تھا' سیکھ چکا تھا تو میں امریکا جانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ میرا ٹکٹ لے کر آگئے اور انھوں نے حکم سنا دیا کہ مجھے اپنے اسکول والوں کو یہ بات بتا دینی چاہیے کہ میں اب یہاں نہیں بلکہ امریکا میں جا کے پڑھنے والا ہوں اس لیے وہ میرا ایڈمیشن کینسل کردیں۔ مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ میں امریکا جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی یہ بات نہیں مانی اور انھوں نے خود ہی میڈم سلطانہ کو فون کر کے یہ بات بتا دی۔'' دونوں لڑکیاں محویت سے اس کی باتیں سن رہی تھیں صنوبر پوری بات سن کر سوچنے لگی تو یہ بات تھی جو شرجیل کو امریکا جانا پڑا لیکن وہ یہ ساری بات مجھے فون پر کم سے کم یہاں نہیں تو امریکا پہنچ کے بتا سکتا تھا۔
''یوں کہو کہ اب تم واپس اپنی پرانی پوزیشن پر واپس آگئے ہو'' نیلوفر نے ایسے کہا جیسے وہ اسے چھیڑ رہی ہو۔
''ویسے بائی دا وے امریکا پہنچ ہی گئے تھے تو پھر داخلہ بھی لے ہی لیتے''
''اب تم کہو گی وہیں پڑھ بھی لیتے'' صنوبر اپنے آپ میں واپس لوٹ آئی تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اگر اس نے مداخلت نہیں کی تو یہ دونوں آفت کی پڑیا ئیں اس کے شرجیل کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہیں۔ ویسے بھی کچھ لڑکیوں کو بال کی کھال نکالنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔
''ہاں تو اور کیا' ارے یار! جسے بھی امریکا میں پڑھنے کا موقع ملے اسے یہ موقع گنوانا نہیں چاہیے۔'' نیلوفر اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
''اور میں یہ کہوں گی کہ امریکا ہو یا پاکستان ہر ایک کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی اور اختیار ملنا چاہیے۔ پتا نہیں کیوں ان لوگوں کو باہر جا کے پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہوتا ہے جو ایسا کر نہیں سکتے۔''
صنوبر کی بات کو فاطمہ نے یہ کہہ کر پورا کیا۔
''تمہارا مطلب ہے نیلوفر چونکہ امریکا جا کے پڑھ نہیں سکتی اس لیے وہ شرجیل کو یہ مشورہ دے رہی ہے کہ اسے وہاں جا کے پڑھنا چاہیے تھا۔''
''میرا ایگزیکٹ یہ مطلب نہیں تھا' میں جانتی ہوں لڑکیوں کے خاندان میں اگر امریکا میں پڑھانے کی صلاحیت ہو تب بھی ہماری سوسائٹی میں لڑکی کو اتنی آسانی سے باہر جا کے پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی۔''
''ٹھیک کہہ رہی ہو تم صنوبر... اینی وے... اس ٹاپک کو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں'' نیلوفر نے نرمی اور بے نیازی سے کہا۔
''ہاں ہاں کوئی اور بات کرتے ہیں مگر شرجیل یہ تو بتاؤ کیا میڈم سلطانہ تمہیں پھر سے داخلہ دے دیں گی'' فاطمہ کو لگا کہ اب بھی بات مکمل تو نہیں ہوئی ہے۔
''مجھے یقین ہے وہ مجھے پھر سے کلاس میں بیٹھنے کی پرمیشن دے دیں گی'' شرجیل نے اعتماد سے کہا۔
''تم کیا گئے بے چاری صنوبر تو ایسی ہوگئی جیسے زندگی سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہو۔ نہ کسی سے بولنا' نہ کسی کے ساتھ کوئی موج مستی کرنا۔ سچ پوچھو تو تمہاری غیر موجودگی نے اس راز پر سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ تم دونوں ایک

دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہو۔ آئی مین اِن لو ہو''
فاطمہ نے کہا تو صنوبر کو اس کی بے باکی پر تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔
''یہ سچ ہے ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں'' شرجیل نے صنوبر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔
''ارے واؤ Congratulations بھئی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' دونوں لڑکیوں نے پھر سے انہیں مبارک باد دیتے ہوئے ہاتھ ملایا اور پھر چاروں اسکول کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔

☆......☆......☆

سلمان کی ماں نے بیٹے کے منہ سے اس کے عشق کی بات سنی تو اس کے سارے وجود میں ایک ایسی خوف کی لہر تیرنے لگی جس نے اس پر سکتہ سا طاری کر دیا۔ وہ ایک دم ہی خاموش ہوگئی اور سلمان اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے اندر کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔
''دیکھا میں نا کہتا تھا آپ کو میری بات سن کر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔'' سلمان کی بات سن کر وہ ایک لمحے کو چونکی اور پھر بولی۔
''میرے بچے جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسے سمجھ نہیں رہے۔ کسی بھی جن ذات کا کسی انسان سے محبت کرنا یا عشق کرنا اتنا بڑا طوفان اٹھا سکتا ہے جس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ایسا تو وہ شیطان کے چیلے جنات کرتے ہیں جنھیں مجلس اور قبیلے سے نکال دیا جاتا ہے۔ راندہ درگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اور انہیں پھر ساری زندگی جن جاتی میں داخل نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور تم ایسی ہی بات کر رہے ہو۔ میرے بیٹے۔'' خوف اور ڈر سے لرزتی ہوئی آواز میں سلمان کی ماں نے اس سے کہا۔
''نہیں ماں آپ میری بات کو غلط سمجھ رہی ہیں''
''غلط یا صحیح میں اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ کوئی بھی ایسی بات جو کسی جن زادے کو انسانوں سے محبت کرنے یا ان کے ساتھ رہنے کے بارے میں ہو وہ کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہوسکتی۔ میرے بچے تم بھی یہ سمجھ لو یہ بات کسی بھی انداز میں کہی جائے نہ تو اسے درست مانا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی بھی جن زادہ اس کی حمایت میں ایک بھی لفظ بول سکتا ہے۔ مجھے جلدی سے یہ بتاؤ یہ بات تم نے کسی اور سے تو نہیں کہی۔'' سلمان کی ماں کی فکر و پریشانی اس کے لہجے اور اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
''ابھی تو نہیں کہی مگر یہ بات ایک نہ ایک دن سب کو پتا چل ہی جانی ہے۔'' سلمان نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ماں کو اس کے لہجے اور رویے میں ایسی بو محسوس ہوئی جس نے اس کی ساری سوچوں کو پسپا کر دیا۔
''تو کیا تم اپنے اس ارادے سے باز نہیں آؤ گے؟'' اس نے ٹھہر ٹھہر کہا۔
''نہیں'' سلمان کا لہجہ اس قدر حتمی اور غیر معمولی تھا کہ اس کی ماں کو لگا موت کا فرشتہ اس کی گردن دبوچنے آ پہنچا ہے اور اب بے وقت کی موت اس کے خاندان کا مقدر بن چکی ہے۔
''کیا اپنی ماں کے لیے بھی تم اپنے ارادے سے باز نہیں آسکتے۔'' ایک آخری کوشش کے طور پر اس کی ماں نے اس احساس کا امتحان لینا چاہا۔ جو ایک بیٹے اور ماں کے رشتے کو مکمل کرتا ہے۔
''آپ کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں ماں۔ مگر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے میرے ارادے سے روکا اور مجھے میری صنوبر سے جدا کرنے کی کوئی بھی شرط رکھی یا میرا امتحان لیا تو میں آپ کی بات کا پاس رکھ لوں گا۔ آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا لیکن جس دن مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ مجھے میری صنوبر سے اب کبھی ملنے نہیں دیا جائے گا' اس دن میری سانس خود بخود چلنا بند ہو جائے گی۔ میں خاموشی اور بے بسی کی موت مر جاؤں گا'' سلمان نے بھی دھیمے اور رکے رکے انداز میں اپنی بات ختم کی۔ جیسے وہ

بولنے سے پہلے اپنے ایک ایک لفظ کو تول رہا ہو۔

''میرے بچے... یہ تم مجھے.. اپنی ماں کو کس امتحان میں ڈال رہے ہو۔ میں تمہارا ساتھ دوں یا نہ دوں دونوں ہی صورتوں میں میرے خاندان کی تباہی میرا مقدر ہے تمہاری باتوں سے میں یہی اندازہ لگا سکی ہوں''

''ایسا نہیں ہوگا۔ ماں اگر آپ اور بابا میرے ساتھ وہاں انسانوں کی دنیا میں چل کر رہیں'' سلمان نے ماں کو تسلی دینے اور اپنی دانست میں ایک محفوظ راستا سجھانے کی کوشش کی۔

''جیساتم سمجھ رہے ہو کاش یہ سب اتنا ہی آسان ہوتا میرے بچے۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ مگر میں جانتی ہوں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں'' یہ کہہ کر وہ بے بسی سے رونے لگی سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اپنی ماں کو کن الفاظ میں تشفی دے اور اسے کیسے بتائے کہ اسے عشق کا ڈنک ڈس چکا ہے۔ اب اس کی موت بھی شاید اسے اس عشق کے زہر سے نجات نہیں دلا سکے گی۔ وہ اپنی زندگی اپنے عشق کی راہ میں تیاگ دینا چاہتا ہے۔ وہ مرجانا چاہتا ہے لیکن صرف اور صرف اپنے عشق کے لیے۔

دیر تک سلمان کی ماں کی سسکیاں غار کی خموشی اور ہیبت زدہ ماحول میں گونجتی رہیں۔

☆......☆......☆

شرجیل اور صنوبر کی محبت کو تقریباً تین سال بیت چکے تھے۔ ان تین سالوں میں شرجیل کے اور صنوبر کے گھر والوں کو ان کی محبت کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں تھیں۔ بلکہ صنوبر کے گھر میں جس قسم کا ماحول اور آپسی رویے موجود تھے ان کی وجہ سے کوئی یہ نہیں جان سکا کہ صنوبر کے دل میں شرجیل کی محبت نے کیسے کیسے محبت کے تاج محل کھڑے کر دیے ہیں جن کی آغوش میں صنوبر کے دن رات گزرتے ہیں۔

پھر جب شرجیل اسے چھوڑ کر امریکا چلا گیا تو صنوبر کے دل کو جیسے پکڑ کے کسی نے نچوڑ دیا ہو۔ وہ انگاروں پہ لوٹتی رہی۔ رات رات بھر ٹیرس پر بیٹھی شرجیل کی محبت اور اس کے اس طرح چھوڑ کے چلے جانے کا سوگ مناتی رہی۔ اس کے دل میں ہزاروں سوال جنم لیتے اور صبح ہونے تک ایک ایک کر کے سارے سوالات موت کی نیند سو جاتے لیکن صنوبر کا یہ دکھ نہ ہی اس کی ماں کو معلوم ہوا اور نہ ہی گھر میں موجود کسی دوسرے فرد نے ایسا کچھ محسوس کیا کہ اب صنوبر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ ٹھیک سے کھاتی ہے اور نہ پیتی ہے حتیٰ کہ اس کے دن رات کا چین اس کی نیندیں سب حرام ہو چکی ہیں۔

ایک جن زادے نے اس کا دکھ کہیں ہزاروں میل سے آ کر محسوس بھی کیا اور اسے دکھ سے کرلاتے دیکھا بھی۔ وہ اس کے اس انجان دکھ اور سوگوار حسن کے اندر سے اٹھتے سوالوں کے بارے میں پہروں سوچ چکا تھا لیکن صنوبر کے رنج والم میں ڈوبے سراپے کا بھید اس پر بھی نہیں کھل سکا تھا۔ تاہم وہ کم سے کم یہ جانتا تو تھا کہ صنوبر کسی نامعلوم دکھ کے زیر اثر اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔ لیکن صنوبر سے جڑے ہوئے اس گھر کے مکین یہ بات نہیں جان سکے کہ صنوبر کس آگ میں جلا کرتی ہے۔ اسی اثنا میں وہ سارے واقعات ہوئے اور جن زادہ سلمان صنوبر کے عشق میں بلا بن کر اس گھر میں رہنے لگا۔ بعدازاں وہ اس کے جسم میں بھی حلول کر چکا تھا جس کی وجہ سے صنوبر پر دورے پڑا کرتے تھے اور انھی دوروں کی وجہ سے صنوبر کے گھر کی ملازمہ سلمٰی نے اس پر کسی غیر مرئی قوت کے اثر میں چلے جانے کے بارے میں رائے زنی کی تھی اور وہ اس کے بعد سے غائب ہو گئی تھی۔

جن زادے سلمان کو مجبوری میں اپنے گھر جانا پڑا اور ادھر صنوبر کا محبوب اس کا شرجیل واپس آ گیا۔ صنوبر کے گھر کا ماحول بدل چکا ہے اور اب احساس اور آپسی انسانی رشتوں میں معدوم ہوتی حرارت واپس آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صنوبر اندر کے بے پایاں احساس انبساط کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کے خواہ مخواہ مسکرانے، گنگنانے کے انداز کو اس کی ماں نے پہلے کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کیا لیکن وہ اپنی بیٹی کی

محبت کے احساس سے ابھی نئی نئی واقف ہوئی تھی اس لیے اس نے جو صنوبر کو یوں بے وجہ ہنستے، مسکراتے اور گنگناتے دیکھا تو اسے لگا اس کی بیٹی پھر سے اسی آسیب زدگی کا شکار ہو رہی ہے جس نے اسے اس کے شوہر اور بیٹے سلمان اور گھر کے سب لوگوں کو پریشان کر دیا تھا۔

گھر کی نوکرانی سلمٰی نے اسے کسی جن کے سائے سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن وہ ایسا سوچنے کے باوجود بیٹی سے ایسا کچھ پوچھنے کی ہمت جتا نہیں پائی کہ اسے اپنے اس سوال کا جواب مل سکتا کہ صنوبر کو اب کیا ہوا ہے۔ یقیناً صنوبر کا رویہ اس پہلے رویے سے مختلف تھا اور وہ پہلے کی طرح بدحواسی سے ایسی حرکتیں نہیں کر رہی تھی جس نے ان سب کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر بھی صنوبر کا یہ رویہ اس کے اس رویے سے مختلف تھا جو اس کی طبیعت کی بحالی کے بعد درشہوار نے دیکھا تھا۔ وہ کبھی اس طرح بات بے بات نہ ہی اس طرح مسکراتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اسے گنگناتے دیکھا گیا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا لیکن درشہوار کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تاہم اسے صنوبر پوری طرح ٹھیک نہیں معلوم ہوئی۔ دیر تک وہ صنوبر کی کیفیت اور اس کی حرکات وسکنات کو بغور دیکھتی رہی پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

''کیا بات ہے صنوبر تم آج بہت خوش ہو۔ ایسا کیا مل گیا ہے جس نے تمہیں پہلے کے سب ہی دنوں سے زیادہ مسرور کر دیا ہے؟'' درشہوار نے سنبھل سنبھل کر اس سے پوچھا اور اس کے فوراً بعد وہ کچن میں برتنوں کو ترتیب سے رکھنے میں جت گئی جیسے وہ یہ تاثر دینا چاہتی ہو کہ یہ کوئی غیر معمولی سوال نہیں ہے بلکہ ہر روز ہونے والی گفتگو کا کوئی سلسلہ ہے۔

''یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی کہ مجھے کیا ملا ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ یہ سب کام کیوں کر رہی ہیں۔ کیا سلمٰی نے آج پھر چھٹی کی ہے؟'' صنوبر نے اپنی ماں کو وہ کام کرتے دیکھا جو وہ کبھی نہیں کیا کرتی تھیں۔ سلمٰی چھٹی پر ہوتی تب بھی یہ کام کوئی دوسرا نوکر کرتا تھا۔ پر آج درشہوار خود کچن میں نوکروں والے کام کر رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ جھنجلا بھی نہیں رہی تھی' نوکروں کو برا بھلا بھی نہیں کہہ رہی تھی بلکہ کافی مطمئن نظر آتی تھی۔

''تم نے اسے ڈرا دیا تھا! نا تو وہ اس دن کے بعد سے کام پر آئی ہی نہیں'' درشہوار نے اسے یونہی آزمانے کی کوشش کی ورنہ سلمٰی تو کب کی واپس آ چکی تھی۔

''میں نے ڈرا دیا تھا میں کچھ بھی نہیں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما'' صنوبر کو واقعی یاد نہیں تھا کہ جب سلمٰی نے اس پر جنات کے اثر ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا تو ہوش میں آنے کے بعد صنوبر کو یہ بات کس قدر بری اور ناقابل برداشت معلوم ہوئی تھی۔ صنوبر کے غصے سے ڈر کر ہی سلمٰی نے اس کی موجودگی میں ہی نہیں بلکہ کام پہ آنا ہی ترک کر دیا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا.... تم تو جانتی ہو ان لوگوں کو یہ کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی جنات اور بھوت پریت سے جوڑ دیتے ہیں تمہاری طبیعت کچھ خراب ہوئی تو سلمٰی نے اسے بھی یہی سمجھا تھا۔'' درشہوار نے کوشش کی کہ صنوبر اس بات کو کوئی ایسی سنجیدگی سے محسوس نہ کرے۔ جیسا کہ وہ بات تھی۔ خود درشہوار کو بھی صنوبر کی بیماری کی طوالت اور اس کی عجیب وغریب حرکتوں کو دیکھنے کے بعد سلمٰی کی باتوں کا یقین آ چکا تھا اگر ایک دن اور صنوبر اسی طرح کی کیفیت میں رہتی تو یقیناً درشہوار اسے سلمٰی کے بتائے ہوئے پیر صاحب کے پاس لے جاتی۔ پر سلمان کی ذہانت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا اور اس نے فی الفور صنوبر کے جسم سے نکل کر اسے آزاد کر دیا جس کے بعد صنوبر فوری طور پر نارمل ہو گئی تھی۔

صنوبر نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بولی۔

''اچھا وہ بات..... چلیے لائیں مجھے اس کا نمبر دیں میں خود اسے فون کر کے بلاتی ہوں۔ ویسے بھی سلمٰی اس گھر

کی بہت پرانی اور وفادار ملازمہ ہے۔'' صنوبر کی یہ بات سن کر درشہوار کو یقین ہونے لگا کہ اس کی بیٹی پر اب کوئی سایا نہیں ہے اور وہ واقعی کسی بات سے خوش ہے۔

''ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ سلمیٰ تو کب کی اپنے کام پر واپس آ چکی ہے۔ آج اسے کوئی کام تھا وہ کچھ دیر بعد آ جائے گی'' درشہوار کی بات سن کر صنوبر نے مسکرا کر ماں کے گلے میں بازو ڈال دیے....

''آپ اچھی لگ رہی ہیں ماما بہت اچھی۔''

☆......☆......☆

کھانے اور برتنوں سے فارغ ہو کر۔ کچن کے جملہ امور نمٹانے کے بعد درشہوار صنوبر کے کمرے میں آئی تو خلاف معمول وہ جاگ رہی تھی۔

''اچھا ہوا تم جاگ رہی ہو۔ نہیں تو میں اور کچھ دیر تک بے چین رہتی'' درشہوار اس کے قریب صوفے پر ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ارے ماما ایسی بھی کیا بے چینی۔ میں خود آپ کو بتانے والی ہوں کہ میں کیوں خوش ہوں'' صنوبر جو اپنے پینٹنگ کے میگزین دیکھ رہی تھی انھیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو پھر جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے میری بیٹی کو میں نے پہلے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا؟'' درشہوار سے اور انتظار نہیں ہو رہا تھا۔

''خوش تو میں پہلے بھی ہوتی تھی مگر آج بہت خوش ہوں۔'' درشہوار نے محسوس کر لیا کہ صنوبر ضرور ماضی کے رویوں کو ذکر کرنے والی ہے۔ جب اس گھر کے کسی بھی ممبر کو کسی دوسرے کی خوشی اور غمی کی کوئی خبر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''شرجیل واپس آ گیا ہے؟'' صنوبر نے دھیمی آواز میں فطری طور پر شرماتے ہوئے کہا۔

''شرجیل....؟ کون شرجیل...بیٹا؟'' درشہوار کی بے چینی سوا ہونے لگی۔

''میں اس سے محبت کرتی ہوں ماما'' صنوبر کو صاف صاف کہنا ہی پڑا۔

''اوہ.... مائی گوڈ.... تم کسی سے محبت کرتی ہو اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی'' درشہوار اوسط درجے کی ماؤں کی طرح تو تھی نہیں جو اس بات پر بیٹی کو الٹی سیدھی سناتی۔ اسے تو یہ سن کر کہیں زیادہ خوشی ہوئی کہ اس کی بیٹی نے اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا تھا۔

صنوبر نے اپنی اور شرجیل کی محبت کی پوری داستان شروع سے آخیر تک سنائی درشہوار بڑی دلچسپی اور محویت سے سنتی رہی بیٹی کو اس نے کئی بار گلے بھی لگایا کہ اسے اپنی بیٹی کی خوشی میں خوش ہونا اچھا لگ رہا تھا۔ ساری بات ختم ہوگئی تو اس کا چہرہ دھیرے دھیرے بجھنے لگا اور اب وہاں کافی تشویش جمع ہو چکی تھی۔

''کیا بات ہے ماما آپ میری بات سن کر کچھ پریشان ہوگئی ہیں؟'' صنوبر نے ماں کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''بات ہے تو پریشانی کی۔ وہ لڑکا اگر تمہیں پسند کرتا ہے، تم سے محبت کرتا ہے تو اسے تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا! وہ بھی بغیر کچھ کہے۔ ایک ایسے لڑکے پر تم پھر سے اعتبار کر رہی ہو۔ کہیں یہ فیصلہ غلط نہ ہو بیٹا!'' درشہوار کی تشویش بھری بات سن کر صنوبر بھی سوچ میں پڑ گئی اور اس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے جو خوشی اور مسرت کے پھول کھل رہے تھے۔ وہ مرجھانے لگے۔

''دیکھو بیٹا میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہاری ماں ہوں اور تمہارا نقصان ہو یہ میں کبھی نہیں چاہوں گی۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ اب تمہیں اس کے معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تم نے کہا کہ وہ تمہیں بتانے والا ہے کہ وہ کیوں تمہیں اس طرح بنا بتائے چلا گیا تھا۔ پہلے اس کی پوری بات سن لو پھر اسے مجھ سے ملوانا میں اس سے مل کر جاننا چاہتی ہوں کہ وہ تمہارے لائق ہے بھی یا نہیں۔'' درشہوار نے بیٹی کی

پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

صنوبر "جی اچھا" سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ اب درشہوار کے لیے یہ مشکل کھڑی ہو چکی تھی کہ بیٹی کے دل میں وسوسہ اور اندیشہ پیدا کرنے کے بعد وہ اسے اکیلا کیسے کمرے میں چھوڑ کر جائے۔ ظاہر ہے اکیلے میں وہ مزید پریشان ہو گی۔ اس لیے وہ پرسکوت ماحول میں بھی کچھ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ ابھی وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ سلمٰی آ گئی۔ سلمٰی نے ڈرتے ڈرتے صنوبر کی طرف دیکھا اور سلام کیا۔

"آ جاؤ سلمٰی۔ ڈرو مت اب صنوبر کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" سلمٰی نے صنوبر کی طرف دیکھا تو صنوبر نے ماں کی تائید میں خفیف سا مسکرا کر سلمٰی کو ڈر سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

"سلمٰی اب تم یوں کرو جلدی سے میرے اور صنوبر کے لیے اچھی سی چائے بنا دو۔" درشہوار نے کہا اور سلمٰی "جی اچھا" کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ درشہوار اور صنوبر اس اثنا میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں اور چائے پینے کے بعد درشہوار نے محسوس کیا کہ صنوبر بڑی حد تک خود پر کنٹرول حاصل کر چکی ہے اور کافی بہتر ہے۔ اس لیے وہ قدرے اطمینان سے وہاں سے چلی گئی۔

ماں کے جانے کے بعد صنوبر پھر سے گہری پریشانی میں چلی گئی۔ وہ ماں کے سامنے کوشش کرتی رہی تھی کہ اس کی وجہ سے انھیں زیادہ پریشانی نہ ہو۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ماں غلط نہیں کہہ رہیں جو بھی شرجیل کی اس حرکت کے بارے میں سنے گا وہ ایسی ہی بات سوچے گا اور وہ تو یوں بھی اس کی ماں ہیں۔ اگر شرجیل کا فون نہ آیا ہوتا تو صنوبر پتا نہیں کتنی ہی دیر تک سوچوں کی اندھی وادی میں یونہی بھٹکتی رہتی۔ شرجیل نے اس سے کہا کہ اس کا کہنا غلط نہیں ہے مگر اپنی صفائی میں وہ جو بھی کہے گا اس کے سامنے بیٹھ کر کہے گا۔ اس طرح فون پر بات کرنا اسے کچھ مناسب نہیں معلوم ہو رہا۔ اس کے بعد وہ صنوبر کو اپنی سچی اور والہانہ محبت کا یقین دلاتا رہا اور صنوبر کا دل کہتا تھا اس کا شرجیل جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ واقعی اس سے سچی اور پرخلوص محبت کرتا ہے۔ دونوں نے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا اور یوں بپھرے ہوئے پانیوں میں شانتی آ گئی۔

☆......☆......☆

رات کی پرہول خاموشی میں سلمان کی ماں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ سلمان کا باپ ابراہیم اس سے سلمان کے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ سلمان بھی دوسرے کمرے میں بیٹھا صنوبر کی محبت اور جو حالات اس کے سامنے درپیش تھے ان پر غور کر رہا تھا۔ ہر چند کہ جیسی محبت وہ صنوبر سے کرتا تھا ایسی محبت میں کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جسے معقولیت سے تعبیر کیا جائے۔ مگر سلمان کوئی انسان نہیں تھا جو اپنی ذہنی رو میں بہہ کر خود سے مکمل بے گانہ ہو جاتے ہیں، ان پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ دیوانے کہلانے لگتے ہیں۔ وہ ایک جن زادہ تھا اور اسے اپنی سوچوں اور خود پر بڑی حد تک عبور حاصل تھا اس لیے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں کی پریشانی غلط نہیں ہے۔ اس کی محبت کے لیے اس کے ماں باپ اتنی بڑی قربانی دینے سے زیادہ یہاں رہ کر سردار کی تجویز کردہ موت کو گلے لگانا پسند کریں گے۔ تو وہ کیا کرے...... کیا صنوبر کو بھول جائے؟" یہ سوال جب بھی اس کے ہردے میں سر اٹھاتا اسے جواب نفی میں ہی ملتا تھا۔ اس نے انسانوں میں جا کے رہنے اور مدرسے میں پڑھنے والی اپنی ضد اور فیصلے پر غور کیا تو کڑی سے کڑی خود بخود ملتی چلی گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ خدا کی مرضی یہی ہے ورنہ وہ کیونکر ساری جن جاتی سے الگ یہ ضد کرتا کہ اسے انسانوں میں جا کے پڑھنا ہے۔

اور کیوں اس دن وہ اپنے مدرسے کا راستا بھٹک کر صنوبر کے گھر تک پہنچتا۔ قدرت کے بھید کو اس نے پالیا تھا جو اسے صنوبر سے ملانا چاہتی تھی۔ ملانا اور اس ملانے کے بعد اس کے دل میں محبت کی آگ روشن کرنا چاہتی تھی۔ اگر یہ قدرت کا فیصلہ ہے تو اسے اس پر چلنا ہی ہوگا اور اس کے ماں باپ کو اس کا ساتھ دینا ہی ہوگا۔

''لیکن اگر اس کا بابا نہ مانا تو؟'' اسے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کی محبت میں سارے رسم و رواج اور ڈر اور خوف کو بھول کر اس کے ساتھ وہاں انسانوں میں جا کے رہنے پر بالآخر راضی ہو جائے گی لیکن اس کا باپ ابراہیم یہ بات کسی صورت نہیں مانے گا اور وہ نہیں مانا تو اس کی ماں بھی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔ ایسے میں کیا اسے اپنے ماں باپ کو سردار کے رحم و کرم پر چھوڑنا ہوگا؟''

اس سوال کا جواب اس کے حلق میں پھنس پھنس جاتا تھا اور اسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی اور اس کے کان مسلسل ماں باپ کے کمرے سے بلند ہونے والے شور پر لگے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اس کی ماں سے ضرور کچھ نہ کچھ پوچھے گا اور جواب میں اس کی ماں کتنے ہی میٹھے اور شیریں لہجے میں اسے کیوں نہ کچھ بتائے اس کا باپ برداشت نہیں کر سکے گا اور اس کے چیخنے چلانے کی آواز سارے غار میں گونجنے لگے گی۔

''تم نے بات کی سلمان سے.... کیا کہتا ہے... اب تو نہیں جائے گا نا وہ انسانوں کی دنیا میں؟'' ابراہیم نے آہستگی سے پوچھا تب بھی سلمان کی ماں کا کلیجہ لرز کر رہ گیا۔ وہ چپ رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اداسی اس کے دل میں ڈیرا کیے ہوئے تھی اور اس کے اثرات سے اس کا چہرہ تاریک ہو چکا تھا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا زلیخاں!'' ابراہیم نے تشویش سے پوچھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے کوئی بات کرے اور وہ جواب نہ دے۔ کیونکہ اسے ویسے ہی زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی اور زلیخاں کو اس سے یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ گھر میں ہوتا ہے تب بھی جانے کون سی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے اس سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ اس لیے ابراہیم جب بھی کوئی بات کرتا تو زلیخاں اس کی بات توجہ سے سنتی تھی اور ہمیشہ اس کی بات کا جواب دیتی تھی لیکن آج اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب تھا بھی تو وہ اسے بیان نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا اس کا جواب سن کر ابراہیم نہ ہی خوش ہوگا اور نہ ہی چپ۔ وہ اور سوال کرے گا۔ ان سوالوں کے جواب تو اس کے پاس واقعی نہیں تھے تب وہ چیخنے لگے گا۔ ہوسکتا ہے سلمان پر غصہ کرے اور دونوں باپ بیٹوں میں لڑائی ہو۔

یہ بھی ہوسکتا ہے ابراہیم خود پر قابو نہ رکھ سکے اور سلمان پر ہاتھ چھوڑ دے ایسا ہوا تو اس کی زندگی میں ایک کی بجائے دو دکھوں کو راستا مل جائے گا۔ ایک یہ کہ بیٹا ہمیشہ کے لیے گھر اور نظروں سے دور ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ سردار کے آدمیوں کو خبر ہوگئی تو وہ سلمان کی بازیابی کا مطالبہ کریں گے۔ اس کا پتا پوچھیں گے اور ان کے پاس پتا بتانے کے علاوہ اور کیا راستا باقی بچے گا۔ سلمان کا پتا بتانے کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہونا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو سردار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور وہ اسے جان سے مار دینے کی سزا سنا دے۔ وہ سوچتی رہی اور خاموش رہی۔ تب کچھ دیر کے انتظار کے بعد ابراہیم عین اس کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ تمہارے دل میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جسے بیان کرنے سے تم ڈرتی ہو اور میں جانتا ہوں یہ بات سلمان کے بارے میں ہے۔ ایک بات تو میں بھی جانتا ہوں سلمان نے انسانوں کی دنیا میں واپس نہ جانے کی تمہاری بات رد کر دی ہے۔ اور کیا بات ہوسکتی ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ سلمان نے منع کر دیا ہے تو مجھے بتا دو۔ اس طرح چپ نہ رہو میں اس سے خود بات کروں گا۔ وہ میری مجبوری کو سمجھے گا اور ممکن ہے اپنے باپ کو کچھ رعایت دیتے ہوئے میری بات مان جائے۔ لیکن مجھے پوری بات تو بتاؤ اس نے کیا کہا ہے؟'' ابراہیم نے رسان سے اور دھیمے لہجے میں کہا۔ جیسے وہ اپنی بیوی سے محبت بھری باتیں سرگوشی میں کیا کرتا تھا بالکل اس طرح۔ ابراہیم کی باتیں سن کر جن میں کئی سوالات تھے۔ زلیخاں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ وہ بے

بسی سے رونے لگی تو ابراہیم کو اور بھی فکر ہوئی۔ وہ ایک دم سے پریشان ہوگیا۔ اور بے چینی سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں۔ اس کے انکار کے علاوہ بھی کوئی اور بات ہے۔ خدا کے لیے زلیخاں مجھے بتاؤ۔ مجھ سے نہ چھپاؤ۔ چھپانے سے بات اور بگڑ سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے جیسا تم سوچ رہی ہو ویسا نہ ہو اور میں اس مسئلے کا کوئی اور حل نکال لوں جس نے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر دیے ہیں''

''پہلے مجھ سے ایک وعدہ کرو'' زلیخاں نے روئی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ابراہیم سمجھ گیا کہ بات کچھ زیادہ ہی گھمبیر اور بڑی ہے ورنہ زلیخاں اس سے اس طرح وعدہ تو کبھی نہیں لیتی تھی۔ وہ زلیخاں کی بات سن کر اور بھی زیادہ بے چین ہوگیا اور اس نے اسی بے چینی میں جلدی سے وعدہ کرلیا۔

''بولو کیا وعدہ لینا چاہتی ہو؟ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے۔ تم جانتی ہو میں تم سے اور اپنے بیٹے سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو اور تمہیں دکھ میں دیکھنا مجھے کسی قیمت پر گوارہ نہیں ہے۔ جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟''

''وعدہ یہ کرنا ہے تمہیں کہ سلمان سے جھگڑا نہیں کرو گے اور جو وہ کہتا ہے اس کی بات مان لوگے'' زلیخاں نے جیسے پہلے ہی سلمان کی بات ماننے کا اپنے تئیں فیصلہ کرلیا تھا۔

''سلمان سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ یہاں تو تک تو ٹھیک ہے مگر اس کی ہر بات مان لوں!! یہ ذرا مشکل ہے۔ پتا نہیں ایسی کیا بات ہے۔ میں تو پہلے ہی اس کی زندگی کی سب سے مشکل اور انہونی بات مان چکا ہوں اور تم جانتی ہو اسی بات کو ماننے کی وجہ سے اسے انسانوں کی دنیا میں رہنے اور انسان بن کر پڑھنے کی اجازت دے چکا ہوں حالانکہ یہ ہماری رسموں اور قبیلے کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ جس کی بڑی کڑی سزا ہے۔ میں خود اس کی وجہ سے کئی بار انسان کا روپ دھار چکا ہوں۔ اس سے ملنے جاتا ہوں۔ اسے داخلہ دلانے گیا تھا۔ یہ سب میں نے اپنے اصولوں کے خلاف انسان بن کے ہی کیا تھا'' ابراہیم کے جواب میں یہ صاف تھا کہ وہ پوری بات کو وعدے کا جامہ پہناتے ہوئے پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔

''میں جانتی تھی تم وعدہ نہیں کرو گے۔'' زلیخاں نے مایوسی سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ سلمان کی بات کیا ہے۔ کیا وہ انسانوں کی بستی میں رہنے کے علاوہ بھی کچھ اور چاہتا ہے جس کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ مجھے منظور نہ ہوگا۔'' ابراہیم نے سوچوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتے گرتے اس طرح سے کہا جیسے وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور کہہ کچھ رہا ہے۔

''تو پھر ایسا کرو اطمینان سے میری پوری بات سن لو اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔'' زلیخاں کی بات سن کر اس کے چہرے پر ایک عجیب کا تناؤ پیدا ہوا۔ اس نے گہری سانس لی اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔

☆......☆......☆

سلمان کو دیر تک جب کمرے سے کسی قسم کے شور شرابے کی آواز سنائی نہ دی تو اسے یقین ہوگیا کہ اس کی ماں نے اس کے باپ کو اس کی کہی ہوئی بات بتائی ہی نہیں ہے اور شاید دونوں سو گئے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ بے قرار ہوگیا۔ اسے فکر تھی کہ اس طرح اس کا یہاں پڑاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔

مدرسے سے بھی زیادہ اسے صنوبر کی فکر ستا رہی تھی کہ وہ پتا نہیں کیسی ہوگی۔ کیا کرتی ہوگی۔ جب اس نے صنوبر کو چھوڑا تو اس کے بعد وہ وہاں رکا نہیں تھا اور اب اسے یہ بات ستا رہی تھی کہ صنوبر کے اس طرح اچانک بالکل ٹھیک ہو جانے سے اس کے گھر والوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے۔ کہیں وہ صنوبر کو ایب نارمل تو نہیں سمجھ لیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اسے بھانت بھانت کے ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں گے اور یہ بات سلمان کو کسی بھی طرح منظور نہیں تھی اس نے صنوبر کا جسم چھوڑا ہی یہ سوچ کر تھا کہ اس کا باپ اسے

علاج کے لیے دوسرے دیس بھیجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن بات تو یہ بھی کم پریشانی والی نہیں تھی کہ صنوبر کو بیمار سمجھ کے کسی ڈاکٹر کے تجربوں کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ ایسا ہوا تب بھی صنوبر کو تکلیف ہوگی اور وہ ایک اچھی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ وہ صنوبر سے محبت کرتا تھا اور اس کی محبت اسے یہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ صنوبر کو کوئی تکلیف ہو۔ وہ ایب نارمل سمجھی جائے اور لوگ اس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھیں اور اس کے بارے میں قسم قسم کی باتیں کریں۔ اس کے علاوہ یہ دکھ اور بے چینی بھی اس کے رگ و ریشے میں دوڑ رہی تھی کہ ابھی تک اس نے صنوبر سے اظہار عشق بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی صنوبر نے اس سے ایسی کوئی بات ہی کی تھی۔ ایسی کوئی بات تو کیا ابھی تو صنوبر نے اس کی اصل صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ محبت کے لیے تو اپنے محبوب سے دور ہونا۔ کئی کئی دن تک اس کا دیدار نہ کرنا ہی سوہانِ روح ہوتا ہے۔ پھر یہاں تو اس کے سامنے پہاڑ جیسی مصیبتیں آ کے کھڑی ہو چکی ہیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا انسانوں کی بستی میں جا کے رہنا ایسی قیامت لائے گا۔

انسان ہو یا جنات خدا نے صاف صاف کہا ہے کہ وہ کسی بھی مخلوق کو اتنا ہی علم دیتا ہے جو اس کی منشا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی سامنے کی چیز بھی انسان ہو یا جنات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ وہ بہت آسان ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ کسی کو کچھ بھی ایسا معلوم ہو جو وہ نہیں چاہتا۔ ہر بات ہر ذی نفس کو یا عقل والوں کو بھی اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب خدا نے اس کا وقت مقرر کر دیا ہوتا ہے۔ اگر سلمان کو پہلے سے یہ بات معلوم ہو جاتی کہ اس کا انسانوں میں جا کے رہنا اور پڑھنا ایسی آفت کا سبب بنے گا۔ اسے اس طرح کا عشق ایک انسان لڑکی سے ہو جائے گا جو اس کی جان کنی کا سبب بن جائے گا تو ممکن تھا کہ وہ پڑھنے کی ضد سے باز آ جاتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا' جیسا قدرت نے چاہا ویسا ہی ہو چکا تھا اور اس کے آگے بھی جو قدرت چاہتی ہے وہ ہی ہوگا۔ لیکن ایک بات سلمان کو اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ کوئی بھی ذی نفس خواہ کچھ بھی کیوں نہ کر لے ایسی کسی بات سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتا جس پر خدا راضی نہ ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دنیا کی سب سے زیادہ شدید آگ عشق کی آگ ہے۔ جو وجود میں دہکنے لگتی ہے تو باہر کی کوئی اور آتش اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پتا نہیں ایسا اسی کے ساتھ ہو رہا تھا یا انسانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مدرسے میں ایسے اسباق پڑھائے نہیں جاتے تھے جن سے وہ انسانی عشق کی تاریخ کے بارے میں جان پاتا اسی لیے وہ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ سسی پنوں۔ ہیر رانجھا اور سلیم انارکلی جیسی عشقیہ داستانوں سے ناواقف تھا ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ عشق میں بڑے بڑوں نے بہت کچھ کھویا ہے۔ گھر بار اور کبھی کبھی تاج و تخت بھی شاید اسی لیے اس کے سامنے بھی ایسی ہی آزمائشیں آ کے کھڑی ہو چکی تھیں جو اس کے مستقبل کا پتا دے رہی تھیں اور اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں کچھ کھو نہ دے۔ اسی لیے اس نے اپنی ماں سے یہ بات کہی تھی کہ بابا اور وہ اس کے ساتھ انسانوں کی بستی میں چل کر رہیں اس طرح کم سے کم وہ اپنے ماں باپ کی حتی المقدور حفاظت کر سکے گا اور دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ اگر انھوں نے اس کی بات نہیں مانی تو یہاں قبیلے کا سرداران کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک کرے گا۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔

اسے شاید معلوم بھی نہ ہو سکے پتا نہیں کیا کیا سوچوں نے اسے گھائل کر دیا تھا۔ اب جو اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماں نے اس کے باپ سے کوئی بات سرے سے کی ہی نہیں ہے تو وہ اور بھی فکر مند ہو گیا۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس لیے اس نے سوچا کہ غار سے باہر نکل کر تھوڑی چہل قدمی کر لے۔ چہل قدمی تو ایک بہانہ تھا اگر ماں نے پوچھا تو وہ انھیں یہی کہے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہم شکل کو بلا کر اسے صنوبر کی ڈیوٹی پر لگانا چاہتا تھا تاکہ جب تک وہ صنوبر سے دور رہے تو اسے صنوبر کی پل پل کی خبر معلوم ہوتی رہے اور وہ اس طرح اندھیرے میں بے کلی سے کرلاتا نہ رہے۔ ایسا سوچتے ہوئے اس نے ایک بات نظر

انداز کر دی تھی کہ یہاں قبیلے میں ایسی کوئی بھی حرکت جو جناتی قوانین کی خلاف ورزی کہلاتی ہے اس کے بارے میں فوراً ہی سردار کے ہرکاروں کو معلوم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس لیے وہ باہر نکلنے کو چل تو پڑا مگر تھا تلاش میں۔ اس نے تو اپنی ماں کو بھی بس اتنی ہی بات بتائی تھی کہ اسے ایک لڑکی سے عشق ہو چکا ہے۔ جن جناتی کے قوانین کی جو خلاف ورزیاں وہ کر چکا تھا ان کے بارے میں اس نے ماں کو کچھ نہیں بتایا تھا وہ جانتا تھا اس کی ماں یہ جان کر اسے شیطان کا چیلہ سمجھنے لگے گی اور اس کا پاک باز عشق ان ہی جنات کے مطابق سمجھا جائے گا جو بلاوجہ اپنی تسکین کے لیے انسان لڑکیوں کو پریشان اور بے بس کر کے ان کی ناقدری کا مزا لیتے ہیں۔

اس کے باہر جانے کی خبر ابراہیم اور زلیخاں دونوں کو ہو گئی۔ ابھی زلیخاں نے اپنی بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ اسے سلمان کے باہر جانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔

''اتنی رات گئے یہ کہاں جا رہا ہے؟'' ابراہیم کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں وہ قبیلہ چھوڑ کے ان کے علم میں لائے بغیر فرار تو نہیں ہو رہا۔

''جیسا تم سوچ رہے ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں وہ ہمیں اس طرح مصیبت میں چھوڑ کے کبھی کہیں نہیں جائے گا۔ تاوقت کہ ہم خود اس سے نظریں پھیر کر مصیبت کو اپنے لیے منتخب کر لیں۔ تم بیٹھو میں دیکھتی ہوں کہ کیا بات ہے۔''

ابراہیم کچھ دیر تک کمرے میں بے چینی سے ٹہلتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد زلیخاں آئی تو وہ اس کی طرف عجلت سے لپکا۔

''کیا بات ہے کیا ہوا ہے وہ کہاں جا رہا ہے؟'' اس نے ایسی ہی بے قراری سے پوچھا۔

''گھبراؤ مت پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے نیند نہیں آ رہی ایسے ہی باہر کی ہوا کھانے گیا ہے'' زلیخاں کی بات سن کر ابراہیم کو تسلی تو ہوئی مگر اس کا وسوسوں میں گھرا ہوا ذہن ایک اور طرح کی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب سلمان کو اپنے گھر میں سکون نہیں ملتا۔ وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں پاتا۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ انسانوں میں جا کے رہنے کے بعد وہ اتنا بدل جائے گا تو وہ کبھی اسے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب تو جو ہونے والا تھا اسے خود کو اس کے لیے آمادہ و تیار کرنا تھا' اس لیے وہ زلیخاں کی طرف متوجہ ہوا۔

''اب کہو تم کیا کہنے والی تھیں!''

''میری بات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سننا۔ یہ بات خطرناک بھی ہے اور سوچنے سمجھنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے میری بات سن کر تمہارا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے مگر اس سے بات اور بگڑ سکتی ہے اس لیے پہلے ہی کہہ رہی ہوں بہت حوصلے اور دھیرج سے میری بات سننا اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔''

''تم کہو میں ویسا ہی کروں گا جیسا تم کہتی ہو جذبات اور غصے میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا'' ابراہیم نے فکرمندی سے کہا۔

''تو پھر سنو۔ ہمارے پاس دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنے بیٹے کی بات مان لیں اور دوسرا یہ کہ ہم اس کی بات نہ مان کر اس کے خلاف ہو جائیں۔ مگر میں سمجھتی ہوں دونوں ہی باتوں میں جان کا خطرہ ہے اور ایک بات طے ہے کہ ہم اپنے بیٹے سے.... اس کی زندگی سے....'' کہتے کہتے زلیخاں رک گئی اتنی سفاک بات اس کے حلق میں آ کر پھنس گئی وہ تو کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اسے اپنے بیٹے کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ خود مر جانا پسند کرے گی۔ لیکن یہ مسئلہ کچھ اس طرح سے الجھ گیا تھا کہ وہ اپنی جان دے کر بھی اپنے بیٹے کی جان نہیں بچا سکتی تھی ورنہ وہ بنا سوچے سمجھے اپنے بیٹے کے بدلے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتی۔

زلیخاں چپ ہوئی تو ابراہیم بھی غم و اندوہ میں چلا گیا وہ پوری بات سنے بغیر ہی سمجھ گیا کہ اس کی بیوی کیا کہنا چاہتی ہے اس کے بیٹے سلمان کی زندگی کو خطرات لاحق تھے اور کوئی راستا ایسا نہیں تھا جس پر چل کر اس کی حفاظت کی جاسکتی ہو۔ سوائے اس کے کہ سلمان ہر بات بھول کر یہاں ان کے پاس رہ جائے اور پھر کبھی انسانوں کی بستی میں واپس جانے کا خیال تک دل میں نہ لائے مگر زلیخاں جان چکی تھی کہ یہ بات ناممکن تھی اور اس ناممکن کو ممکن بنانے کی صرف کوشش ہی کی جاسکتی تھی کامیابی کا ایک فیصد بھی چانس نہیں تھا۔

''ہمارے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے اور دونوں ہی راستے اس کی زندگی کے لیے جان لیوا ہیں۔ اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ کون سا راستا منتخب کرنا ہے'' طویل توقف کے بعد زلیخاں نے پھر سے بات شروع کی۔

''وہ دو راستے کیا ہیں؟'' ابراہیم کی آواز کی گمبھیرتا کو زلیخاں نے محسوس کرلیا تھا مگر بات پوری کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ایک یہ کہ ہم اپنے بیٹے کا ساتھ دیں۔ جیسا وہ چاہتا ہے وہ کریں اور ایک یہ ہم اس کے خلاف ہوجائیں اور قبیلے کے سردار کا اور ان قوانین کا ساتھ دیں جو صدیوں سے جن جاتی میں لازم و ملزوم سمجھے جارہے ہیں'' زلیخاں نے پورے حوصلے سے اپنی بات پوری کرنے کا عزم کرلیا تھا۔

''سلمان کیا چاہتا ہے؟'' ابراہیم کی بے چینی سوا ہوتی جارہی تھی

''وہ یہاں رہنا نہیں چاہتا'' زلیخاں نے دھیرے سے کہا۔

''پڑھائی ختم ہونے کے بعد بھی نہیں؟''

''کبھی بھی نہیں''

''پر کیوں؟'' ابراہم کی الجھن بڑھتے بڑھتے غار کی چھت سے ٹکرانے لگی۔

''اسے... ایک انسان... لڑکی سے... محبت... ہوگئی ہے'' زلیخاں کے منہ سے یہ الفاظ کتنے ہی ٹھہر ٹھہر کر کیوں نہ ادا ہوئے ہوں ابراہیم کے وجود میں شعلہ جوالا بننے میں ایک پل بھی نہیں لگا۔

''کیا..........؟؟؟'' غصے سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچ ڈالا۔

''ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ شیطانی بات اس کے دماغ میں آئی کیسے؟ وہ کیا چاہتا ہے۔ خود کو شیطانوں کے ٹولے میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ جانتا بھی ہے اس کا کتنا بھیانک انجام ہوگا۔ وہ نہ دین کا رہے گا اور نہ دنیا کا۔ اسے صرف قبیلے سے ہی نہیں نکالا جائے گا بلکہ ممکن ہے سردار اسے موت کی سزا سنانے سے بھی احتراض نہ کرے۔ اور اس کے بعد خدا کے سامنے بھی اسے معافی نہیں ملے گی یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے اور جو خدا کی مرضی کے خلاف چلتے ہیں انھیں شیطانوں میں جگہ ملتی ہے۔ ان کے لیے الگ سے دوزخ بنائی گئی ہے' جہاں وہ ساری زندگی ایسی سزا بھگتیں گے جو ان سے برداشت نہیں ہوگی۔ کیا تم نے اسے یہ سب بتایا۔ وہ ابھی نادان ہے' بچہ ہے۔ اسے کیا معلوم وہ کیا کہہ رہا ہے اور جو وہ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنے کا کیا انجام ہے؟'' ابراہیم کا رگ و ریشہ جیسے آگ میں جھلسنے لگا۔

جن جاتی کو آگ سے تخلیق کیا گیا ہے مگر آگ کی بھی ایک ایسی شدت ہوتی ہے جہاں سے جنوں کے پر اور ان کا جسم جھلسنے لگتا ہے۔ اس وقت ابراہیم ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

''میں تمہارا یہ ردعمل جانتی تھی۔'' زلیخاں نے اپنے مچلتے دل کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تم سے کہا تھا کہ اپنے غصے اور اپنی فطرت' دونوں پر قابو رکھو گے۔''

''قابو نہ ہوتا تو اب تک میں سلمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرچکا ہوتا۔ یہ قابو ہی ہے جو میں تمہاری ایسی قابل تذلیل بات سن کر بھی یہاں کھڑا ہوں تمہارے سامنے۔'' ابراہیم پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے بنا سوچے سمجھے ہی اپنے بیٹے کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے۔ دونوں میں سے وہ

راستا چن لیا ہے جو تمہیں اپنے بیٹے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر دے گا۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ صرف میرے ساتھ ہی ہوگا۔ تمہیں بیٹے کی جدائی اور اس کی موت کا غم نہیں اٹھانا ہوگا؟'' ابراہیم نے کسمساتے ہوئے زور سے قریب رکھے تابے کے تھال پر اپنا غصہ نکال دیا۔ تھال کے بیچ میں گھڑا سا پڑ گیا۔ اگر اور زور سے مارا ہوتا تو سوراخ ہو جاتا۔

''پتا نہیں۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا!'' وہ کچھ تذبذب سے بولی۔

''کیا مطلب ہے۔ کیا تم قبیلے اور جن جاتی کے فیصلے خلاف بھی جا سکتی ہو؟ کیا تم میرے ساتھ دغا کر سکتی ہو؟ مجھے چھوڑ سکتی ہو؟'' شدت جذبات سے وہ چلا اٹھا۔

''چلاؤ مت... میں نے کہا نا میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ جب فیصلہ کروں گی' یہ غصہ اور یہ زور اس وقت کے لیے اٹھا رکھو' زلیخاں کو بھی غصہ آنے لگا تھا۔

''مجھے بس یہ بتا دو کیا تم میرے خلاف اپنے بیٹے کا ساتھ دے سکتی ہو؟'' ابراہیم کو اپنی بیوی کی بے وفائی کے خیال نے جیسے توڑ کے رکھ دیا۔

''تم عجیب ہو ابھی میں نے نہ ایسا کچھ کہا ہے اور نہ ہی میں کسی فیصلے پر پہنچی ہوں اور تم ابھی سے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ مجھ پر الزام لگا نہیں رہے مگر تمہارے دل میں میرے لیے الزامات کا بوجھ جمع ہو رہا ہے۔'' زلیخاں نے اسے سمجھانے کے لیے بات کو دانتوں میں دبا کر اس طرح سے کہا کہ اس کی آواز اونچی نہ ہونے پائے۔

ابراہیم اب کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں ایک پرہول سناٹا طاری ہو گیا۔ دونوں کے سانسوں کی آوازوں نے ایک ساز سا تخلیق کر دیا تھا۔ وہ چپ تھے اور الگ الگ سمتوں میں سوچ رہے تھے۔

بیٹے کی جان کے لیے زلیخاں کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ بیٹے کے لیے شوہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی بلکہ وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر ابراہیم بھی اپنے بیٹے کا ساتھ دے۔ تاہم یہ بات سوچی جا سکتی تھی اس پر عمل ہونا کس قدر کٹھن اور دشوار تھا یہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔

''اگر میں سلمان سے بات کروں اور وہ میری بات مان جائے تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے'' کافی دیر بعد ابراہیم کی پرامید آواز نے کمرے کا سکوت درہم برہم کر دیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بات کر کے دیکھ لو۔ مگر میں جانتی ہوں۔ عشق کا زہر اس کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ اگر اس نے تمہارے رعب و داب یا باپ کی محبت اور عزت کے خیال سے یہ بات مان بھی لی تو وہ اس پر قائم نہیں رہ سکے گا اور کسی دن رات کے اندھیرے میں چپ چاپ یہاں سے بھاگ نکلے گا۔''

''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' ابراہیم کچھ نا سمجھتے ہوئے بولا۔

''میں اپنے بیٹے کو دنیا میں سب سے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کے اندر تک اتر کے دیکھ سکتی ہوں کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ کیا کرنے والا ہے اور کیا کر سکتا ہے'' زلیخاں کی بات نے ابراہیم کو مایوسی میں دھکیل ضرور دیا تھا لیکن ایک ہلکی سی امید اب بھی اس کے دل میں کہیں روشن تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ پہلے سلمان سے بات کر کے دیکھ لے پھر کوئی رائے قائم کرے گا۔

☆......☆......☆

صنوبر کے لیے اس کی ماں کی بات اتنی بھی معنی نہیں رکھتی تھی کہ وہ شرجیل کے خلاف بول کر اسے شرجیل سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن اس نے جو بات کہی تھی اس نے صنوبر کو بہت زیادہ تذبذب میں ڈال دیا تھا کیونکہ اس بات کا تعلق صنوبر کے مستقبل سے تھا۔ اس کی ماں کہنا تھا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ شرجیل آئندہ

پھر کسی مشکل وقت میں تمہیں اسی طرح بنا بتائے چھوڑ کر کہیں چلا نہیں جائے گا اور تم اس کشمکش میں اس کا انتظار ہی کرتی رہ جاؤ کہ پتا نہیں شرجیل نے ایسا کیوں کیا ہے۔

یہ بے وفائی ہے یا شرجیل کی کوئی ایسی مجبوری جس کے لیے اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو شرجیل کو تمہیں یوں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اسے بتا دینا چاہیے تھا کہ اس نے تمہیں اس طرح کیوں اور کس وجہ سے چھوڑا ہے۔ صنوبر کو اپنی ماں کی بہت معقول معلوم ہوئی اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی ماں نے غلط نہیں کہا ہے شرجیل پر اسے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے دوبارہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے اس وقت وہ شرجیل کے ساتھ بیٹھی ہوئی ضرور تھی مگر اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ شرجیل سے بہت ناراض ہے۔

''تمہاری ناراضگی پوری طرح درست ہے صنوبر مگر میں مجبور تھا۔ ڈیڈی کا مجھ پر بہت دباؤ تھا کہ میں ان کے پارٹنر کی بیٹی روبیسا سے شادی کرلوں ورنہ ان کا بزنس تباہ ہو جائے گا۔ انھوں نے مجھے سوچنے کے لیے تین مہینے کا وقت دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں یہاں سے کہیں دور جا کے سوچوں اور فیصلہ کروں۔ ان کا خیال تھا کہ میں تم سے دور ہو کر زیادہ آسانی سے فیصلہ ان کے حق میں کر سکتا ہوں۔ سچ پوچھو تو میں بھی اپنی محبت کو آزمانا چاہتا تھا کہ میں تم سے دور ہو کر کیا تمہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ کہیں میری محبت صرف تمہارے قریب رہنے سے ہی تو حدت میں نہیں رہتی۔ دور ہونے سے اس محبت میں وہ گرمی اور حرارت باقی رہتی ہے یا نہیں۔ یہی سوچ کر میں گیا تھا لیکن یقین کرو صنوبر میں نے دور رہ کر جانا کہ میں تم سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر جی نہیں سکتا۔ اب اگر میں تمہیں یہ سب بتا کر جاتا تو تم پریشان ہو جاتیں اور میں سمجھتا ہوں اس طرح میں اپنی محبت کا اور اپنا امتحان بھی ٹھیک طرح نہیں لے سکتا تھا۔ اگر میں تم سے فون پر یا کسی بھی اور ذریعے سے رابطہ کرتا تب بھی میں اپنے امتحان کو درست قرار نہیں دے سکتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میری محبت میرے باپ کی سختیوں اور مخالفتوں کا سامنا کر سکتی ہے یا نہیں.....اور مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے امتحان میں کامیاب لوٹا ہوں۔ میں تمہیں کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

شرجیل کی بات میں دم تھا صنوبر کے سارے وسوسے اس کی بات سننے کے بعد تحلیل ہو گئے۔ اور اسے اپنے شرجیل پر پھر سے پہلے کی طرح یقین آ گیا۔ وہ محبت سے سرشار ہو گئی پھر بھی اپنی بات پر اڑی رہی کہ اسے اس طرح لاعلم رکھ کر اس نے ٹھیک نہیں کیا۔ وہ اگر اسے بتا دیتا تو ہم دونوں مل کر محبت کے اس امتحان سے گزرتے اور اس طرح الگ الگ رہ کر اندیشوں میں گھرے ہوئے دکھوں کا بار نہ اٹھاتے۔''

شرجیل نے اس کی بات کو غلط نہیں کہا اور نہایت محبت سے بولا۔

''میں تمہیں غلط نہیں کہتا اب تم جو بھی سزا مجھے دینا چاہو مجھے منظور ہے'' صنوبر نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''تمہاری سزا یہ ہے کہ اب میں تم سے....'' کہتے کہتے وہ رک گئی اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ شرجیل نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیا ہے'' صنوبر نے اس کے وجود کی گرمی میں ایسی تسکین محسوس کی کہ اس کی ساری ناراضگی پل بھر میں دور ہو گئی۔

وہ دونوں بے خبر تھے ان سے کچھ ہی فاصلے پر اسی جگہ فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور یہ دونوں محبت کے اسیر اس کی ایک لہر کو بھی سننے سے قاصر رہے۔ یہ سلمان کا ہم شکل تھا جو صنوبر کی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب اس بات پر قہقہے لگا رہا تھا کہ جن زادے سلمان کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ صنوبر تو پہلے ہی کسی کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی ہے......!!!

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ نومبر میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درجِ ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II ۔ خیابانِ جامی ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔ فیز-7، کراچی

عزیزو!

دل کبھی اس قدر اُداس نہ تھا جتنا اب ہے۔ شاید بڑھاپے میں انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے دکھ نہیں سہہ پاتا۔ میرے پاس ایسے خطوط کا ڈھیر لگ گیا ہے جو ہر طرف سے دھتکار دیے گئے ہیں۔ جہاں صرف عزتوں کا سودا کرنے پر پیٹ بھر روٹی دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب جان کر میں اپنے آنسو صرف پی ہی سکتا ہوں۔ یہ شہر بڑے بڑے اداروں سے بھرا پڑا ہے، جہاں لاوارث عورتوں اور بچوں کو رکھا جاتا ہے۔ مگر بیشتر کی سچائی اس قدر ہولناک ہے کہ اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے۔ بہر حال میں ان تمام بچوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے برسہا برس سے میرا مان رکھا مجھ پر بھروسا کیا۔ میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے بعد امدادی رقم پہنچائی جائے۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہمارے آس پاس ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ہاتھ بھی نہیں پھیلاتے، امداد کے اصل مستحق یہی لوگ ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو بعد از مرگ اچھا مقام عطا فرمائے اور ہمارے اعمال نامے ہمارے سیدھے ہاتھ میں ہی دیے جائیں۔ اس ماہ سورۃ لیسین، سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھنا بہت مبارک ہے۔ نماز کی پابندی اور درود شریف کا ورد ہر مسئلے سے نجات دلاتا ہے۔ استغفار کی تسبیح چلتے پھرتے ضرور پڑھنی چاہیے۔

☐ سائرہ رحمٰن۔ کراچی

o بابا جی! میرا نام سائرہ ہے میری عمر 24 سال ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ جتنے بڑے بڑے نام اور ادارے غریب لڑکیوں کی مدد کرتے ہیں وہاں جا کر جب حالات دیکھے تو مرنے کا دل چاہا۔ آپ نے بھی اگر مدد نہ کی تو میں خودکشی کرلوں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آپ سچے اللہ والے ہیں۔ سچے لوگ ہی پردے میں رہتے ہیں۔ بابا جی میرے والدین کا انتقال ہو گیا ہے اور شوہر نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا کیونکہ میں ماں نہیں بن سکتی۔ اب میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں جس سے مدد مانگوں، وہ رات گزارنے کا کہتا ہے۔ بابا جی مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں، کس سے مدد مانگوں۔ لوگوں میں خوف خدا بھی نہیں کہ یتیم لڑکی کا بھی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ بابا جی لوگ لاکھوں روپے سے امداد کرتے ہیں۔ پورا رمضان یہی سب دیکھا تو کیا ہم جیسے لوگوں کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں؟ آپ کا رسالہ ساری دنیا میں پڑھا جارہا ہے۔ کیا کوئی ایک بھی انسان ایسا نہیں جو مجھ لاچار کی مدد کر سکے۔ سب کو نمود و نمائش چاہیے میں بہت دکھی ہوں۔ آپ مجھے اپنے گھر نوکرانی بنا کر ہی رکھ لیں۔ تاکہ میری عزت تو محفوظ ہو جائے۔

☆ بیٹی سائرہ! تمہارا خط پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوا مجھے یہ بھی پتا چلا کہ تم نے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے مجھ سے ملنا بھی چاہا تھا۔ بیٹی اس معاشرے کی تلخ ترین حقیقت ہے کہ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہتا، جب تک نمائش نہ ہو۔ مگر بیٹی میرے کچھ بچے ایسے ہیں جو مجھے رقم ارسال کرتے ہیں، جن کے بدولت کچھ خاندان عزت سے جی رہے ہیں۔ میں تمہاری بھی کچھ امداد کر سکتا ہوں مگر بیٹی میں تو ملتا ہی نہیں، رکھنے کا تو سوال اٹھتا ہی نہیں...... حالانکہ تم میری نواسی اور پوتی جیسی ہو مگر بیٹی

میں حدود اللہ کا پاس رکھنے والا حقیر انسان ہوں۔ شاید اسی لیے لوگ میری بات پر بھروسا رکھتے ہیں۔ تم جہاں رہائش پذیر ہو وہاں کا پتا ارسال کرو۔ تمہاری یہ خواہش کہ ان تمام لوگوں کے نام جو بظاہر انسانیت کی خدمت کرتے ہیں اور روزانہ کی بنیاد پر ٹی وی پر آتے ہیں مگر درحقیقت بھیڑیے ہیں۔ نام نہیں دیے جاسکتے۔ میں تو شاید تحریر کر دیتا مگر ادارے کی پالیسی نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہارے لیے بہتر اسباب پیدا کرے۔ صبح شام آیۃ الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور چلتے پھرتے یا اللہ کا ورد کرو۔ مجھ سے رابطے میں رہو شاید کسی نیک دل انسان کو تمہارا خیال آجائے اور وہ اپنی قبر میں روشنی اور خوشبو بھرنا چاہے۔

□ بیٹی مقام نامعلوم

o میں نے جون کے شمارے میں اپنا مسئلہ لکھا تھا جس کے جواب میں آپ نے ہر نماز کے بعد تین تسبیح یا حجتہ القائم پڑھنے کو کہا تھا۔ 41 دن تک میں اسی طریقہ کار سے ہر نماز کے بعد پڑھا ہے اب مزید آگے یہی تسبیح پڑھا کروں کیا کروں میری رہنمائی فرمائیں۔ کہ اللہ میری غیب سے مدد فرمائے۔ ابھی تک کوئی بہتری کے آثار نظر نہیں آرہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس مرتبہ عید پر بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنائے۔ پہلے تو جمع کر کے کپڑے بنالیتی تھی۔ جو بھائی میرے بچوں کا خرچہ اٹھاتا ہے۔ اُس نے بس اتنے پیسے دیے تھے کہ ایک بچہ کا سوٹ بنالی۔ نہ اپنا بنایا نہ بیٹی کا۔ نہ بچوں کی پہننے کی جوتی لی، بچوں نے بھی مجھے تنگ نہیں کیا کہ اس مرتبہ ہمارے کپڑے جوتے نہیں بنائے۔ مگر میرے دل پر کیا گزری سب بچوں نے 2 ہزار سے 1200 تک کے ایک دن کے کپڑے پہنے تھے۔ باقی 2 عید کے دن کے الگ کپڑے تھے۔ بابا جی مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ شاید میری دعاؤں میں اثر نہیں ہے۔ آپ کوئی تعویذ دیں کہ مجھے کہیں باعزت روزگار مل جائے۔ میں اپنے بچوں کے اخراجات خود اٹھاؤں۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں صبر دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ ورد جاری رکھو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اللہ لوگوں کے دلوں کو بھی نرم کرے اور وہ جائز ضرورت مندوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کریں۔ مجھے 21 روز بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ زبیدہ۔ کوئٹہ

☆ بیٹی زبیدہ! تم نے جو نمبر دیا تھا وہ بند جا رہا ہے۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے درست نمبر لکھوا دو۔ تمہارے لیے ایک نیک انسان نے کچھ رقم بھیجی ہے تاکہ وہ تم تک پہنچائی جاسکے۔

□ س، م، ا۔ حیدرآباد

o بابا جی! میں حیدرآباد سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں بہت سخت پریشان ہوں۔ بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر سے میری شادی 9 سال پہلے ہوئی، بہت جھگڑے بھی ہوئے۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ بار بار طلاق کی دھمکیاں دیتے تھے۔ بابا جی آپ کو یاد ہوگا کہ میرے ابو کو فالج ہوگیا تھا میری والدہ بھی حیات نہیں ہیں۔ دونوں بہنیں شادی شدہ ہیں۔ بابا جی ہمارے بیچ میں بہت مسئلے ہوئے ہیں آپ سے ہمیشہ رابطے میں رہتی ہوں۔ بابا جی اب ہم دونوں کے بیچ صرف بیٹی ہے، ہم صرف بیٹی کی وجہ سے سمجھوتا کر رہے ہیں۔ بابا جی اُس کے علاوہ ہمارا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ بابا جی میری حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ بابا جی میں شدید ڈپریشن میں ہوں۔ میرے پاؤں میں بہت درد رہتا ہے۔ کراچی کے کئی ڈاکٹرز کو دکھایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بابا جی ہر وقت میرے شوہر کی بے جا تنقید، بے عزتی نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ میں کیا کروں؟ بابا جی میں نارمل زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میرے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ ہر وقت ذہن ماؤف رہتا ہے۔ پلیز میری مدد کریں میرے لیے دعا کریں۔ براہِ کرم میرے کم لکھنے کو بہت جانیے گا، جواب جلد رسالے میں شائع کیجیے گا۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہیں پہلے بھی نصیحت کی تھی کہ مجھ سے تعویذ منگوالو، تمہارا مسئلہ گھمبیر ہو چکا ہے۔ جتنا وقت ضائع کرو گی اتنا ہی نقصان ہوگا۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تفصیل معلوم کرلو۔

□ کوثر جہاں۔ کلر کہار

○ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میرے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے۔ جس سے شادی کی ہے' وہ کوئی اچھی عورت نہیں۔ میرا قصور صرف یہ تھا کہ میرے بیٹا نہیں تھا۔ بابا جی! میرے شوہر نے ساری زندگی مجھے بہت پریشان رکھا اور اب پانچ بیٹیوں کی ذمے داری مجھ پر ڈال کر دوسری شادی کرلی۔ بابا جی! میرے لیے یہ دکھ بہت بڑا ہے مگر بچیاں اتنی پریشان ہیں کہ میں اُن کے سامنے اپنے دکھ اور پریشانی کا اظہار نہیں کرتی۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں' میری پریشانی سمجھ سکتے ہیں۔ میں بہت شریف اور دین دار خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ کسی کے آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلا سکتی مگر سمجھ نہیں آتا کہ زندگی کیسے گزرے گی؟ میری رہنمائی کیجیے۔

☆ بیٹی کوثر! تمہارے شوہر کا فرض ہے کہ وہ تمہاری اور بچیوں کی کفالت کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بیٹی! تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمہارے معاملات ضرور سدھارے گا۔ بیٹی! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو اور دُعا کرو۔ بس بیٹی! اطمینان رکھو' یہ آزمائش کی گھڑی ہے' اس میں صابر و شاکر رہو گی تو اللہ تم پر اور بچیوں پر ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ نعمان حسین۔ راولپنڈی

○ بابا سائیں! کچھ عرصہ قبل آپ سے اپنی بیوی کے توسط سے رابطہ ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے درمیان شدید ناچاقی تھی۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ آپ کے مفید مشورے کی برکت سے اب حالات بہت بہتر ہیں۔ جس مسئلے کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں' وہ معاشی پریشانی ہے۔ بابا سائیں! پچھلے کچھ ماہ سے ہاتھ بہت تنگ ہے۔ ویسے تو ہر شخص ہی پریشان ہے مگر چھوٹے کاروبار کرنے والے تو عاجز آچکے ہیں۔ میری شہر میں چھوٹی سی کپڑے کی دکان ہے۔ آمدنی برائے نام رہ گئی ہے اور خرچے اپنی جگہ ویسے ہی موجود ہیں بلکہ زیادہ ہی ہوگئے ہیں۔ گھر کی ذمے داری کیسے اٹھاؤں؟ بہت پریشانی ہے۔ سارا مہینہ مختلف بل دیتے ہی گزر جاتا ہے۔ بابا سائیں! یہ مسئلہ بہت سے خاندانوں کا ہے۔ کوئی ایسا آزمودہ وظیفہ دیں کہ عزت سے دال روٹی چلتی رہے۔

☆ بیٹے نعمان! اللہ تمہاری روزی میں برکت دے لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ کہیں دنیاداری اور دکھاوے کی وجہ سے تو ہاتھ تنگ نہیں ہو رہا؟ سیدھی سادی اور سہل زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔ زندگی میں توازن اگر ہو تو بہت اطمینان رہتا ہے۔ جو طرزِ زندگی تمہارے بڑوں کا تھا' کیا وہی تمہارا ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر مجھے فکر یہ ہے اور اگر نہیں تو بیٹے! اسراف سے بچو۔ بہتر سے بہتر کی دوڑ انسان کو بہت جلدی تھکا دیتی ہے۔ جو ہے جتنا ہے اس میں خوش رہنے والے بہت پرسکون رہتے ہیں۔ بہرحال تم نماز کی پابندی کرو اور بعد نمازِ فجر اور عشاء ایک ایک بار سورۃ ملک پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ مہربانو۔ قصور

○ بابا جی! آداب! میرے شوہر پہلے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن شادی کے چند سال بعد ہی وہ اجنبی سے ہوگئے ہیں۔ بات بات پر غصہ کرتے ہیں اور ہر وقت مجھ پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ پہلے دفتر سے سیدھے گھر آیا کرتے تھے' اب رات کو دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔ خرچ کے لیے میں ترستی رہتی ہوں۔ وہ میرے علاوہ سب لوگوں سے اچھی طرح ملتے ہیں۔ میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ مہینوں میرے قریب نہیں آتے۔ برائے کرم اس مسئلے کا کوئی حل بتایئے۔ میں بہت دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی مہربانو! بندہ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو لاتعداد' بے شمار مشکلات و مصائب اس سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ تم نے اپنی جنت کی بربادی کی جو داستان لکھی ہے' یہ ہمارے بے شمار گھرانوں کی سچی کہانیاں ہیں اور ان کہانیوں میں بھڑکتی ہوئی آگ خود اس میں جلنے والوں نے بھڑکائی ہے۔ ہمارے شادی شدہ جوڑوں نے مغرب کے اس طرزِ زندگی کو اختیار کرلیا ہے جو خود مغرب میں ناکام ہوچکا ہے۔ میری تمام خواتین سے درخواست ہے کہ اپنی ازدواجی زندگی اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے

دستورالعمل کے تحت بسر کریں' بے شمار دکھوں اور لاتعداد مصائب سے محفوظ رہیں گی۔

□ ثمن۔ژوب

○ بابا جی! السلام علیکم! میرا یہ پانچواں خط ہے' آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میں نے اور میری سہیلی نے آپ کا براہ راست بھیجا ہوا ایک وظیفہ شروع کیا تھا۔ اس کی تو منگنی ہوگئی' میرا مسئلہ حل نہیں ہوا' شاید اس لیے کہ درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ خدا کے واسطے' میرا مسئلہ حل کریں۔ میں آپ کا وہی وظیفہ دوبارہ شروع کروں یا آپ کوئی اور وظیفہ بتایئے۔ اگر آپ نے میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ مجھ دکھی لڑکی کی کوئی مدد کرنا نہیں چاہتے۔ وظیفہ بہت آسان بتایئے گا۔

☆ بیٹی ثمن! تمہارا یہ پہلا خط ہے' جواب دے رہا ہوں۔ تم نے آسان وظیفہ طلب کیا ہے تو ہر مشکل' ہر پریشانی اور ہر جائز حاجت کے لیے سب سے آسان' بے حد آزمودہ وظیفہ پانچ وقت کی نماز' سمجھ کر' توجہ کے ساتھ اول وقت میں ادا کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ وظیفہ روزانہ انجام دے تو مصائب و مشکلات کے پہاڑ بھی اس کے آگے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ہماری زیادہ تر پریشانیاں اسی وجہ سے ہیں کہ ہم نماز کو اہمیت نہیں دیتے۔ نماز پڑھو' ہر حاجت پوری ہوجائے گی۔ شادی کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو طریقہ آفس سے فون کرکے معلوم کرلو۔

□ فائزہ۔لاہور

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بعد سلام عرض ہے کہ میرا نام فائزہ اور والدہ کا نام انوری بی بی ہے اور میرے شوہر کا نام عقیل احمد اور والدہ کا نام بتول جان ہے۔ بابا! مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر ملک سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ اپنے ملک میں اُن کا روزگار نہایت کم ہے۔ شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں اور کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ تنخواہ پندرہ ہزار روپے ہے' گزارہ بہت مشکل ہے' بعض مرتبہ تو بچوں کو دودھ کے بغیر رہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ کا بھی ساتھ ہے۔ اتنی تنگی ہوتی ہے کہ ماں باپ کا حق نہیں ادا کرسکتے جنہوں نے پالا ہے یعنی تین سے چار ماہ کے بعد بھی ہزار یا پندرہ سو نہیں کہ ان کو خرچے کے لیے بھیج سکیں۔ گھر میں بھی آئے دن لڑائی کرتے ہیں بلا وجہ ناراض رہتے ہیں' کوئی بات کرو تو الٹا جواب' بس صرف لڑائی والی بات کرتے ہیں۔ بابا جی! ایک عورت کب تک برداشت کرے؟ اب خرچ کو کھینچ کر بھی پورا کریں' بمشکل سر پر عزت کی چادر قائم ہوتی ہے۔ بس کسی طرح وظیفہ بتائیں کہ باہر کا کام لازمی ہوجائے۔ ان کو ہوٹل لائن کا خاصا تجربہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہوٹل لائن میں ہی باہر ملک جائیں مگر ان کا کام ہمیشہ اٹک جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کے لوگ باہر چلے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بندش کردائی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اللہ نے آپ کو وسیلہ بنایا ہے تاکہ غریب لوگوں کے کام آسکیں۔ اب آپ سے لازمی لازمی التماس ہے کہ میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں تاکہ لڑائی جھگڑا ختم ہوجائے' پیار محبت سے رہیں اور باہر کے لیے لازمی وظیفہ ہوٹل لائن میں ہوجائے۔ خدا آپ کو ہمارے لیے ترقی کا زینہ بنائے کہ آپ غریبوں کے ہمیشہ کام آتے ہیں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ جائیں' ہماری بھی اور اپنے ماں باپ کی کفالت بھی بہترین انداز میں کرسکیں تاکہ قیامت کے دن ان کی اپنے ماں باپ کی طرف سے پکڑ نہ ہو اور نہ ہی ان کی وجہ سے کوئی پریشانی ہو کیونکہ دنیا مکافاتِ عمل ہے اس لیے والدین کا حق نہایت ضروری ہے۔ ہمارے بھی بچے ہیں' کل کو یہی عمل ہمارے ساتھ ہونا ہے۔ اس سلسلے میں' میں نہایت پریشان ہوں کہ والدین کی آخری عمر میں اُن کو انتہائی تنگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس لیے برائے مہربانی مجھے ایسا تعویذ دے دیں۔ اللہ ہماری سن لے' قبول کرلے۔ بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی فائزہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اور خوب گڑگڑا کر دُعا کیا کرو، مدت 41 دن ہے۔ تعویذ کے لیے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔ بیٹی! یقین رکھو' جو لوگ پورے یقین اور التجا سے اللہ سے مانگتے ہیں' اللہ انہیں ضرور نوازتا ہے۔

□ لائبہ۔سکھر

○ بابا جی! السلام علیکم! میری دوست شازیہ نے!

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

آپ کو خط لکھا تھا' ابھی تک مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بابا جی! آپ نے کہا تھا' بھائی پر روزانہ دن میں تین بار آیت الکرسی ایک ایک بار پڑھ کر دَم کرنا اور ہر نماز کے بعد 11 بار سورۃ الناس پڑھ کر دُعا کرنی ہے۔ یہ وظیفہ پڑھا گیا لیکن حالات ابھی تک ویسے ہی ہیں۔ بابا جی! جس لڑکی کے بارے میں لکھا تھا' وہ لڑکی ابھی تک بھائی کی جان نہیں چھوڑ رہی۔ کوئی ایسا وظیفہ بتایئے کہ بھائی کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ وہ لوگ صحیح نہیں ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پانچ سال ہوگئے ہیں' میرے بھائیوں کو کوئی کام نہیں ملتا۔ ایک دو مہینے کام لگتا ہے پھر بند ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا کریں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ زندگی بھر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی لائبہ! وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو' وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ فرحین۔ کوٹری

☆ بیٹی فرحین! تمہارا مسئلہ خود ساختہ ہے۔ والدین اولاد سے زیادہ تجربہ رکھتے ہیں لہٰذا انہیں فیصلہ کرنے دو۔ اپنی پسند' ناپسند سے اُن کو ضرور آگاہ رکھو' باقی فیصلہ اُن پر چھوڑ دو۔ یقین جانو' بہت خوش رہوگی۔ تمہیں کسی وظیفے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس احکامِ خداوندی کے مطابق زندگی گزارو۔ بہت خوش رہوگی۔

□ صدف۔ اسلام آباد

○ بابا جی! السلامُ علیکم! میرا مسئلہ نمبر ایک یہ ہے کہ بچپن میں سر کے پچھلے حصے میں شدید چوٹ آئی تھی' تب سے اب تک چوٹ والے حصے میں بہت تکلیف ہوتی ہے اور وہاں ماس بھی بہت نرم ہو چکا ہے۔ میں پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں بہت شفا ہوتی ہے۔ کوئی اسمِ پاک بتائیں جس سے مجھے شفا ملے۔ میرا مسئلہ نمبر دو یہ ہے کہ میرے پیٹ میں ہر وقت درد رہتا ہے۔ تھوڑا سا بھی کھا لوں تو ایسا لگتا ہے جیسے بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ بہت علاج کیا ہے' مختلف ادویات بھی استعمال کیں' فائدہ نہیں ہوا ہے۔ ذرا سا بھی کھانے کے بعد بیت الخلا جانا پڑ جاتا ہے۔ کچھ علاج بتایئے۔ بے شمار دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی صدف! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں دو بار ایک گلاس پانی میں دو چائے کے چمچے اسپغول گھول کر پی لیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد متاثرہ جگہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ دو اور آنکھیں بند کر کے ایک سانس میں 13 بار یَاشَافِعیُ پڑھو۔ یہ عمل ہر نماز کے بعد کرو مگر شروع فجر کے بعد کرنا۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ عامر احمد۔ اڈا گیمبر۔ اوکاڑہ

○ بابا جی! اللہ آپ کو جیتا رکھے تاکہ آپ ہم سب بے کسوں کے کام آ سکیں۔ بابا جی! شاید آپ کو یاد ہو' میری بہن نے آپ سے وزن کے لیے دوا لی تھی۔ وہ امریکا میں ہوتی ہے۔ میں ہی ''سچی کہانیاں'' کے دفتر سے آ کر دوا لے گیا تھا۔ آج کل بہن پاکستان آئی ہوئی ہے اور اپنے سسرال میں ہے جو کہ کراچی میں ہے۔ بابا جی! وہ چاہتی ہے کہ آپ اس کو 3 ماہ کی دوا تیار کر دیں تو وہ جانے سے پہلے آ کر خود لے جائے گی۔

☆ بیٹے عامر! بہن سے کہو' دوا میں تیار کر دوں گا۔ آنے سے قبل فون کر کے آئے تاکہ مطلوبہ مقدار میں دوا دفتر میں بھجوائی جا سکے۔

□ نورین۔ ڈہرکی

○ بابا جی! میں B.Sc فائنل ایئر میں ہوں۔ بہت کوشش کے بعد بھی امتحان کی تیاری نہیں کر پا رہی ہوں۔ بابا جی! امتحانوں کے بعد میری شادی بھی ہے۔ ظاہر ہے' رزلٹ سسرال ہی میں آئے گا اور جس حساب سے تیاری کر رہی ہوں' یقین ہے کہ اچھا نہیں آئے گا اور اگر ایسا ہوا تو بہت شرمندگی ہوگی۔ بابا جی! میری سسرال میں پڑھنے لکھنے کا بہت رواج ہے۔ ہر چھوٹا بڑا بہترین نمبر لیتا ہے۔ میں بڑی ہوں۔ اگر ایسے حالات رہے تو میں تو مذاق بن جاؤں گی۔ پلیز' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی نورین! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ کچھ عرصے کے لیے اپنی شادی کی تیاریاں بھول کر صرف پڑھائی پر توجہ دو۔ تمہارا سارا مسئلہ عدم توجہی کی وجہ سے ہے۔ اللہ نے اچھا ذہن دیا ہے' بس پوری توجہ کے ساتھ امتحانوں کی تیاری کرو۔ چلتے پھرتے یَاجَلِیلُ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔

□ اروی۔ ملتان

○ باباجان! میری شادی کو 5 سال ہوگئے ہیں مگر اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اولاد کے لیے تعویذ دے دیں کیونکہ وظیفہ کرنا میرے لیے مشکل ہوگا۔ بھرا پرا سسرال ہے پھر میں صبح اسکول میں بھی پڑھاتی ہوں۔ باباجان! میرے لیے دُعا بھی کیجیے گا کیونکہ اب ساس کا رویہ بھی تلخ ہوجاتا ہے۔

☆ بیٹی اروی! اللہ تمہیں جلد از جلد اولاد کی نعمت عطا فرمائے۔ میں تعویذ تیار کردوں گا۔ مجھے کچھ تفصیل درکار ہوگی۔ اپنی تاریخ پیدائش اور مکمل نام مع والدہ ارسال کرو۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ تعویذ کے بارے میں کسی کو بتانا نہ چلے۔

□ گل۔ کوہاٹ

○ باباجی! آداب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بڑی بیٹی جس کی عمر 25 سال ہے' اس کی شادی نہیں ہورہی جبکہ چھوٹی کی شادی ہوگئی ہے۔ بڑی بیٹی کا رشتہ آتا ضرور ہے لیکن دوبارہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ کوئی دُعا بتائیں۔ دو تین ماہ پہلے کے شمارے میں ایک خاتون نے خط لکھا تھا۔ انہوں نے کسی وظیفے کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس وظیفے کی تفصیل نہیں لکھی تھی' کیا پڑھنا ہے؟ مہربانی کرکے آیندہ شمارے میں وہ وظیفہ بتائیں۔

☆ بیٹی گل! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ بیٹی سے کہو نمازِ فجر اور عشاء کے بعد ایک بار سورۃ احزاب پڑھے اور دُعا کرے اور میں تمہیں رشتے کے لیے تعویذ کا مشورہ دوں گا۔ تعویذ کے لیے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ شہناز۔ حیدرآباد

☆ بیٹی شہناز! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری خواہش کے مطابق مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا ہے۔ بیٹی! تمہیں اپنا رویہ درست کرنا ہوگا۔ عورت کتنی پڑھی لکھی اور حیثیت والی کیوں نہ ہو' اس کو بہرحال مرد سے دب کر ہی رہنا ہوتا ہے' اس لیے نہیں کہ وہ کمتر ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ نے مرد کو اس کا محافظ بنایا ہے۔ تم جب تک اپنے شوہر کی عزت نہیں کروگی' معاملات درست نہیں ہوں گے۔ اپنے پچھلے رویے پر نادم رہو۔ بکثرت یَامَالِکَ الْمُلْکُ کا وِرد کیا کرو۔ تم اپنے رویے میں تبدیلی لاؤ گی تو معاملات خود بخود سنبھلتے جائیں گے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ میں تمام بچیوں کو نصیحت کروں گا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ ہمیشہ واپسی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ جو لوگ واپسی کی گنجائش نہیں رکھتے' وہ دیوار سے لگ جاتے ہیں اور یہیں سے ناکامی کا دور شروع ہوتا ہے۔

□ تنویر۔ جھنگ

○ باباجی! السلام علیکم! اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے اور آپ اسی طرح سب کی پریشانی اللہ کے حکم سے دور کرتے رہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں اور وہ مجھے۔ مسئلہ ہماری ذات کا تھا' یہ بات میری امی کو' بھائی اور ایک بھابی کو پتا ہے۔ ابھی یہ مسئلہ چل ہی رہا تھا کہ میری منگنی ہوگئی۔ مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بہت خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بھی ڈرتی ہوں۔ میرے گھر والوں نے میری منگنی کردی جبکہ میرا دل نہیں تھا' میں بہت روئی پر ایک لڑکی ہوکر کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ آج میری منگنی کو تقریباً دو مہینے ہونے والے ہیں' اکثر بہت اداس ہوجاتی ہوں پھر ٹھیک بھی ہوجاتی ہوں۔ جہاں میری منگنی ہوئی ہے' وہ لوگ اچھے ہیں پر جس کو میں پسند کرتی ہوں' وہ لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ اُن کے گھر میں بھی کچھ لوگ جانتے ہیں یہ سب بات۔ باباجی! میں چاہتی ہوں آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ وہ لڑکا جس کو میں پسند کرتی ہوں' کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے حق میں بہتر ہیں؟

☆ بیٹی تنویر! میں تمہیں تمہارا بڑا ہونے کی وجہ سے نصیحت کررہا ہوں کہ تمہارے والدین کا فیصلہ درست ہے۔ اپنی زندگی تباہ مت کرو۔ کتنی بچیاں ہیں جو صرف اس آس میں بیٹھی ہیں کہ اُن کے لیے مناسب رشتے آئیں لہٰذا اللہ کا شکر ادا کرو اور خوش رہو۔ اصل میں تمہیں شیطان بھٹکا رہا ہے۔ خوب توبہ استغفار پڑھو اور مطمئن

رہو۔

□ فاخرہ۔پڈعیدن

○ باباجی! میں ایک دکھی عورت ہوں۔ میرے دکھوں کی داستان بہت لمبی ہے۔ میری شادی ایک مرتبہ ہوچکی ہے۔ میں ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ میرے خاوند نے شادی کے چار سال بعد دوسری شادی کرلی اور مجھے طلاق دے دی۔ مجھے دوسری شادی کی ضرورت نہیں ہے لیکن معاشرہ مجھے جینے نہیں دیتا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں میرے جیسی عورت کا کیا مقام ہے۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو عزت کی زندگی دینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اپنے قیمتی مشوروں اور دُعاؤں سے نوازیں۔ ایک باعزت گھرانے میں میری شادی کا امکان ہے لیکن سب سے بڑی رکاوٹ میرا مطلقہ اور ایک بچے کی ماں ہونا ہے۔

☆ بیٹی فاخرہ! صبر اور نماز کے ذریعے حالات کا مقابلہ کرو اور دُعا کے ذریعے اپنے پالنے والے اللہ رَبُّ العالمین سے مستقل رابطے میں رہو۔ وہ بہت جلد تمہارا گھر آباد کردے گا۔ نماز کی پابندی کرو اور اپنے بیٹے کو ابھی سے اپنے دین سے روشناس کرانا شروع کردو اور یہ نیت کرو کہ رَبُّ العالمین نے تمہارا گھر آباد کیا تو تم اپنے بیٹے اور آیندہ ہونے والی اولاد کو ایک اچھا مسلمان بناؤ گی۔ نمازِ فجر کے بعد روزانہ 7 بار سورۃ یٰسین کو معمول بنالو اور اس کے علاوہ شادی کے لیے تعویذ کا مشورہ دوں گا۔ تم فوری طور پر دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ انشاء اللہ رب العزت کرم کرے گا۔

□ خالد۔کوٹلی

☆ بیٹے خالد! تمہارے مسئلے کا حل یا تمہاری فرضی بیماری کا علاج خود تمہارے اندر موجود ہے۔ ایک اچھا ڈاکٹر تمہیں خوشیوں کی راہ دکھا سکتا ہے لیکن اس کے لیے تم دونوں میاں بیوی کو تعاون کرنا ہوگا۔ مجھ سے براہ راست رابطہ کرو۔ کسی نے تمہارے اوپر عمل نہیں کرایا۔ یہ بیماری ہی نہیں ہے تو دوا سے کیسے دور ہوگی؟ ہاں آزمائش ہوسکتی ہے اور آزمائش کو ختم کرنے کی مکمل قوت رکھنے والا مہربان مالک اللہ رَبُّ العالمین تمہاری رگِ جاں سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔ ممکن ہو تو مجھ سے رابطہ کرلو مسئلہ حل ہو جائے گا، انشاء اللہ!

□ شرمین۔صادق آباد

○ محترم باباجی! السلام علیکم! بعد سلام دیگر احوال یہ ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا، جوابی لفافے کے ساتھ مگر اس کا جواب نہیں آیا۔ اب پھر خط لکھ رہی ہوں لیکن آپ کو ہدیہ نہیں بھیج رہی۔ میں نے پہلے ہدیہ بھیجا تھا مگر وہ خط شاید آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ اب ڈاک خانے سے پتا کروایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ خط پہنچ چکا ہے۔ باباجی! آپ نے مجھے جو وِرد دیا تھا، وہ میں اب تک کررہی ہوں۔ کبھی کبھی ناغہ بھی ہوجاتا ہے۔ بہرحال اب اصل مسئلے کی طرف آرہی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بھائی جس کا نام حسنین ہے، وہ پھر بری صحبت میں پڑ چکا ہے، وہ شراب، چرس اور پتا نہیں کیا کچھ پیتا ہے۔ وہ بھانجی کے ساتھ غلط حرکتیں بھی کرتا ہے۔ میں ساری ساری رات پریشانی سے سو نہیں سکتی کیوں کہ بھانجی میرے ساتھ رہتی ہے، وہ اس کے ساتھ کوئی حرکت کرتا ہے تو میرا پارہ ہائی ہوجاتا ہے اور جب ڈانٹتی ہوں تو گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اتنی گندی بکواس کرتا ہے کہ سنی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے آپ میری مدد فرمائیں اور مجھے حفاظت کا تعویذ دیں کہ ایک تو وہ غلط صحبت اور غلط حرکات چھوڑ دے۔ باباجی! آپ نے ایک وظیفہ دیا تھا، کہ ناگہانی مشکل میں کرسکتے ہیں اور آپ نے اُس کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ وہ میں نے شروع کیا ہوا ہے مگر حالات بہت زیادہ خراب ہوچکے ہیں اس لیے آپ بتایئے، میں کیا کروں؟ باباجی! میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا اور میری مدد کریں۔ باباجی! میں زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ اللہ کے سوا، میرا کوئی دکھ سکھ سننے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو اپنی پریشانی اور دکھ سنا سکتی ہوں۔

☆ بیٹی شرمین! ایسا ممکن ہی نہیں کہ مجھ تک خط پہنچے اور میں جواب نہ دوں۔ ہدیہ اگر لفافے میں رکھو گی تو وہ ڈاک خانے والے نکال کر خط پھاڑ دیتے ہیں۔ بہرحال بیٹی! بھائی پر ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دَم کرو۔ تم نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو۔ یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِرَحْمَتِکَ

استغیث پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

☐ شہزاد۔ پسرور

○ محترم باباجان! السلام علیکم! امید ہے' آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین!) محترم باباجان! میرا ایک مسئلہ ہے۔ مجھے سات آٹھ سال پہلے ٹی بی ہوئی تھی۔ میں نے تقریباً نو ماہ دوائی کھائی' آرام آ گیا تھا لیکن اب پھر دوبارہ یہ بیماری ہوگئی ہے۔ میں نے ٹیسٹ وغیرہ کروائے۔ ڈاکٹرز نے دوبارہ پھر علاج شروع کیا ہے۔ چار ماہ ہوگئے ہیں دوائی کھاتے ہوئے' پہلے سے کافی بہتر ہے لیکن کبھی کبھی سینے کے بائیں طرف گردن سے لے کر پاؤں تک صرف ایک طرف درد ہوتا ہے اور چار پانچ دن رہتا ہے اور سینے سے بلغم وغیرہ بھی نکلتی ہے۔ میں الحمدللہ' پانچ وقت کی نماز اور قرآن شریف اور وظائف وغیرہ باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ مجھے بیماری کا کوئی قرآنی علاج بتائیں اور سینے کی بلغم' درد' کھانسی وغیرہ کا کوئی دیسی علاج بتا دیں۔ باباجان! ویسے تو آپ باری آنے پر خط شائع کرتے ہیں لیکن میرا خط پلیز' جولائی کے شمارے میں شائع کر دینا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گا۔ پلیز باباجان! کوئی اچھا سا علاج ضرور بتائیے گا جس سے اس بیماری سے نجات مل جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے۔ (آمین!) آپ کے لیے دُعاگو!

☆ بیٹے شہزاد! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ (آمین!) نماز کی پابندی کے ساتھ بکثرت یَاشَافِعیُ کا وِرد جاری رکھو۔ علاج پابندی سے رکھو اور دن میں ایک بار مرغی کی یخنی ضرور پیا کرو۔ انشاء اللہ' ضرور افاقہ ہوگا۔

☐ علی احمد۔ گجرات

☆ بیٹے علی! اپنی توجہ اپنی تعلیم کی طرف رکھو۔ ابھی تو تم بہت کم عمر ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے علاقے میں جلد یہ فیصلے ہوتے ہوں مگر بیٹے! اب حالات بدل رہے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ ہر نماز کے بعد دونوں دوست ایک ایک تسبیح یَاقُدُّوسُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

☆☆.....☆☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

دوزخ کی آگ

حضرت بہلول ولی اللہ تھے۔ کسی جگہ سے گزر رہے تھے ایک بچے کو دیکھا جو کھڑا رو رہا تھا۔ دوسرے بچے آخروٹ سے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے سمجھا اس کے پاس اخروٹ نہیں اس لیے رو رہا ہے' میں اس کو لے کر دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا بیٹا رو نہیں میں تجھے اخروٹ لے کر دیتا ہوں تو بھی کھیل۔'' اس بچے نے کہا۔ بہلول کیا ہم دنیا میں کھیلنے آئے ہیں۔ ان کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ بچہ ایسا جواب دے گا تو انہوں نے کہا اچھا پھر کیا کرنے آئے ہیں۔'' بچے نے کہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے آئے ہیں۔'' انہوں نے کہا'' بچے ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو تمہارے غم کی یہ چیز نہیں ہے۔ ابھی تو تمہارے اس منزل میں آنے میں بھی بہت وقت پڑا ہے۔ تو اس نے کہا۔'' اے بہلول! مجھے دھوکہ نہ دے۔ میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے وہ صبح جب آگ جلاتی ہے تو پہلے چھوٹی لکڑیوں سے جلاتی ہے اور پھر بعد میں بڑی لکڑیاں رکھتی ہے۔ اس لیے مجھے ڈر ہے کہیں دوزخ مجھ سے نہ جلائی جائے اور میرے اوپر بڑوں کو ڈالا جائے۔''

یہ سن کر حضرت بہلول بے ہوش ہو کر گر گئے۔

حسن انتخاب: محمد افضل آزاد۔ ساہیوال

یاد رکھیں

☆: اپنے حصے کا کام کیے بنا دعا پر بھروسا کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسا کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔

☆: جب دیواروں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار گر جاتی ہے مگر جب دلوں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار بن جاتی ہے۔

☆: انسان کو بولنا سیکھنے میں ایک سال لگتا ہے مگر کون سا لفظ کہاں بولنا ہے..... یہ سیکھنے کے لیے پوری زندگی لگ جاتی ہے۔

☆: اپنے رب سے اپنی خطاؤں کی بخشش طلب کرتے رہو کیونکہ زندگی موقع کم اور دھوکہ زیادہ دیتی ہے۔

☆: ایک دن ہم سب ایک دوسرے کو یہ سوچ کر کھو دیں گے کہ جب وہ یاد نہیں کرتا تو میں اُسے کیسے یاد کروں۔

مرسلہ: نور العین۔ اسلام آباد

فتح کے لیے (V) کا نشان

فتح کے اظہار کے لیے انگلیوں سے (V) کا نشان بنانا کوئی قدیم خیال نہیں۔ بلکہ برطانیہ کے نامور وزیراعظم چرچل نے امریکی کانگریس میں ایک خطاب کے دوران میں اس طریقے کو اپنایا۔ تفصیل اس طرح سے ہے کہ 26 دسمبر 1941ء وہ تاریخی دن ہے۔ جس دن وزیراعظم چرچل کانگریس کے دونوں ایوانوں (بالا اور زیریں) سے خطاب کر رہے تھے۔ ان کی تقریر حسن خطابت کا شاہکار تھی۔ اور جناب چرچل نے اپنی والدہ کے امریکی ہونے کا اظہار فخر و انجاز کے ساتھ کیا۔ اپنی تقریر کے اختتام پر جناب چرچل نے شہادت اور درمیانی انگلیوں کو فضا میں لہرایا۔ اور (V) کا شہرہ آفاق نشان بنایا اور یہ تاریخی جملہ کہا کہ مکمل فتح تک جنگ جاری رہے گی۔ کانگریس کے اراکین نے بھی اپنے ہاتھ اسی انداز سے بلند کر کے جناب چرچل کے ساتھ اظہار یکجہتی

کیا اور یوں فتح کے لیے انگلیوں سے (V) کا نشان بنانا جلدی ہی پوری دنیا میں مقبول ہوگیا۔

حسن انتخاب: شیخ معظم الٰہی۔لاہور

مہارت

انور صاحب اپنے دوست جمال صاحب کو اپنی موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر روانہ ہوئے تو جمال صاحب کافی گھبرا رہے تھے۔کیونکہ وہ موٹر سائیکل پر سفر کرنے کے عادی نہیں تھے۔انور صاحب نے تیز رفتاری سے ایک شاہراہ پر موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں جمال صاحب کو تسلی دی۔''آپ کو گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔میں دن میں کئی مرتبہ اس سڑک سے گزرتا ہوں، اس کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔مجھے تو یہ بھی معلوم ہے اس سڑک پر کہاں کہاں گڑھا ہے......''

عین اس وقت موٹر سائیکل ایک گڑھے سے گزری اور بری طرح اچھلی۔جمال صاحب گرتے گرتے بچے۔انور صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔''اور یہ انہی گڑھوں میں سے ایک گڑھا تھا۔''

مرسلہ: بسمہ اشتیاق۔کراچی

خوشخبری

ہوٹل میں ایک صاحب نے مچھلی فرائی کا آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگے۔انتظار کی گھڑیاں بہت طویل ہو گئیں۔آخر کار ویٹران کے پاس آیا اور خوشخبری سنانے کے انداز میں بولا۔''بس جناب...... آپ کی مچھلی آنے ہی والی ہے۔''

''اچھا واقعی......؟''ان صاحب نے خوشی کا اظہار کیا۔''ویسے یہ تو بتاؤ کہ مچھلی پکڑنے کے لیے کانٹے میں چارے کے طور پر تم نے کیا چیز لگائی ہے؟''

مرسلہ: شمائلہ اختر۔لاہور

غزل

بھول کر ہی مری جانب کبھی دیکھا ہوتا
تُو نے اے کاش میرے پیار کو سمجھا ہوتا
تُو کہ ہے جذبۂ احساسِ وفا سے محروم
ورنہ تُو نے میرے جذبات کو سمجھا ہوتا
بے وفا مجھ کو ہے سمجھا بے مروت تُو نے
کاش تُو نے میری چاہت کو تو پرکھا ہوتا
مجھ کو محسوس نہ ہوتی غمِ حالات کی دھوپ
ہم پہ تیری گھنی زلفوں کا جو سایہ ہوتا
ہر جگہ ہیں وہی نفرت کے اندھیرے یاسین
تُو نے ہی دیپ محبت کا جلایا ہوتا

شاعر: محمد یاسین انصاری۔کراچی

دوستی

☆: رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تم کسی سے دوستی کرو تو پھر اس کے بارے میں کسی سے مت پوچھو ممکن ہے بتانے والا تمہارے دوست کے بارے میں کوئی غلط بات کہہ دے اور تم اس سے نفرت کرنے لگو۔''

☆: ہم لوگ دوستی کے بلند و بالا دعوے تو کرتے ہیں۔لیکن اس کو نبھانا تو دور کی بات ہم نے کبھی اس مقدس لفظ کے ظاہری و لفظی معنی پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔دوستی دو الفاظ کا مجموعہ ہے دو سے مراد دو وجود اور 'ستی' کا مطلب ہے، جل کر خاک ہو جانا۔یعنی جب دو افراد جل کر خاک ہو جاتے ہیں تب دوستی جنم لیتی ہے۔

مرسلہ: فرحانہ نصیب۔لاہور

قسم ہے

اس نے مسجد میں قسم کھائی تھی کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں پکایا۔میں نے اسے کھانا کھلا دیا۔اگلے دن وہ پھر دوسرے شہر میں قسم کھا کر کہہ رہی تھی لوگو! میری مدد کرو میں نے تین دن سے کچھ نہیں پکایا۔تب میں نے اُسے کہا کہ کل تو تمہیں روٹی کھلائی ہے۔اس نے کہا میں نے کھانا پکانے کی قسم کھائی ہے۔میں نے یہ تو قسم نہیں کھائی کہ کچھ نہیں کھایا۔میری قسم ٹھیک ہے۔میری بہو پکاتی ہے میں نہیں پکاتی۔میں نے کھانا کھانے کی قسم تو نہیں کھائی تھی میں نے تو کھانا پکانے کی قسم کھائی تھی کہ میں نے تین دن سے کچھ نہیں پکایا۔

مرسلہ: ظہیر انجم تبسم۔خوشاب

تیرے پیار کا پہلا موسم

تیرے پیار کا پہلا موسم
پیار کا موسم

وصل کا موسم
اک مدت تک یاد رہا
باقی موسم بھول گئے

شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

حقیقت

☆: محبت ایک سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔
☆: اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتے ہو تو غم بھی نہ دو۔
☆: قدم اٹھانے سے پہلے دیکھ لو کہ راستہ کدھر جاتا ہے۔
☆: مسکراہٹ کے وقت سب انسان کے ساتھ ہوتے ہیں مگر روتے وقت کوئی ساتھ نہیں دیتا۔
☆: اپنی عادت پر غالب آنا سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مرسلہ: محمد ندیم عباس میوانی۔ بتوکی

اُلجھتے رہنا

شام کی پلکوں پر لرزتے رہنا
ڈوب جائے یہ منظر تو برستے رہنا
اس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا
آگ سے سیکھ لیا ہے یہ قرینہ ہم نے
بجھ بھی جانا تو بڑی دیر سلگتے رہنا
جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اس کی
روٹھنا مجھ سے تو اوروں سے اُلجھتے رہنا

حسن انتخاب: انعم شہزادی۔ گجرات

اسکول

ایک اسکول میں آگ لگ گئی
اسکول کے سب بچے دور کھڑے ہنس رہے تھے۔
کہ چلو اب اسکول نہیں آنا پڑے گا۔
لیکن ایک بچہ اُداس کھڑا تھا۔ مس اُس کے پاس گئیں اور کہا۔
''بیٹا! تم نیک اور محنتی اسٹوڈنٹ لگتے ہو۔ بتاؤ کیوں اُداس ہو؟'' بچہ روتا ہوا بولا۔
''مس اسکول تو جل گیا...... لیکن...... آپ تو زندہ ہیں۔''

مرسلہ: علی حسنین تابش۔ چشتیاں

پتھر کا بت

جانتی تھی میں کہ بھول جاؤ گے۔ کوئی کمال نہیں کیا تم نے۔ یہ تو رسم دنیا ہے۔

یاد ہے وہ بارش کہ جس میں بھیگتے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم کبھی نہ بچھڑیں گے۔ تو کیا وہ وعدے، وہ قسمیں سب جھوٹ تھے، کیا جھوٹ اتنا آسان ہے کہ کوئی بھی، کیسے بھی بول دے۔ جانتے ہو دل توڑ دیا تم نے ریزہ ریزہ کر دیا مجھے۔ کیسے سمیٹ پاؤں گی خود کو...... بولو...... نہیں تم نہیں سمجھو گے کہ تم احساسات سے عاری ہو۔

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

قولِ حضرت علیؓ

☆: تمہاری خوشی میں صرف وہ شریک ہوگا جسے تم پیار کرتے ہو۔ لیکن تمہارے غم میں وہ شریک ہوگا جو تم سے پیار کرتا ہے۔''

حسن انتخاب: اشعر کاشف۔ کراچی

تمہارے لیے

تمہیں کیا معلوم
محبت اور جدائی
کیا ہوتی ہے دوست
شاید ہی سمجھ سکو
ترس گیا ہوں
تمہارے لیے

شاعر: علی رضا عمرانی۔ ٹھٹھہ

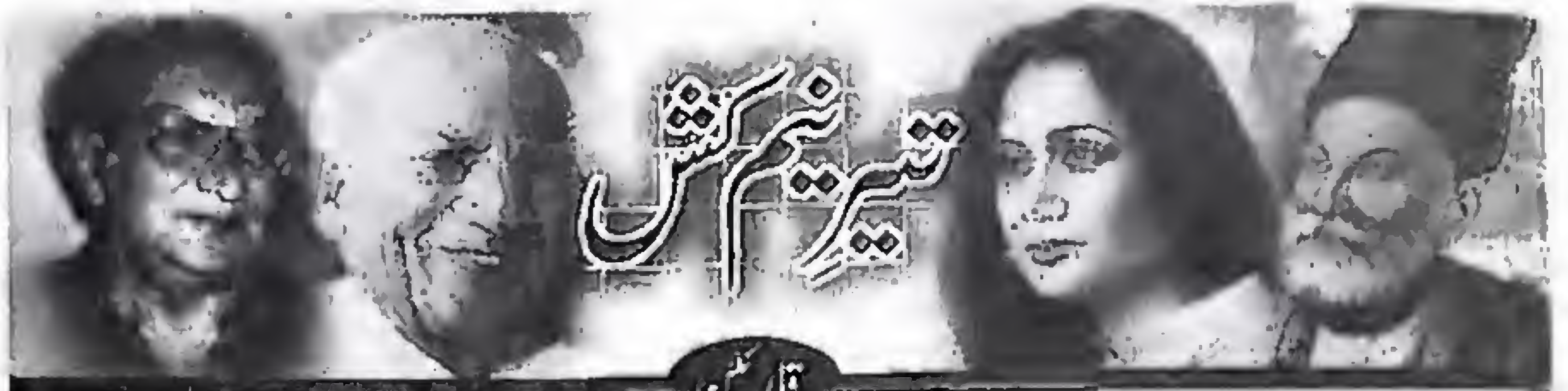
گاجر کے پتے

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ گاجر کے نرم و نازک پتوں میں پروٹین، معدنیات، اور کئی وٹامنز چھپے ہیں۔

ان پتوں میں گاجر کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ وٹامن C اور پوٹاشیم کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے جس کے سبب آپ کے جسم سے غیر ضروری پانی کا اخراج ہوتا ہے، بلڈ پریشر معتدل رہتا ہے اور خون میں پھٹکیاں بھی نہیں بننے پاتیں۔ لہٰذا مارکیٹ سے ایسی گاجریں خرید کر لائیں جن میں پتے موجود ہوں اور انہیں گاجروں کے ساتھ پکا کر کھائیں۔

آمنہ علی۔ شاہ فیصل کراچی

☆☆......☆☆



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

عبدالرحمان۔کراچی
مصروف اس قدر ہیں وہ دن رات آج کل
سنتے ہی نہیں دل کی کوئی بات آج کل

محمد جاوید۔تحصیل علی پور
کچھ لوگ چھوڑ جاتے ہیں
پھر جاتے جاتے توڑ جاتے ہیں

شاہد رفیق سہو۔خانیوال
اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد میری آنکھ میں آنسو آئے

ایم افضل آزاد۔ساہیوال
صرف قربت کو تو مل جاتے ہیں لوگ ہزاروں
میں نے ایک شخص کو چنا ہے صرف محبت کے لیے

محمد ندیم عباس میواتی۔پتوکی
یادیں انہی کی آتی ہیں جن سے کچھ تعلق ہو
ہر شخص نگاہِ محبت سے دیکھا نہیں جاتا

ابو ہریرہ بلوچ۔بہاولنگر
میرے وعدوں کو اُس نے مذاق سمجھا
میرے پیار کو اُس نے جذبات سمجھا
گزری جب اس کی گلی سے لاش میری
اس پتھر دل نے اسے میری بارات سمجھا

مجید احمد جائی۔ملتان
بس گیا کچھ اس طرح تیرے بچھڑنے کا سماں
پھر پھر مڑ مڑ کے دیکھا اور پتھرایا نہیں

صائمہ مجید۔ملتان
تقدیر کے لکھے پر کبھی شکوہ نہ کرنا
پھول بھی تو خوش رہتا ہے کانٹوں کی بھیڑ میں

رانا حبیب الرحمٰن۔لاہور
ایسی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھ اے بے وفا
سوچو کبھی ہم بھی تمہارے محبوب ہوا کرتے تھے

روبینہ ناز روبی۔رضا آباد
اب تو کہیں پہ ختم ہو رستہ گمان کا
شیشے میں دل کے سارے یقیں بال ہوگئے
جس واقعہ نے آنکھ سے چھینی تھی میری نیند
اُس واقعے کو اب تو کئی سال ہوگئے

ارم خان۔ڈی جی خان
یہ زندگی تو بس نام کی زندگی ہے
دو پل کا ہے سویرا باقی شام کی زندگی ہے
یہ زندگی کیا ہے؟ موت کا پیغام ہے اک
اصل زندگی تو موت کے انجام کی زندگی ہے

سدرہ انور علی۔جھنگ صدر
الٹی پڑی ہیں کشتیاں سب ریت پر میری
کوئی لے گیا ہے دل سے سمندر نکال کر

شین ماہا۔سیالکوٹ
دل کو ذرا احتیاط سے رکھیے گا
گرمی سے پگھل نہ جائے اور سردی سے سکڑ نہ جائے

سلمان شبیر۔تلہ گنگ

وہ کناروں میں انا کا یہ سمندر کیسا
کیوں تری ذات مری ذات نہ ہونے پائی

حمیرا قریشی۔لاہور

کر گمشدہ خود کو دنیا کی رونقوں میں حمیرا
ایک محبت پر تو زندگی ختم نہیں ہوا کرتی

عظمیٰ شکور۔اسلام آباد

ہم مرحبا کہتے ترے ہر تیر ستم پر
سچ بات کہ دل اتنا کشادہ بھی نہیں تھا

رضا خان۔کراچی

کوئی خاطر نہ مدارات کی تمنا ہے
حصولِ شرف ملاقات کی تمنا ہے

ملائکہ حریم۔اوکاڑہ

اک خوف یہ کہ، کوئی زخم نہ دیکھ لے دل کے
اور اک حسرت یہ کہ، کاش کوئی دیکھنے والا ہوتا

حمیرا ظفر۔کراچی

بہت مشکل ہے کسی کو روح کی گہرائیوں سے سمجھنا
جو گہرے لوگ ہیں کمبخت پہچانے نہیں جاتے

اشفاق شاہین۔کراچی

اکثر لاتعلق رہتا ہے مجھ سے
میرے سبھی تعلق قائم ہیں جس سے

ماہین فاطمہ۔اوکاڑہ

لفظ با لفظ جب بیاں کی اس نے وہ پہلی ملاقات
میں ساری بیوفائی بھول کر پھر اس کی باتوں میں آ گیا

اعجاز احمد۔رحیم یار خان

پھر اس کے بعد ہر اک لمحہ، سوال ایسا تھا
ترے بچھڑنے کا دل کو ملال ایسا تھا
خموشی جرم کا اقرار بننے والی تھی
جواب دینا پڑا وہ سوال ایسا تھا

شاہدہ۔جہلم

دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھلا در اس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

حمید وفا۔میانوالی

خوابوں کی رہ گزر میں جذبوں کے امتحاں میں
ہم جی رہے ہیں لوگو! اک شہر بدگماں میں

محمد عزیر۔تحصیل جتوئی

تمام عمر اسی کے خیال میں گزری فراز
میرا خیال جسے عمر بھر نہیں آیا

ماہم نعیم شاہ۔کراچی

نہیں سجدے کیے ہم نے کبھی شاہوں کی چوکھٹ پر
ہمیں جتنی ضرورت ہو خدا سے مانگ لیتے ہیں

تحسین جونیجو۔خیر پور ناتھن شاہ

آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ کہاں جاتے ہیں
عشق ہو جائے تو پھر روگ کہاں جاتے ہیں
دل ہی ناداں ہے جو لے کے ہمیں جاتا ہے
ورنہ اس شہر میں ہم لوگ کہاں جاتے ہیں

احمد علی۔راولپنڈی

کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی
بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے

کوپن برائے



اکتوبر 2015ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا:

